MAHAR M.
MAZHAR KATHIA
Official Chanel
Youtube.com

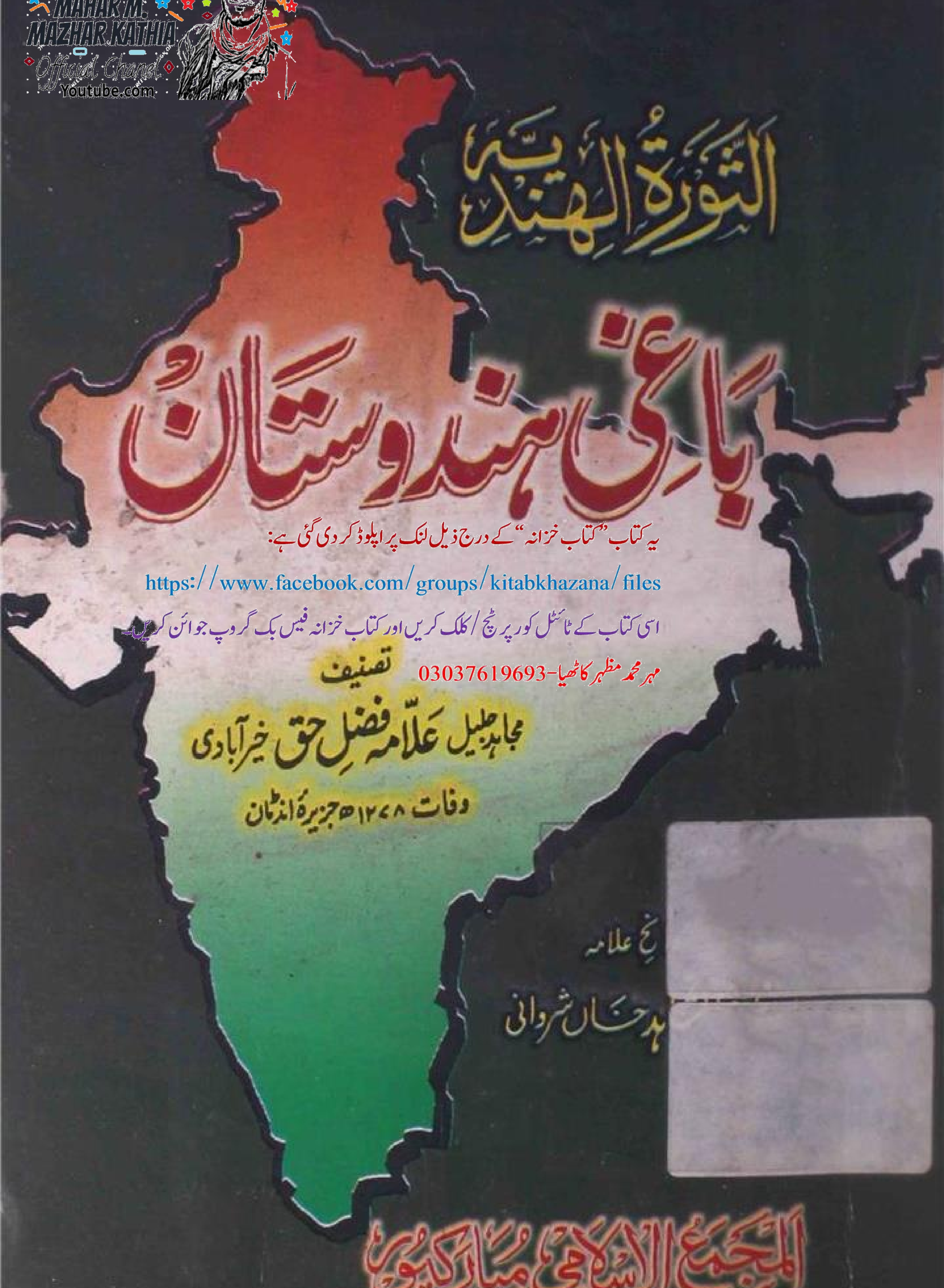

التورۃ الہندیہ

باغی ہندوستان

یہ کتاب "کتاب خزانہ" کے درج ذیل لنک پر اپلوڈ کر دی گئی ہے:
https://www.facebook.com/groups/kitabkhazana/files
اسی کتاب کے ٹائٹل کور پر ٹچ/کلک کریں اور کتاب خزانہ فیس بک گروپ جوائن کریں۔
مہر محمد مظہر کاٹھیا-03037619693

تصنیف
مجاہدِ جلیل علامہ فضلِ حق خیرآبادی
وفات ۱۲۷۸ھ جزیرۂ انڈمان

خِ علامہ
د خاں شروانی

المجمع الاسلامی مبارکپور

سلسلۂ اشاعت نمبر ۵۱

باسمہٖ سبحانہ

عَنَاصِرُ اَرْبَابِ الْبَلَاغَۃِ اَرْبَعٌ　　بِھٰذَا لَقَدْ صَارَتْ عَنَاصِرُھَا خَمْسًا
وَکَمْ مِّنْ لَیَالٍ قَدْ اُحِیْلَ نَہَارُہٗ　　فَتِلْکَ بِفَضْلِ الْحَقِّ قَدْ اَصْبَحَتْ شَمْسًا

اَلثَّوْرَۃُ الْہِنْدِیَّۃُ

باغی ہندوستان

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دردانگیز واقعات ـــــ مجاہدین کی جلاوطنی، حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور، مردوں عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام ـــ انگریز مظالم کی دل ہلا دینے والی خونیں داستان

تصنیف :-

مجاہدِ جلیل علّامہ فضلِ حق خیرآبادی

وفات ۱۲۷۸ھ جزیرۂ انڈمان

ترجمہ و سوانحِ علامہ :-

مولانا محمد عبدالشّاہد خاں شروانی

ادارہ اشاعت :- المجمع الاسلامی مبارکپور

مہر آن لائن کمپوزنگ سنٹر سے بی ایس، ایم فل، ایم ایس اور پی ایچ ڈی تھیسز صرف تین دن میں کمپوز کروائیں۔ ۲۴ گھنٹے سہولت

"کتاب خزانہ" لائبریری میں خوش آمدید۔

Mahar Online Public Library

پی ایچ ڈی اسکالر اپنا آرٹیکل شمارے میں لگوانے کے لیے رابطہ کریں۔

اپنے قیمتی ڈاکومنٹس مناسب ریٹس پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کروائیں اور جب چاہیں واپس لیں۔

اپنے ریسرچ ٹاپک کے متعلق ریختہ ویب سے کتب ڈونلوڈ کروانے اور سابقہ تھیسز حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں۔

مہر محمد مظہر کاٹھیا (ایم فل اسکالر)

مائیکروسافٹ آفس سپیشلسٹ

کام یابی کے ۵ سال

وٹس ایپ نمبر: 0303-761-96-93

اب آپ کو تھیسز کمپوزنگ کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ گھر بیٹھے اپنا سنوپسز اور تھیسز پروفیشنل انداز میں کمپوز کروائیں۔ نیز مقالے کی کمپوزنگ مع پروف ریڈنگ کروانے کی سہولت۔

تمام کتابیں ریختہ ویب سائٹ سے ڈون لوڈ کی جاتی ہیں۔ کسی بھی کتاب کو سکین یا پی ڈی ایف نہیں کیا جاتا۔ دستیاب کتب خریدنے کی عادت ڈالیں۔

ایم فل اور پی ایچ ڈی اسائنمنٹ، آرٹیکل، سنوپسز اور تھیسز کے متعلق رہ نمائی، کمپوزنگ اور فائنل سیٹنگ کے لیے رابطہ کریں۔

اب تک وٹس ایپ گروپ کی تعداد پانچ، آیئے آپ بھی ہمارے وٹس ایپ گروپ "کتاب خزانہ" کا حصہ بنیں۔

فیس بک، ٹیلی گرام "کتاب خزانہ" گروپ لنک سے تمام کتابیں ڈون لوڈ کریں:

Kitab Khazana Groups (1,2,3,4,5)
Facebook.com/groups/Kitabkhazana
t.me/KitabKhazana
t.me/KitabKhazanaGroup
Mazhar03037619693@gmail.com
twiter.com/@mazhar1kathia
Instaram/@mazhar1kathia
Mahar Muhammad Mazhar Kathia

MAHAR M. MAZHAR KATHIA
Official Chanel
Youtube.com

پبلک سروس کمیشن اور شاعری سے متعلق بہترین ویڈیوز یوٹیوب چینل سے ڈونلوڈ کریں۔

تھیسز کی پروف ریڈنگ، رموز و اوقاف و املا کی درستی، تھیسز کی یونی ورسٹی سٹائل کے مطابق فائنل سیٹنگ کی سہولت

اسکالر حضرات اپنے موضوع سے متعلق بنیادی اور ثانوی کتب کے لیے آگاہ کریں۔ تلاش کرنے کی مکمل کوشش کی جائے گی۔

کاروباری حضرات اپنے ایڈز / اشتہارات فیس بک، ٹیلی گرام اور وٹس ایپ کتاب خزانہ گروپ میں انتہائی مناسب ریٹ پر پرموشن (پبلک شئیر) کروائیں۔ وقت لینے کے لیے: 0303-761-96-93

سلسلۂ اشاعت نمبر ۵۱

کتاب	الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان)
تصنیف	علامہ فضل حق خیرآبادی۔
ترجمہ، تقدیم، اضافۂ سوانح	محمد عبد الشاہد خاں شروانی
تکملہ	محمد عبد الحکیم شرف قادری
طبع اوّل	مدینہ پریس بجنور ۱۹۴۷ء
طبع ثانی	لاہور۔ رمضان ۱۳۹۴ھ/ اکتوبر ۱۹۷۴ء
طبع ثالث	لاہور۔ رمضان ۱۳۹۸ھ/ اگست ۱۹۷۸ء
طبع چہارم	ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ/ اگست ۱۹۸۵ء
کتابت طبع چہارم	عبد المنان برکاتی گونڈوی
طبع پنجم	رجب ۱۴۲۲ھ/ اکتوبر ۲۰۰۱ء
باہتمام	مولانا سعید الرحمٰن امجد القادری
تعداد	گیارہ سو
~~قیمت~~	

المجمع الاسلامی۔ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ، (یوپی)
فون: 05462-50099

یہ کتاب "کتاب خزانہ" کے درج ذیل لنک پر اپلوڈ کر دی گئی ہے:
https://www.facebook.com/groups/kitabkhazana/files
اسی کتاب کے ٹائٹل کور پر ٹچ / کلک کریں اور کتاب خزانہ فیس بک گروپ جوائن کریں۔
مہر محمد مظہر کاٹھیا-03037619693
Contact for Thesis Composing and Final Setting | 0303-761-96-93

مشمولات

★ الثورۃ الہندیہ	از	علامہ فضل حق خیرآبادی
★ ترجمہ الثورۃ الہندیہ	〃	مولانا عبدالشاہد خاں شروانی
★ سوانح علامہ فضل حق خیرآبادی	〃	〃 〃
★ سلسلۂ تلامذہ	〃	〃 〃
★ تکملہ سلسلۂ تلامذہ	از	مولانا عبدالحکیم شرف قادری
★ نقد و نظر	〃	〃 〃

فہرست کتاب

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
فوٹو دروازہ محل سرائے ضبط شدہ		سخن فہمی	۱۵۵
تقدیم - از مفتی نجم الحسن رضوی	۶	شاعری و نثر نگاری	۱۶۲
مقدمہ طبع چہارم از مؤلف	۱۲	سلسلۂ تلمذ	۱۶۷
مقدمہ طبع اول	۱۶	تصانیف	۱۸۱
تعارف از ابوالکلام آزاد	۲۳	بحث و مناظرہ	۱۸۷
الثورۃ الہندیہ از علامہ فضل حق خیرآبادی	۲۵ تا ۱۲۰	بیعت	۲۰۲
		اخلاق و عادات	۲۰۳
رسالہ	۲۶	سیاست	۲۰۷
قصیدۂ ہمزیہ۔	۸۶	تاریخ جنگ آزادی	"
قصیدۂ دالیہ	۱۰۶	اخلاف	۲۳۷
عبارت اختتام۔	۱۰۸	تلامذہ	۲۳۸
سوانح علامہ فضل حق خیرآبادی از مولانا عبدالشاہد شروانی	۱۲۱ تا ۳۱۲	عکس نامۂ گرامی	۲۴۴
		ابحاث جدیدہ (مستقل اضافہ طبع چہارم)	۲۴۷ تا ۳۱۲
تمہید (حکمائے یونان و ہند)	۱۲۳		
علامہ کی ولادت اور نسب۔	۱۳۰	مقدمہ اور اس کے متعلقات۔	۲۴۸
تعلیم و تربیت۔	۱۴۱	بعض اغلاط کی تصحیح	۲۸۲
فطانت و ذہانت۔	۱۴۵	تعارف تصانیف	۲۹۷
درس و تدریس۔	۱۴۶	**ضمیمہ** سلسلۂ تلامذہ از - عبدالشاہد خاں شروانی	۳۱۳ تا ۳۸۲
ملازمت۔	۱۴۸		

مضمون	صفحہ
حیات مولانا عبدالحق خیرآبادی	۳۱۳
〃 مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی	۱۴۷
〃 مولانا معین الدین اجمیری	۳۶۳
〃 مؤلف کتاب محمد عبدالشاہد خاں شروانی	۳۶۹

تکملہ

از مولانا عبدالحکیم شرف قادری

مضمون	صفحہ
مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری	۳۸۵
مولانا امجد علی اعظمی۔	۳۸۷
مولانا یار محمد بندیالوی	۳۹۵
مولانا سید سلیمان اشرف بہاری	۳۹۹
کچھ باغی ہندوستان کے بارے میں	۴۰۳
مؤلف کتاب کا ایک خط۔	۴۴۰
مولانا فضل امام کی ایک تصنیف	۴۴۲
تلامذۂ مولانا عبدالحق خیرآبادی	۴۴۴

فوائد ضمنیہ

مضمون		صفحہ
حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی	حاشیہ	۲۰
قدیم ہندوستان میں علم و حکمت	کتاب	۱۲۳
〃 اولیاء کرام	〃	۱۲۴
تاریخ فلسفہ	〃	۱۲۵
عہد مغلیہ میں شعراء اطباء علماء وغیرہ	〃	۱۲۸
علامہ کے دادا شیخ محمد ارشد کی اولاد	حاشیہ	۱۳۳
مولانا احمد اللہ بن حاجی صفت اللہ	〃	۱۳۹
مفتی صدرالدین خاں آزردہ	حاشیہ	۱۴۰
ذکر خیرآباد	کتاب	۱۴۱
مخدوم شیخ سعدالدین۔	حاشیہ	۱۴۱
حافظ محمد علی اور حافظ محمد اسلم	〃	۱۴۲
ملا عبدالواجد کرمانی	〃	〃
مولانا لطف اللہ علی گڈھی	〃	۱۴۳
چند شعرائے خیرآباد	کتاب	۱۵۶
صمہ قشیری کے پانچ اشعار	حاشیہ	۱۶۳
علامہ کے چند قصائد کے قلمی نسخے	〃	۱۶۵
ملا اعلم سندیلوی	〃	۱۶۸
شیخ کمال الدین	〃	۱۶۹
ملا نظام الدین سہالوی۔	〃	〃
ملا قطب الدین شہید سہالوی	〃	〃
ملا امان اللہ بنارسی	〃	۱۸۰
مولانا دانیال چوراسی۔	〃	〃
ملا عبدالسلام لاہوری	〃	〃
امیر فتح اللہ شیرازی	〃	〃
قاضی مبارک گوپاموی	〃	۱۸۱
شاہ اسمٰعیل دہلوی	کتاب	۱۹۱
علامہ کے علم و فضل پر معاصرین کی شہادتیں		۱۹۴
تاریخ دہلی۔	حاشیہ	۲۱۷
مفتی عنایت احمد کاکوروی	کتاب	۲۲۵
تاریخ خیرآباد	حاشیہ	۳۱۴

تقدیم

از:- مفتی سید نجم الحسن رضوی - محلہ میاں سرائے، خیرآباد - ضلع سیتاپور، یوپی

مفتی سید نجم الحسن خیرآبادی - مولانا عبد الشاہد شروانی کے صرف رفیق درس ہی نہیں بچپن کے دوست، بڑے مخلص و غمگسار، اور باغی ہندوستان کی ترتیب میں ان کے کافی معاون و مددگار ہیں۔

میرا خیال تھا کہ باغی ہندوستان طبع چہارم کی کتابت مکمل ہونے کے بعد پوری کتاب مولانا عبد الشاہد شروانی کی خدمت میں پیش کر کے مزید چند سطریں لکھاؤں گا لیکن ۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۸ر فروری ۱۹۸۴ء شنبہ کو ان کی رحلت سے یہ آرزو بعینہٖ تو پوری نہ ہو سکی مگر مفتی سید نجم الحسن صاحب خیرآبادی چونکہ اس سلسلہ میں ان کا بالکل بدل اور ثانی ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ آرزو ان کے یہاں زیر نظر تقدیم کی صورت میں بروجہِ حسن پوری ہو گئی

حقیقت یہ ہے کہ باغی ہندوستان کے مواد کی فراہمی میں موصوف کی محنت نصف یا اس سے زیادہ ہے۔ باغی ہندوستان میں جابجا ان کا تذکرہ موجود ہے اور زیر نظر تقدیم کے آخر میں مولانا عبد الشاہد شروانی کے مکتوب ۵ر مارچ [illegible]ء کی خط کشیدہ عبارت سے یہ امر بالکل عیاں اور واضح ہے۔ مکتوب ۵ر مارچ ۱۹۸۲ء سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس طبع چہارم کے سلسلہ میں بھی موصوف کی رسد و امداد اور ان کی ہدایات شامل ہیں۔ ایسے بے نفس، بے غرض اور ہمدم و دمساز رفقاء کا وجود خیرآبادی سلسلہ کے لئے حیرت انگیز نہیں، لیکن عصر حاضر کے لئے یقیناً بہت بڑی بات ہے۔

محمد احمد مصباحی بھیروی - نگران المجمع الاسلامی مبارک پور
صدر المدرسین فیض العلوم، محمد آباد گوہنہ، ضلع اعظم گڑھ۔ ہند
۲۵ر۱۲ر۱۴۰۵ھ — ۱۲ر۹ر۱۹۸۵ء - پنجشنبہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؁ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تیرہویں صدی ہجری میں خیرآباد کی مردم خیز زمین سے جو شخصیت افق علم و حکمت پر کوکبِ درخشاں بن کر چمکی اور خیرآباد کی مزید شہرت کا سبب بنی وہ علامہ فضل حق خیرآبادی کی ذات تھی۔ قدرت نے علامہ کی ہستی میں گوناگوں کمالات جمع کر دیئے تھے —— وہ یگانۂ روزگار فلسفی، یکتائے زمانہ فاضلِ لغت و ادب اور علوم دینیہ کے عالمِ متبحر تھے —— سر سید جیسے مفکر اور دانشور نے علامہ کے فضل و کمال اور عبقریت کا اعتراف کیا ہے —— سر سید کی عبارت میں اپنی کتاب "خیرآباد کی ایک جھلک" میں نقل کر چکا ہوں۔ اس مجموعہ میں بھی ان کے اور دوسرے بہت سے عقلائے روزگار کے تأثرات شامل ہیں۔

غالب جیسے نامور اور فلسفی شاعر کو علامہ سے والہانہ عقیدت تھی، وہ اپنی زندگی کو علامہ کی وفات سے بعد بے کیف سمجھنے لگے تھے۔ ایک دوست کو مکتوب لکھتے ہوئے اپنے قلبی درد و کرب کو اس طرح ظاہر کیا ہے

> فخرِ ایجاد و تکوین، علامہ فضل حق جیسا دوست مرجائے، غالب نیم مردہ نیم جاں رہ جائے،

ہندوستان کے مشہور صاحبِ علم شاعر حضرت امیر مینائیؔ نے درج ذیل خیالات کا اظہار کیا

> افضل الفضلاء، اکمل الکملاء، فضائل دستگاہ، فواضل پناہ جناب مولانا مولوی فضل حق صاحب فاروقی، بَرَّدَ اللہُ مَضْجَعَہٗ ـــ وطنِ اصلی آپ کا خیرآباد، فنونِ حکمیہ میں مرتبۂ اجتہاد۔ بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی طلیق و ذلیق، انتہائی صاحبِ تحقیق و تدقیق۔ اپنے والد ماجد مولانا مولوی فضل امام غفرلہ اللہ المنعام کے شاگردِ رشید، تحصیلِ علومِ عقلیہ و نقلیہ میں جناب مرحوم کی خدمت سراپا برکت سے مستفید۔
>
> تلامذہ مولوی صاحب کے حساب سے باہر ہیں۔ کتب مفصلۂ ذیل آپکی تصنیفات مشتہر ہیں۔ شرح تہذیب الکلام - تحقیق حقیقۃ الاجسام - حاشیۂ قاضی مبارک - حاشیۂ افق المبین - حاشیۂ تلخیص الشفا - ہدیہ سعیدیہ فی الحکمۃ الطبعیۃ - روض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود - رسالہ مبحث قاطیغوریاس - رسالہ تحقیق علم و معلوم - تاریخ ایام غدر اور ان تصنیفات کے علاوہ خطب اور قصائدِ عربی شمار میں سو سے زائد ہیں، کہ ان سب میں گوناگوں مضامین اور مقاصد ہیں جس شہر میں رونق افروز ہوئے، صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہاں آباد میں اگرچہ عدالتین کے سررشتہ دار تھے، مگر بڑے ذی اقتدار، اور صاحب اختیار تھے۔ جھجر میں شاہرہ پر نوکر رہے، الور اور سہارنپور اور ٹونک سب جگہ معزز اور موقر رہے۔ لکھنؤ میں صدر الصدور تھے۔ اور اسی دار الریاست میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر مرافعۂ عدالتین پر مامور تھے ـــ جناب مستطاب نواب محمد یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکان انار اللہ برہانہم کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے، اور بندگانِ حضور پرنور دام ملکہم واقبالہم نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے، پھر یہاں سے تشریف لے گئے۔
>
> سنہ ۱۲۱۲ھ سالِ ولادت ہے اور سنہ ۱۲۷۸ھ سالِ رحلت ہے۔ اس حساب سے ۶۶ چھیاسٹھ سال کی عمر پائی، غدر کے بعد "بانقلاب زمانہ غدار" سے جزیرۂ انڈمین میں قضا فرمائی زبانِ عربی میں چونکہ تخلص کا معمول نہیں لہذا، اسم مبارک آپکا، بجائے تخلص، حرفِ فا میں لکھا گیا۔ اور کچھ کلام برکت انضمام درجِ تذکرہ ہوا۔ (یادگار مینائی)

عربی اشعار پر علامہ کی قادر الکلامی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آپ کے اشعار کی تعداد چار ہزار سے زائد ہے — حضرت مولانا علی حسین خیرآبادی مہاجر مدنی علیہ الرحمہ نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا اعظم حسین خیرآبادی مہاجر مدنی علیہ الرحمہ سے سُنی ہوئی ایک روایت راقم سطور کو ایک مکتوب میں تحریر فرمائی جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ عربی شاعری میں علامہ کس بلند مقام پر فائز تھے — اس مکتوب کا ضروری حصہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

> "ایک بار آپ کے محب جو کہ عازم حج وزیارت شریف تھے، بغرض رخصت حاضر ہوئے۔ آپ ان کی تشیع کے لئے پیادہ پا ہوئے اور فرمایا کہ حاضری اقدس پر اس مہجور غلام کے چند ابیات عرض کردینا — اور اسی حال میں راستہ چلتے آپ نے برجستہ وہ اشعار لکھوا دیے تھے جن کی تعداد دو قصیدوں کی صورت میں پچاس شعر کے قریب ہوگئی ہے — جس وقت ان زائر صاحب نے انکو مواجہہ اشرف میں پڑھنا شروع کیا تو علماء نے جو مشغول تدریس تھے، اپنے اپنے درس بند کردیے اور حرم محترم میں ہر جانب سے خلقت ان کے گرد جمع ہوگئی اور حاضرین پر عجب حال طاری رہا — علماء نے سن کر فرمایا یہ کلام تو کسی فصیح عربی الاصل کا بہ مشکل ہوسکتا ہے چہ جائیکہ کسی ہندی کا — اور بہتوں نے اس کے نقول لئے۔"

عربی نثر میں علامہ کی دسترس کا اندازہ ان کی کتاب الثورۃ الھندیۃ اور ان کے عربی خطبات سے کیا جاسکتا ہے۔ ان کی دوسری تصانیف میں بھی ادب و انشاء کی جھلک موجود ہے۔

جہانتک علامہ کے علمی کمالات اور فنی مہارت کا تعلق ہے، علامہ کے دور سے لیکر اس وقت تک اہل علم وفضل اسکا اعتراف کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن علامہ کی زندگی کا دوسرا رُخ جسکا تعلق اعلائے کلمۂ حق سے ہے اسکے متعلق علمی دنیا میں بھی اس سے زیادہ کسی کو علم نہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد کی پاداش میں ملک بدر کرکے آپکو جزیرۂ انڈمان بھیج دیا گیا۔ علامہ کی زندگی کے اِس رخ پر بالکل پردہ پڑا ہوا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ پورے برصغیر پر انگریزوں کا اقتدار تھا۔ کسی کو لب کشائی کی گنجائش نہ تھی۔ علامہ کی حیات کا یہ درخشاں رُخ باغی ہندوستان اور الثورۃ الھندیۃ کی اشاعت سے منظر عام پر آیا۔ اگرچہ الثورۃ الھندیہ کے دو چار نسخے بعض اہل علم کے پاس محفوظ تھے۔ لیکن ان کے اظہار سے اُس وقت کا قانون مانع تھا۔

علامہ نے اعلائے کلمۂ حق کی راہ میں کون سے وہ مصائب تھے جو نہیں جھیلے۔ دہلی سے وطن مالوف تک سفر میں کیسی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ زندگی کی سب سے قیمتی دولت یعنی کتب خانہ ضبط کر لیا گیا۔ آپ کا عالیشان دولت خانہ "نیا محل" ضبط کرکے بے دردی کے ساتھ فروخت کر دیا گیا۔ پھر ملک بدر کرکے آپ کو انڈمان بھیج دیا گیا جہاں انواع و اقسام کے شدائد اور اذیتوں کا آپ کو سامنا کرنا پڑا۔ اور اسی غربت اور مسافرت میں آپ نے اپنی متاعِ حیات خالقِ حیات کے سپرد کی۔

راقم السطور نے الثورۃ الھندیہ کی زیارت سب سے پہلے استاذ محترم مولانا معین الدین اجمیری کے کتب خانہ میں کی تھی۔ یہ نسخہ بخطِ نسخ مولانا نے خود نقل فرمایا تھا اور لغت کی کتابوں کی مدد سے حلِ لغات کیا تھا۔ موصوف کا ارادہ یہ تھا کہ عربی ادب میں استعداد پیدا کرنے کیلئے مجھ کو اور مولوی عبد الشاہد خاں شروانی کو سبقاً سبقاً پڑھا دیں، لیکن دوسری کتابوں کا بار اتنا تھا کہ اس کی نوبت نہ آسکی۔ بعد میں یہ نسخہ استاذ محترم نے شاہد میاں کو دے دیا تھا۔

باغی ہندوستان کی اہمیت اس بنیاد پر ہے کہ علامہ فضل حق کی حیات کا وہ رُخ جسکا تعلق اعلائے کلمۂ حق سے ہے۔ سب سے پہلے اسی کتاب کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔ اسکی اشاعت کے بعد سے علامہ کے حالات قلمبند کرنیوالے اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اور مستقبل میں بھی علامہ کا کوئی سوانح نگار اس سے مستغنی نہیں رہ سکتا۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مدینہ پریس بجنور میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دو ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے ساتھ مکتبۂ قادریہ کے زیر اہتمام لاہور میں شائع ہوئے۔ اب چوتھا ایڈیشن جس پر مصنف نے نظر ثانی کرکے ترمیم و اضافہ کے بعد کتاب کو نیا جامہ پہنایا ہے۔ المجمع الاسلامی (اسلامی اکیڈمی) مبارکپور ضلع اعظم گڈھ کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ جس کے لئے مولانا محمد احمد صاحب مصباحی صدر مدرس مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ ضلع اعظم گڈھ کی مساعی جمیلہ قابل شکریہ ہیں۔ جنھوں نے ناسازگار اور دشوار گذار حالات کے باوجود ہمت نہ ہاری۔ اور وسائلِ کتابت و طباعت مہیا کرکے اپنے زیر نگرانی یہ کام انجام دلایا۔

باغی ہندوستان کی دوبارہ تالیف اور ترتیب کا جب مرحلہ سامنے آیا تو پہلی ترتیب کی طرح اس مرتبہ بھی مصنف مرحوم نے مجھ سے ذریعۂ مراسلت پورا ربط قائم رکھا۔ جو ان کے سفر آخرت سے کچھ عرصہ پہلے تک قائم رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مکاتیب کے ضروری اقتباس درج کر دیئے جائیں:

علی گڑھ ۲؍مارچ ۸۲ء مخلص محترم سلام ورحمت

کارڈ ملا۔ میں نے حاشیہ تلخیص الشفار کے متعلق مکتبہ قادریہ لاہور کو لکھاہے۔ جواب آنے پر مطلع کرونگا۔ یعنی باغی ہندوستان کا ایک فائل بنالیا تھا۔ اب اسے نکال کر دیکھا تو اس میں سارا مواد مل گیا۔ معارف صدق اور تحریک کے پرچے بھی مل گئے جن میں تبصرہ اور تنقید تھی۔ آپکا وہ پرچہ بھی مل گیا جس میں تسامحات تھے۔ باغی ہندوستان پر نظر ثانی کرنے کا ارادہ ہے اور حشو وزوائد اور سیاسی اور مذہبی اختلافات سے صاف کرکے مزید علمی وتحقیقی مواد کا اضافہ کردیناہے .... کچھ منظومات ومنثورات کا بھی اضافہ کردیناہے۔ تاکہ محفوظ ہوجائے۔ اپنی رائے سے مطلع کیجئے علامہ کے متعلق مزید معلومات بہم پہونچایئے۔

مواد میں آپ کی اس قدر تحریر ہیچ کر بڑا حصہ اس پر مشتمل معلوم ہوتاہے۔ امتناع النظیر کی کاپی لاہور بھیج رہاہوں وہ کئی بار لکھ چکے ہیں، اسے چھاپنا چاہتے ہیں۔ آپ ازسرِ نو پڑھ کر یہ بھی بتائیں کہ کیا کیا حذف کرناہے، اور کس جگہ کیا اضافہ کرناہے، کام دشوار طلب ضرور ہے مگر مقصد سامنے ہو تو آسان ہوجائے گا۔

اس کے بعد ۳؍مارچ ۸۲ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

مخلص محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل ڈاک سے مرسلہ لفافہ ملا۔ کاغذات مل گئے۔ شکریہ۔ محمود میاں کا جواب آنے پر خط لکھوں گا — ابجواہر الغالیہ کے لئے بھی لکھوں گا۔ ایسے کام وہی ہوسکتے ہیں۔ آپ کی علالت سے تشویش ہے اب احتیاط اور دواؤں پر گاڑی چلے گی۔ میری تین دوائیں مستقل چلتی ہیں اور میرا پرہیزی کھانا الگ پکتاہے۔ دعوتوں میں شریک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرست رکھے۔ ملت کو آپ جیسے افراد کی بڑی ضرورت ہے۔ مولانا بریلوی کی آمد خیرآباد کی تاریخ صحیح ہوگئی۔ کیونکہ تضاد تو رفع ہوگیاہے۔ جو ان کے والد ماجد کے انتقال سے پہلے ہوگیا تھا۔ علامہؒ کے مقدمہ کی تسہیل ترتیب دے رہاہوں۔ شاہد شروانی ۶ ۵/۱۴۰۲ھ

مؤلف باغی ہندوستان نے اس جدید مسودہ کو ایسی حالت میں ترتیب دیاہے جبکہ ان پر ضعف اور مرض کا استیلا تھا۔ ان کی فرمائش کے مطابق جو کچھ مواد ہوسکتا تھا وہ میں نے انھیں بھیج دیا تھا۔ جس کا ذکر مارچ ۸۲ء کے مکتوب میں موجود ہے۔ کتاب کی ترتیب اور اضافہ وترمیم میں انھوں نے کافی محنت صرف کی ہے۔

افسوس کہ کتاب اس وقت طباعت پذیر ہو رہی ہے۔ جب وہ دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ وہ بے چینی سے اس کی طباعت کا انتظار کر رہے تھے۔ خدا کرے کہ انکی اس دوسری کاوش کو بھی شرف قبول حاصل ہو۔

محترم مولانا محمد احمد صاحب مصباحی کی خواہش تھی کہ باغی ہندوستان کے جدید ایڈیشن کے لئے میں حرف آغاز لکھ دوں۔ میرے لئے سخت دشواری یہ تھی کہ طویل عرصہ سے میں بسترِ علالت پر دراز ہوں۔ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا مضمون ہے۔ مختلف وقتوں میں لیٹے لیٹے یہ سطور قلمبند کر سکا ہوں

خداوند تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنے حبیب سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے مجھے شفائے کاملِ عاجل سے ہمکنار کرے۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ۔

نجم الحسن رضوی خیرآباد۔ ضلع سیتاپور۔ یوپی
شب ۲۱ ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ
مطابق ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء شب شنبہ

فحمداً لہٗ ثم حمداً لہ علی ماکسانا رداء الکرم
وشکراً لہ ثم شکراً لہ علی ماھدانا لشکر النعم

"باغی ہندوستان" کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے۔ جو حذف و اضافہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ پہلا ایڈیشن مدینہ پریس بجنور سے اوائل ۱۹۴۷ء میں نکلا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں مکتبہ قادریہ لاہور نے نکالا۔ اور اس کے ختم ہونے پر ۱۹۷۸ء میں تیسرا ایڈیشن نکلا۔ یہ تینوں ایڈیشن ایک ایک ہزار کی تعداد میں تھے۔

'باغی ہندوستان' کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۷ء کے آخر تک ختم ہو گیا تھا۔ ہندوستان و پاکستان سے صدہا خطوط اس کی طلب میں آئے۔ بیسیوں خطوط دوسرا ایڈیشن نکالنے کے اصرار پر مشتمل تھے۔

مقبولیت کے لئے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان و پاکستان میں کوئی سیاسی و تاریخی قابل ذکر ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ جس میں، "باغی ہندوستان" کا حوالہ نہ ہو۔

"باغی ہندوستان"، کے پہلے ایڈیشن میں بعض تصحیح طلب غلطیاں رہ گئی تھیں وہ پاکستانی دونوں ایڈیشنوں میں باقی رہیں۔ کیونکہ پاکستان میں دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں نکلا۔ جب کہ ہندوستان و پاکستان میں جنگ کی وجہ سے سلسلۂ مراسلت و مواصلت بند تھا۔ میرے علم و اطلاع کے بغیر مکتبہ قادریہ لاہور نے نکال دیا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں نکلا۔ اس سے قبل مکتبہ قادریہ' کی طرف سے نظر ثانی کے لئے مجھے لکھا گیا۔ یہ خط مجھے ایسے وقت ملا جب میں بیمار تھا۔ پھر اسی سال حج و زیارت کے لئے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو ایڈیشن نکل چکا تھا۔

میں فروری ۱۹۷۸ء میں ۳۲ سالہ خدمات کے بعد مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے اسسٹنٹ لائبریرین شعبۂ مخطوطات کے عہدہ سے ریٹائر ہوا تھا۔ اور اوقات فرصت کو کارآمد بنانا چاہتا تھا۔ اسی میں 'باغی ہندوستان' پر نظر ثانی، تصحیح اور حذف و اضافہ کا مرحلہ بھی تھا کہ بیمار ہو گیا۔ اور پوری طرح صحتیاب نہ ہو پایا تھا، کہ سفر حج پر روانہ ہو گیا۔ اور پھر پورا وقت نہ صرف کارآمد بلکہ عزیز ترین

گیاسے جہاں کی خاک روبی نے جہاں آرا کیا تجھ کو!
صبا ہم نے بھی ان گلیوں کی کچھ دن خاک چھانی ہے
(رضا بریلوی)

'باغی ہندوستان' کو بنیاد بنا کر روسی مستشرقہ مادام پوکونسکایا علامہ فضل حق خیر آبادی پر ریسرچ کے لئے ہندوستان آئیں۔ اور محترمہ قمر النساء بیگم معلمہ انوار العلوم ویمنس کالج حیدر آباد دنے عربی میں مقالہ تیار کر کے عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

خدا کا شکر ہے کہ مؤلف کی حیات ہی میں چوتھے ایڈیشن کی نوبت آگئی۔ اس ۳۸ سال کی مدت میں دنیا میں کتنے انقلابات رونما ہو گئے۔ ہندوستان کی آزادی، سرفہرست رہی۔ غلامی کے دور میں جو معلومات فراہم ہو سکیں۔ ان پر "باغی ہندوستان" مرتب ہو سکی تھی۔ آزادی کے بعد سیاسی و تاریخی سرکاری ریکارڈ سے نئے نئے انکشافات ہوئے۔ مثلاً:۔

علامہ کے مقدمہ کی سرکاری مسل مستند ذرائع سے علامہ کی آغازِ بغاوت سے دہلی میں موجودگی، دستورِ حکومت اور اس کے بائی لاز کی ترتیب، بعض دفعات کا نفاذ وغیرہ۔

'باغی ہندوستان' میں 'منشی جیون لال' کے روزنامچہ کی بنیاد پر علامہ کی موجودگی دہلی مئی کے بجائے اگست ۵۷ء سے دکھائی گئی تھی۔ بس پھر کیا تھا، مسلکی مخالفوں، اور مذہبی متعصبوں نے "پر کا کوا" بنا کر جہادِ حریت میں عدمِ شرکت کا ڈنکا بجانا شروع کر دیا۔ نواب رامپور کے نام مفروضہ عرضی اور ایک فتویٰ جہاد پر علامہ کے دستخط نہ ملنے پر جنگ آزادی میں عدمِ شرکت کی غوغا آرائی، 'الثورة الهندية' میں تحریف کی قیاس آرائی وغیرہ ان سب کے جوابات مستقل باب "مقدمہ اور اس کے متعلقات" میں ملاحظہ کئے جائیں۔

باغی ہندوستان پر تبصرہ نگاروں نے جن میں مولانا عبد الماجد دریابادی مدیر صدق جدید، لکھنؤ اور مولانا ریاست علی ندوی رکن ادارہ 'معارف' اعظم گڑھ بھی شامل ہیں۔ کچھ مفید مشورے دئے تھے۔ جدید ایڈیشن میں ان پر عملدرآمد ہو گیا ہے۔

پاکستانی ایڈیشنوں کے مقدمہ و حواشی میں تعریضوں کے ساتھ مؤلف کی نیت پر بھی حملے کیے گئے۔

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل و شکر خارا

جدید ایڈیشن میں صرف علامہ اور ان کے خلف الرشید سے متعلق، مواد رکھا گیا ہے۔ بقیہ ضمیمہ مختصر کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تین مستقل بابوں کا اضافہ، ہو گیا ہے۔ ایک باب میں جہاد حریت سے متعلق غوغا آرائی کا جواب ہے۔ دوسرا باب 'غلط فہمیوں کا ازالہ' ہے جو مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی ثم کراچی کا تحریر کردہ ہے اور موصوف کی تالیف "فضل حق اور سن ستاون" میں بطور ضمیمہ شائع ہو چکا ہے۔ تیسرے میں تصانیف کا تفصیلی تعارف ہے۔

میں بہ صمیم قلب محترم مولانا محمد لیسین اختر رکن المجمع الاسلامی مبارک پور (اعظم گڈھ) کا شکر گذار ہوں کہ موصوف کے پیہم اصرار اور مسلسل تقاضوں نے نظر ثانی، کا کام انجام دلایا۔ اور چوتھے ایڈیشن کی اشاعت کا سروسامان کیا۔

"باغی ہندوستان" میں املائی و طباعتی غلطیوں کی فہرست شروع میں لگا دی گئی تھی۔ اب غائر نظر ثانی کر کے مزید غلطیوں کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ بعض واقعی غلطیاں بھی تھیں۔ مثلاً ولادت و نسب کے باب میں مولانا فضل امام خیرآبادی کا سال ارتحال، سنہ ۱۲۴ھ درج ہو گیا۔ جب کہ سنہ ۱۲۴۴ھ ہونا چاہئے تھا۔ اور ملازمت کے زیر عنوان، والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر ۲۸ سال لکھ دی گئی تھی۔ جب کہ ۳۲ سال ہونی چاہئے تھی۔

"تعلیم و تربیت" کے عنوان کے تحت حصول الاشیاء بانفسہا و باشباحہا کے بارے میں مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی اپنے مکتوب مورخہ ۱۴/۹/۴۴ء میں لکھتے ہیں:-

> "شاہ صاحب نے جو کمزور پہلو اختیار کیا وہ باشباحہا کے بجائے بانفسہا ہے۔ خیرآبادی تو باشباحہا کو قوی اور صواب مانتے ہیں۔"

حاشیہ قاضی میں علامہ نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پاکستانی ایڈیشن کے حاشیہ نگار نے اس لغزش قلم کی بنیاد پر روایت کی ثقاہت ہی سے انکار کر دیا۔

؎ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے،

ڈاکٹر قمر النساء بیگم حیدر آبادی کا مقالۂ عربی "العلامۃ فضل حق الخیرآبادی حیاتہ ومآثرہ مع تحقیق کتابہ الثورۃ الھندیہ" فل سکیپ سائز کے ۴۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ فہارسِ اعلام واماکن و مآخذ اس کے علاوہ ہیں۔ ڈاکٹر عبد الستار خاں صدر شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کی نگرانی اور مولانا رحیم الدین مرحوم (والد مقالہ نگار) کی سعیٔ فراہمی مواد سے یہ مقالہ تقریباً چار سال میں مرتب ہو سکا ہے۔

جلسۂ تقسیم اسناد عثمانیہ یونیورسٹی منعقدہ ۱۴ / مئی ۱۹۸۱ء میں مقالہ نگار ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر بن چکی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مقالہ نگار نے مروجہ اسلوب تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے۔ 'الثورۃ الہندیہ' کے مندرجات کے لئے تاریخی شواہد پیش کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہادِ آزادی ۱۸۵۷ء کا سب سے اولین اور سب سے زیادہ معتبر یہ رسالہ دستاویزی ثبوت ہے۔ کیونکہ یہ ایسی گرانمایہ شخصیت کا نتیجۂ فکر و قلم ہے جو اس جہاد میں نہ صرف شریک کار تھی بلکہ اپنی بصارت و بصیرت سے نتائج و عواقب کا بھی اندازہ کئے ہوئے تھی۔

اس مقالہ میں نسبی اور تعلیمی شجرے اور جغرافیائی نقشے بھی حسب مواقع خاصی تعداد میں ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس تحقیقی مقالہ کو کوئی ادارہ شائع کر کے دنیائے عرب کو بھی اس بطل جلیل کے مجاہدانہ اور علمی و ادبی کارناموں سے روشناس کرانے کا موقع بہم پہنچاتا۔

مکتبہ قادریہ لاہور مستحق تبریک و تحسین ہے کہ اس نے یہ ذمہ داری قبول کر کے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ میں شکر گزار ہوں کہ مقالہ نگار نے میری استدعا پر اپنا مقالہ بھیج کر مجھے استفادہ کا موقع دیا۔ اور میری تالیف باغی ہندوستان کے بے شمار حوالوں کو اپنے مقالے میں درج کر کے اس کی اہمیت بڑھائی۔ جزاہا اللہ خیر الجزاء۔ میں رفیق محترم مولانا الحاج مفتی سید نجم الحسن خیر آبادی کا بھی شکر گذار ہوں کہ موصوف نے علامہ اور ان کے خلف الرشید کی تصانیف کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ محمد عبد الشاہد خاں شروانی۔ ۱ ۱/۴۸۴

مقدمہ طبع اول

باسمہ سبحانہ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

رسالہ "الثورۃ الہندیہ" علامہ فضل حق خیرآبادی نے جزیرۂ انڈمان میں بحالت مجبوری لکھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے المناک حادثات، حکومت مسلطہ کے عزائم، اور اپنی تباہی و بربادی کا اپنے مخصوص انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ جب حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاذ مولانا مفتی لطف اللہ علی گڈھی) ایک انگریز افسر کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کر کے ۱۲۷۷ھ میں رہائی پا کر عازم ہندوستان ہوئے تو یہ رسالہ علامہ نے اپنے خلف الرشید مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس مختلف کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں پر کوئلہ وغیرہ سے لکھ کر بھیج دیا تھا۔ اسی رسالہ کے ساتھ قصائد فتنۃ الہند بھی تھے۔ مولانا عبدالحق نے بڑی محنت و کاوش سے اسے مرتب کیا۔ اور چند مخلصین و معتقدین نے اس کی نقلیں حرز جاں بنا کر اپنے پاس رکھیں۔

اس طرح اس کے نسخے خاص خاص حضرات کے پاس محفوظ ہو گئے۔ حکومت کے خوف سے کسی نے اس کے عام کرنے کی کوشش کی۔ نہ کوئی چھپوانے کی جرأت کر سکا میرے استاذ محترم مولانا معین الدین اجمیری (۱۲۹۹ھ/۱۳۵۹ھ) نے کئی بار ارادہ اشاعت کیا۔ لیکن مثل ۲ امور مرہون باوقاتہا کے مطابق پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا ۱۹۳۸ء میں فلسطین سے متعلق میری چند تقریروں پر حکومت راجپوتانہ نے مجھے گرفتار کر کے مقدمہ چلا دیا۔ استاذ محترم علیل تھے۔ کرم بے پایاں نے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ خدا نے ایک سال بعد اس مصیبت سے جس پر ہزار راحتیں قربان ہوں، نجات دی تو مولانا نے خوش ہو کر "رسالہ غدریہ" عنایت فرمایا۔

یہ موجودہ نسخہ مولانا نے اپنے قلم سے اپنے استاذ محترم مولانا حکیم برکات احمد، بہاری ٹونکی کے نسخہ سے بزمانہ طالب علمی خوشخط نقل کیا تھا۔ حواشی پر جابجا حل لغات بھی

کر دیا گیا ہے۔ اس رسالے میں دو عربی قصائد "فتنۃ الہند" بھی ہیں۔ جو ۱۲۷۶ھ میں، رسالہ کے ساتھ ہی انھیں واقعات پر مشتمل لکھے گئے ہیں۔ ایک قصیدہ ہمزیہ اور دوسرا دالیہ ہے۔

علامہ کی درجنوں معرکۃ الآراء تصانیف ہیں۔ ہر تصنیف میں علمی و ادبی کمال، پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ اس رسالہ کی اہمیت یوں بڑھ گئی ہے کہ خوفناک مصائب اور الم انگیز حالات میں لکھا گیا ہے۔ شاہانہ خلعت کے بجائے فقیرانہ لباس میں ملبوس، فضائے آزادی کی جگہ جزیرۂ انڈمان میں محبوس، اعزّہ و احباب سے دور، اور اس پر مجبور و مقہور۔ پھر بھی ادبیت کی چاشنی پوری طرح حلاوت ریز، اور فصاحت و بلاغت کی بوئے مشک بیز ہے۔

رسالہ کا ترجمہ

میں تکمیل درسیات اور مولانا اجمیری، کی وفات کے بعد ۱۹۴۰ء میں وطن مالوف چلا آیا۔ اور دار العلوم حافظیہ سعیدیہ دادوں، ضلع علی گڈھ میں تدریسی خدمات اور خانگی مصروفیات میں پھنس گیا۔ ۷/۸/ فروری ۱۹۴۵ء کو بجولی تحصیل اترولی ضلع علی گڈھ میں، اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہونے والی کسان کانفرنس کے صدر، ہندوستان کے مشہور لیڈر، ڈاکٹر کنور محمد اشرف کانفرنس سے فارغ ہو کر غریب خانہ (ہادی منزل بھموری ضلع علی گڈھ) پر قیام پذیر ہوئے۔ میرے مختصر سے کتاب خانہ کا ایک شبانہ روز جائزہ لیا۔ رسالہ غدریہ بھی ہاتھ آ گیا۔ دیکھا، اور دیکھتے چلے گئے۔ مجھ سے ترجمہ کی پر زور فرمائش کی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ آتشِ شوق کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ میں نے اوّلین فرصت میں ترجمہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب نے بمبئی سے پھر یاد دہانی کی۔ اپنے دوست سعید محمد ٹونکی ٹیچر مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڈھ کو بھی اس کے متعلق لکھا۔ موصوف نے بروقتِ ملاقات مجھے اس طرف متوجہ کیا ____ اسی درمیان سید الطاف علی سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ملاقات ہوئی۔ سید صاحب نے سب سے پہلی علمی خدمت اسی رسالہ کے ترجمہ کی میرے سپرد کی جسے تائیدِ غیبی سمجھتے ہوئے، خدا کا نام لے کر اس بارِ گراں کو اٹھانے کا عزم مصمم کر لیا۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا کتنا دشوار امر ہے۔ خصوصاً جب ک ترجمہ بامحاورہ بھی ہو اور الفاظ کے معانی نظر انداز نہ ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ صاحب فضل و کما اور مسلّم ادیب کی وہ تحریر بھی ہو۔

خیر میں نے ترجمہ شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں کتاب خانہ حبیب گنج اور لٹن لائبر مسلم یونیورسٹی کے نسخوں سے بھی مدد لی۔ ایک نسخہ مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری، شاگر رشید علامہ فضل حق خیرآبادی کے دست مبارک کا لکھا ہوا بھی دستیاب ہو گیا۔ یہ نسخہ مولا سید سلیمان اشرف صاحب سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی (شاگرد مولانا جونپوری) کی دوسری مخصوص کتابوں کے ساتھ حبیب گنج پہنچ گیا تھا۔ جو کتابت کے لحاظ سے دوسر نسخوں سے قدیم و صحیح ثابت ہوا۔

۲۷ ستمبر ۱۹۴۵ء کو میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں دہلی حاضری دی تو رسالہ کے ترجمہ کا ذکر کیا۔ موصوف نے نہ صرف کلماتِ ہمت افزائی فرمائے۔ بلکہ اس وقت کی اہم ضرورت بھی بتایا۔ یہ بھی فرمایا کہ ۱۹۲۱ء میں مولانا معین الدین اجمیری ن یہ رسالہ مجھے دکھایا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ وہی رسالہ استاد محترم نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ اور میرے پاس محفوظ ہے ——— بالآخر یہ طے رہا کہ ترجمہ کی تکمیل کے بع مولانا کی خدمت میں بھیجا جائے۔ چنانچہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو بذریعہ رجسٹری پارسل مولا کے پتہ پر کلکتہ روانہ کر دیا۔ مولانا کلکتہ سے خرابیٔ صحت کی بنا پر بندھیاچل ضلع مرزاپو تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے سوا مہینے کے بعد ملاحظہ کر کے ۱۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو واپ روانہ کیا۔ جو ۲۱ نومبر کو مجھے مل گیا۔ مولانا نے شفقتِ بزرگانہ سے چار مقام پر مختص اصلاح بھی فرمائی۔ اور رسالہ کے ساتھ ایک گرامی نامہ بھی باعثِ افتخار ہوا۔

ترجمہ کی تکمیل اور اسے سندِ قبول حاصل ہو جانے کے بعد خیال ہوا کہ اس نعمت سے دوسروں کو بھی متمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔ ——— مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ بجنور سے رجوع کیا گیا۔ موصوف نے میری آواز پر صدائے لبیک بلن فرمائی۔ اور ان کے خلف الصدق عزیز محترم سعید اختر بجنوری نے پیہم تقاضے بھی شروع کر دیئے۔

ایک مرحلہ پیش لفظ کا باقی تھا۔ جس کے لئے مولانا آزاد سے زیادہ موزوں کوئی شخصیت میرے سامنے نہ تھی۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۴۶ء کو دہلی حاضری دی۔ اور موقع پاکر درخواست بھی کر دی۔ جو قبول ہوئی۔ پھر کچھ دنوں بعد ۲۰ر اگست ۱۹۴۶ء کو یاددہانی کی۔ میں بہت ہی ممنون ہوں کہ انھوں نے بے پناہ سیاسی مصروفیات کے باوجود، "پیش لفظ" کے دو صفحے اپنے قلم سے لکھ کر عنایت فرمائے۔ جو میرے نزدیک دو سو صفحات سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔

اضافۂ سوانح

پہلے میں نے سوچا تھا کہ دیباچہ میں علامہ کی مختصر سوانح حیات بھی ذکر کر دوں گا۔ مگر جب لکھنے بیٹھا تو قلم پر قابو نہ رکھ سکا اس وقت تک اس فاضلِ اجل اور مجاہدِ اعظم کی کوئی سوانح حیات بھی مرتب نہ ہوئی تھی۔ یہ خوف بھی اپنی جگہ دامن گیر تھا کہ اگر کچھ دن اور اسی طرح یہ ذات گرامی پردۂ خفا میں رہی۔ تو اتنے حالات بھی نہ مل سکیں گے جتنے پیہم جدوجہد اور کوشش و کاوش سے اب دستیاب ہو سکتے ہیں —— مصر میں جب علامہ کی معرکۃ الآرا کتاب "ہدیہ سعیدیہ" چھپی تو مدیر مطبع نے اظہارِ تاسّف کرتے ہوئے لکھا کہ افسوس ہے ایسے فاضل جلیل کے متعلق ہمیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس مصنف کا تعارف کرا سکتے۔ ان خیالات کے پیش نظر ۸۰، سال کے بعد اس عظیم بار کو اٹھانے کی جرأت کرنی پڑی۔ خوش نصیبی سے مسلسل سات سال ۵۴ھ تک حصولِ علم کی خاطر، خیرآباد میں قیام رہا۔ علامہ کے اہلِ خاندان سے گھر کا سا واسطہ رہا۔ بزرگوں کی شفقت اور برابر والوں کی عنایت شاملِ حال رہی۔ وقتاً فوقتاً علامہ اور ان کے خلف الرشید مولانا عبدالحق کے حالات و واقعات سے کان آشنا ہوتے رہے۔

شعبان ۵۴ھ کو حضرت الاستاذ علامۃ الہند مولانا اجمیری کی خدمت میں طالع کی بلندی اور نصیبہ کی فیروزمندی نے پہنچا دیا۔ مولانا اجمیری سلسلۂ خیرآ، کے نہ صرف شاگرد تھے بلکہ عاشق بھی تھے۔ جس ذوق و شوق اور بے خودی و وارفتگی سے ذکرِ افاضلِ خیرآباد کرتے تھے سننے والے اور دیکھنے والے ہی اس کی لذت سے واقف ہو سکتے ہیں۔ کافی ذخیرۂ معلومات اس دربار سے ہاتھ لگا تھا۔

بیسیوں تاریخیں اور درجنوں تذکرے بھی دیکھنے پڑے۔ ہر جگہ نہایت اختصار کے ساتھ علامہ کا ذکر ملا۔ اس میں بھی مرزا اسد اللہ خاں غالب کا شکر گذار ہونا پڑے گا۔ کہ موصوف نے بعدِ وفات بھی حق دوستی ادا کیا۔ غالب کے تقریباً تمام تذکروں میں علامہ کا ذکرِ خیر مختلف پہلوؤں سے ملا۔

شاہ اسمٰعیل دہلوی کی سوانحِ حیات لکھنے والوں نے علامہ کے ساتھ بڑا ظلم روا رکھا۔ رنگ آمیزی اور بہتان طرازی سے بھی دریغ نہ کیا۔ خالص علمی مسائل کے مناظرہ و مباحثہ کو ذاتی "بغض و عناد پر محمول کیا۔ مجھے اس مسئلہ پر اپنے مقام، پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنی پڑی۔ علامہ کے حالات کے سلسلے میں مختلف مقامات کو خطوط لکھنے پڑے ہیں۔ ان تمام دوستوں اور بزرگوں کا شکر گذار ہوں جنھوں نے میری عرضداشت پر تکلیف گوارا کر کے حالات بھیجے۔

سب سے زیادہ مدد رفیق محترم مولوی مفتی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی نے پہنچائی۔ خیرآباد و اجمیر میں ۱۱ سال تک میرے شریکِ درس رہے ہیں۔ علامہ کے خاندان سے قرابت بھی رکھتے ہیں۔ خیرآباد کے مشہور محدث حاجی صفت اللہ کی اولاد امجاد سے ہیں۔ رفیق موصوف نے خیرآباد و لاہور کے قلمی تذکروں سے بھی حالات اخذ

---

[1] موصوف، مخدوم شیخ اللہ دیا خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔ اجلۂ مشائخ اور صنادید فضلاء میں آپ کا شمار ہے۔ فنونِ عقلی و نقلی میں رتبۂ بلند اور سلوک و فقر میں منزلۂ ارجمند رکھتے تھے۔ مولوی قطب الدین شمس آبادی تلمیذ ملا قطب الدین شہید سہالوی (والد ملا نظام الدین سہالوی صاحب درس نظامیہ) کے شاگرد اور مشہور بزرگ حاجی عبد اللہ سیاح کے مرید تھے۔ سالہا سال سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ بہت سے فاضل آپ سے فیضیاب ہوئے۔ سنہ ۱۱۲۲ھ میں حج و زیارت کے لئے گئے۔ کافی عرصہ وہاں قیام کیا۔ مشہور محدث وقت شیخ محمد طاہر مدنی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ وہیں درس دینا شروع کیا۔ تمام علماء بقاعِ مقدسہ آپ کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے۔ اور تعظیم و اکرام سے پیش آتے تھے۔ ایک بڑا حلقہ شریکِ درس ہوتا۔ تین حج کرنے کے بعد وطنِ مالوف واپس پہنچے۔ یہاں پھر بدستور سلسلۂ درس و تدریس جاری کر دیا۔ مگر درسِ معقولات بالکل بند کر دیا۔ آخر عمر تک وعظ و درسِ تفسیر و حدیث پر اکتفا کیا۔ ریاضاتِ شاقہ سے سینہ کو گنجینۂ انوار بنایا۔ (بقیہ ص ۲۱ پر)

کئے۔ محترم المقام مولوی نظیر احمد فاروقی رئیس خیرآباد سے بھی مدد ملی۔ مولوی صاحب بھی شجروں اور خاندانی حالات و واقعات کے حافظ ہیں۔ آپ کے والد ماجد نواب بشیر احمد فاروقی مرحوم نے خاندانی یادداشتیں مرتب کر دی تھیں۔ یہ نایاب ذخیرہ بھی موصوف ہی کے پاس ہے۔ نہ صرف خیرآباد بلکہ ہرگام، گوپامئو، سندیلہ اور کاکوری وغیرہا جہاں جہاں بھی خیرآباد کا سلسلۂ نسب ملتا ہے سب کے تفصیلی شجرے موجود ہیں۔

عزیز گرامی مسٹر منیر خاں خلف اوسط حضرت الاستاذ مولانا محمد بشیر خاں رامپوری صدر المدرسین مدرسہ نیازیہ خیرآباد نے علامہ کے دیوانخانہ کے شکستہ دروازہ کا اندرونی و بیرونی فوٹو کھینچ کر روانہ کیا۔ اس میں بھی رفیق محترم کی کوششوں ہی کو دخل ہے۔ مولوی حکیم ظفر الحق نبیرۂ مولانا عبد الحق نے جائداد کی ضبطی کا تفصیلی حال لکھ کر اعانت فرمائی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی کے تذکرۂ علمائے گوپامئو اور فضلائے ہند سے بھی کافی مدد ملی۔ موصوف کے مفید مشورے بھی شامل حال رہے۔ ہندوستان کے مشہور لیڈر عبد المجید خواجہ بیرسٹر صدر آل انڈیا مسلم مجلس، سید بشیر الدین لائبریرین لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی، رئیس حبیب گنج ضلع علی گڈھ سے بھی وقتاً فوقتاً حالاتِ پارینہ اور واقعاتِ گذشتہ پر گفتگو رہی جس سے کافی مواد مہیا ہوا۔ میں ان حضرات کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یہ بھی میرے لئے باعث افتخار ہے کہ ۳۰ راگست ۱۹۴۶ء کو جب مولانا

(بقیہ صفحہ ۲۰ کا) بروز پنجشنبہ ۸ ار ذی قعدہ ۱۱۵۷ھ کو اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ مادۂ تاریخ "ملا نظام الدین" ہے۔

۱۱۵۷ھ
بحرِ عرفاں صفت اللہ کہ بود   عالم عامل والا رتبت،
خامۂ فکرتِ من تاریخش   زد رقم "صدر نشین جنت"
۱۱۵۷ھ
مآثر الکرام   (مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی۔)

آزاد کی خدمت میں بمعیت خواجہ صاحب موصوف حاضری ہوئی، تو مولانا نے نصف گھنٹہ اس سوانحِ حیات کے ملاحظہ کرنے میں صرف فرمایا اور کلماتِ تحسین سے نوازا۔

میں اپنی اس ناچیز سعی کو مجاہدِ عظیم بطلِ جلیل حضرت الاستاذ مولانا محمد معین الدین اجمیری (متوفی ۱۳۵۹ھ) کے نام نامی سے منسوب و معنون کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ باری تعالےٰ مولانا اجمیری اور علامہ خیرآبادی کا ثبات و استقلال ہم سب وابستگانِ دامن کو بھی عطا فرمائے۔ آمین۔

میں نے رسالہ و قصائد کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" پر عمل کیا ہے۔

اس رسالہ کے دیکھنے سے اس وقت کے ہولناک حالات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور نصاریٰ کے خوفناک عزائم کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی رعایا کے گلے میں دائمی غلامی اور نصرانیت کا پٹہ ڈالنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اور علمارِ مجاہدین کا ایسے موقعہ پر اعلان جہاد، کس قدر بر وقت اور ضروری تھا۔

علامہ خیرآبادی "عدالت" سے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا خندہ پیشانی سے سن کر راہیِ جزیرۂ انڈمان ہوئے۔ اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کاملۃ۔

بعدِ وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ما

محمد عبدالشاہد خان شروانی
اورینٹ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

جمعہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ
۲۴ اگست ۱۹۴۶ء

تعارف

از: مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ اہل علم میں متداول تھا لیکن آج تک اس کی طباعت کا سروسامان نہ ہو سکا۔ "غدر" ۵۷ء کی بربادیوں کے بعد لوگوں کی ہمتیں اس درجہ پست ہو گئی تھیں کہ اس قسم کی تحریرات کی اشاعت کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ خود مولانا کے خاندان نے اس کی اشاعت مصلحت کے خلاف سمجھی اور جن لوگوں کے پاس اس کی نقلیں تھیں وہ بھی اس کی نمائش احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے۔ آج ہم اس رسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات ایسی نہیں پاتے جسے سیاسی حیثیت سے خطرناک تصور کیا جائے لیکن اس زمانے کا حال دوسرا تھا۔

"غدر" کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرم بغاوت مدۃ العمر قید کی سزا دی گئی تھی زیادہ سے زیادہ خطرناک بات یقین کی جاتی تھی۔

والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل مولانا مرحوم کی خدمت میں کی تھی اس لئے ان کی مصنفات اور حالات سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔

مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کر کے والد مرحوم کو مکہ معظمہ بھیجا تھا چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولوی عبدالشاہد صاحب شروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تصحیح و اشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔

اب ان کی کوشش سے نہ صرف اصل رسالہ پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی مہیا ہو گیا ہے۔ ترجمہ میں نے مختلف مقامات سے دیکھا سلیس اور شگفتہ عبارت میں کیا گیا ہے اور اصل کی لفظی رعایت کے ساتھ اسلوب بیان کی شگفتگی اور روانی بھی محفوظ رکھی گئی ہے۔ امید ہے کہ عزیز موصوف کی یہ سعی مشکور ہوگی اور رسالہ عام طور پر مقبول ہوگا۔ **ابوالکلام** دہلی ۱۲؍اگست ۱۹۴۶ء

---

[1] ۲۲؍فروری ۱۹۵۸ء کو رہگزار ملک بقا ہوئے ۱۲ شاہد شروانی۔

الثورۃ الہندیہ

و

قصائد فتنۃ الہند

انگریزی مظالم کے لرزہ خیز واقعات
جنگ آزادی کی خونیں داستان

از

علامہ فضل حق خیرآبادی

ترجمہ

مولانا عبد الشاہد خاں شروانی

بسم الله الرحمٰن الرحيم

الحمد لله عظيم الرجاء للانجاء من دون الارجاء من البلوى والبِلى والبلاء، وإيلاء حسَن البلاء بإيتاء الآلاء لمن دعاه بأسنى الأسماء لاسيما لمن ظُلم واضطُرّ عند الابتلاء بالأسواء والأدواء۔

والصلوٰة على بشير بشيرٍ[1] نذير بشر به أنباء الأنباء[2] المرجّى شفاعته لدفع البلايا والأوباء وكشف ظُلَم ظُلمِ الأعداء والشفاء من عضالِ الداء ووبال الشقاء، وآله النُّجباء النُّقَباء الكرماء وصحبه العظماء الأشدّاء الرحماء، سيما الحنفاء الخلفاء، سلم الله وبارك عليه وعليهم ما سبّح الملك في الفلك والسماء، وسبح الفُلك في الفلك والدّاماء،

وبعدُ فإن كتابي هذا كتابُ أسيرٍ كسيرٍ حسيرٍ ؛ على ما فات متحسّر ؛ مبتلًى بكل عسير ؛ لا يُطاق ولو في أن يسير ؛ منتظرٍ لفرجٍ على ربه يسير ؛ ومكبولٍ مخبولٍ ؛ واقعٍ في أُحبول ؛ على الدعة والسعة من بدء فطرته مجبول ؛ يرجو النفَس من كربه من نفس ربّه بدعاءٍ مقبول ؛ ومحبوسٍ في باسٍ بئيسٍ وبوس ؛ وكّل إلى ظَلوم عَبوس ؛ عَرّاه عما كان له من رُئيٍّ وزيٍّ وملبوس ؛ وابتلاه بشجونٍ شجون ؛ في مضائق سجون ؛ هي مجامع فتن جُون ؛ ومحتبسٍ مبتئس ؛ من الخلاص متأيّس ؛ نظرًا إلى تحكم محتبس ؛ فظٍّ غليظِ القلب محتبس ؛

- لكنّه من رحمة ربه ليس بيئوس وغيرِ يئيس ؛

---

[1] الأول من البِشر بكسر الباء بمعنى بشاشة الوجه۔ البشير حسن الوجه، والثاني صفة بمعنى الفاعل أي المبشر ١٢ [2] انباء الانباء، كلاهما بفتح الهمزة الأول جمع نبأ وهو الخبر والثاني جمع نبيء على وزن فعيل أو جمع نبيّ على وزن عليّ، والنبي المخبر من الغيب ١٢ من اليواقيت المهرية شرح الثورة الهندية للعلامة غلام مهر علي الگولڑوی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام ثنائیں اس خدائے برتر کے لئے ہیں، جس سے بغیر کسی ناامیدی کے، محنت و آزمائش، خستگی و بوسیدگی اور غم و تکلیف سے نجات دینے کی بہت بڑی امید وابستہ ہے اور جو اسے اس کے اعلیٰ نام سے پکارے اسے بہترین عطایا اور بیشمار نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔ بالخصوص مظلوم و مضطر کی، اس کی مصیبتوں اور بیماریوں میں سننے والا ہے۔

سلام ہو اس خوشرو، خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے پر جسکی تمام نبی نوید مسرت آمد سناتے آئے۔ بلا و وبا کے دور کرنے، دشمنوں کے ظلم کے پردے چاک کرنے، بڑی بدبختی اور سخت بیماری سے نجات دلانے کی، گنہگاروں اور سیہ کاروں کو، اس کی شفاعت سے بڑی امید ہے۔ سلام ہو اس کی شریف و نجیب و کریم اولاد اور اس کے عظیم المرتبہ، شدید و رحیم اصحاب پر خصوصاً پاکباز و صاف باطن خلفاء پر۔ اللہ کی رحمتیں، اور برکتیں۔ ان سب پر نازل ہوں جب تک فرشتے آسمان پر تسبیح و تہلیل کرتے رہیں۔ اور کشتیاں سمندر میں تیرتی رہیں۔

میری یہ کتاب، ایک دل شکستہ، نقصان رسیدہ، حسرت کشیدہ اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے۔ جو اب تھوڑی سی تکلیف کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اپنے رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے، مصیبت سے نجات کا امیدوار ہے۔ جو ابتدائے عمر سے عیش و فراغت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود، اب محبوسِ دام ظلم اور تباہ شدہ ہے اور مقبول دعاؤں کے ذریعہ خدا سے ازالۂ کرب کا طالب ہے۔ وہ بڑی مشکلات میں مبتلا اور ترش رو ظالموں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ ان ظالموں نے اسے اچھے لباس سے معرّا کرکے غم و حزن کی وادیوں اور ایسے تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈالدیا ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں۔

وہ محبوس و حزیں، سخت دل، اُچکّے، اور ظالم افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادھا، نرم خو،

ضریر بلِس ؛ فی أَسر شریر بلس ؛ وحائر جائر بائر تعِس ؛ من ظلم جابر جائر شکِس شرِس ؛ وبائسٍ آئس ؛ مُنِیَ بشد أنَدَّ لا ینتهی الیها قیاسُ قائس ؛ ومغترٍ ومعترٍ ومضطر فُتِنَ باشد احتباس ؛ واحمر باس ؛ فی أَسرِ ابیض اسود الکبد ازرقَ عبّاس ؛ اصهب الشعَر متلوّنٍ لبّاس ؛ جرّدَہ عما کان لہ من لِباس ؛ وکساہ اخشنَ کساء وکِرْباس ؛ وعاجزٍ جازع فازع ؛ الیٰ ربہ فازع ؛ نزیعٍ من اُسرتہ بالاَسر نازع ؛ الیہم نازع ؛ نُفِیَ علیہ بلا مُدّعٍ ومُنازع ؛ وسادمٍ نادم عادم ؛ لکل منادم وخادم ؛ فُتّ فی اَعضادہ باشد مصادم ؛ ونجیدٍ فرید طرید عُنّیَ فجُلّیَ من ارضہ وبلدہ ؛ وکئیبٍ کریب غریب عُنِیَ فانُئیَ عن اهلہ وولدہ ؛ ضامَہ ظلوم وجارَہ ؛ وانُئیَ عنہ اهلَہ وجارہ ؛ وخلی عنہ وعنهم وِجارہ ؛ اَسَرَہ فقسرَہ وکسرَہ بکل ضرب من الاِیلام ؛ لتصلّبہ وتعصبہ فی الایمان والاسلام ؛ واشتهارِہ اَنہ من العلّام الاَعلام ؛ ورَوما لدَرسِ رسم الدرس ؛ وطَمسِ عَلَم العِلم حتی من القرطاس والطرُس ؛

وذلک لواقعةٍ فازعة ترکتِ الدیارَ بلاقع ؛ وجعلتها لصوائبِ المصائب مواقع ؛ واَمطرتْ علی اهلها من غَمام الغموم صواعق وصواقع ؛ وفاقرةٍ جعلتِ الاُمراءَ فُقراءَ صَعالیک ؛ والملوک اُسَراءَ مَمالیک ؛

مِن قصتِها اَنّ النصاریٰ البراطنہ ؛ الأُولیٰ شَحَنُوا صدورَهم بالشَّحناءِ الباطنہ ؛ بعد ما تسلّطوا علی ممالکِ الهند واَقطارِها ؛ وقُراها وَاَمصارِها ؛ واستولَوا علی حدودها وثغورِها ؛ واَحاطوا بأَعجازها وصدورِها ؛ وذَلّلوا اَعزّةَ رُؤَسائِها بلا استِقصاء ؛

اور مریض و کمزور ہوتے ہوئے، شریر و بدفطرت کی قید میں ہے۔ اور ظالم و جابر، بدخلق و بدکردار کے مظالم سے حیران و پریشان ہے۔ وہ آفت رسیدہ، ایسے مصائب میں مبتلا ہے جن کی سختیوں تک قیاس کرنے والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا۔ اور ایسا مضطر و محتاج ہے جو سخت عذاب و احتباس میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ سفید رو، سیاہ دل، متلوّن مزاج، ترش رو، کنجی آنکھ، گندم گوں بال والوں کی قید میں آچکا ہے۔ جس کا اپنا عمدہ لباس اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا گیا ہے۔ جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور اپنے رب سے لو لگائے ہوئے ہے۔ اپنے تمام اعزہ و اقربا سے دور اور بہت دور ہے۔ مدعی اور منازع کے بغیر اس پر فیصلہ صادر کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہم نشینوں، اور خادموں کے سامنے شرمندہ ہے۔ اس کے بازوؤں کو سخت تصادم سے کمزور کر دیا گیا ہے۔ وہ غمزدہ، تنہا اور دور افتادہ ہے۔ اسے اپنی زمین و شہر سے جلاوطن اور اہل و عیال سے دور کر دیا گیا ہے۔ یہ سارا ظلم و ستم، ظالم بدکیش نے روا رکھا ہے۔ اسے اور اس کے اہل و عیال کو اپنی درندگی کی جھاڑی میں چھوڑ دیا ہے۔ اسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی ہے۔ اس کا قصور، صرف ایمان اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا، اور علمائے اعلام میں شمار ہونا ہے۔

اس سے ان ظالموں کا مقصد نشان درس و تدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا ہے، وہ صفحات قرطاس سے بھی نام و نشان مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس حادثہ فاجعہ (انقلاب ۱۸۵۷ء) کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس نے آبادیوں کو ویران، اور مصیبتوں کی شور زمین کو شاداب بنا دیا ہے۔ جس سے غموں کے بادلوں سے کڑکتی ہوئی بجلیاں، مصیبت زدگانِ وطن پر گریں۔ اور ان پر بادشاہوں کو غلام و قیدی اور امراء کو محتاج و فقیر بنانے والی محتاجی و ناداری مسلط کر گئی۔

یہ داستانِ الم اس طرح ہے کہ وہ برطانوی نصاریٰ، جن کے دل ممالکِ ہند کے دیہات و بلاد پر قبضہ، اور اس کے اطراف و اکناف و سرحدات پر تسلط کے بعد عداوت و کینہ سے بھر گئے تھے۔ اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل و خوار

ولم يذروا فيها من يبدى لهم قرنه بالاستعصاء؛ هموا بان
ينصروا جملا من قطانها وسكانها ؞ ورؤسها ووجوهها واعيانها ؞
ونبالها ونذالها واجلتها واذلتها؛ تنصيرا ؞ ظنا بان هؤلاء الضعفاء
لايجدون وليا ولانصيرا ؞ ولايستطيعون سوى الانقياد محيصا
ومصيراً؛

ليصير الناس كلهم كثلهم من ملاحدة ؞ متوافقين على
ملة واحدة ؞ ولايفترق فرقة من فرقة بان يتدين كل
بدين على حدة؛ لتخيلهم ان اختلاف النحل ؞ فى الاديان و
الملل ؞ من اقوى العلل ؞ لتطرق الخلل ؞ فى بقاء التسلط و
العمل ؞ وحدوث الحول ؞ فى الولايات والدول ؞ فجدوا كل
جد، وبذلوا كل جهد، لرفع هذا الاختلاف بابتداع الحيل؛
فبنوا لتعليم الاطفال والاغفال وتلقينهم كتب لسانهم ودينهم
فى القرى والبلاد مدارس ؞ وصيروا معالم العلوم والمعارف
والمدارس ؞ والعهود التى بنيت فى العهود السوالف دوارس؛

وقد دروا اذ قدروا ان يقدروا على هؤلاء الاشتات ؞ فى
المأكل والاقوات ؞ بان ياخذوا كل مايخرج من الارض
من السنابل والغلات؛ ويعطوا نقوداً بدل حقوق الحراث والزراع؛
ثم لايبقى لهؤلاء المساكين، والدهاقين والاراكين، خيرة تصرف فى الغلات
بالبيع والابتياع؛ وان يستاثروا انفسهم ببيعها وشرائها ؞ وان يكون لهم
الخيرة فى ترخيص الاسعار ورخائها؛ فيضطر عباد الله احتكارهم ؞ ويشتد
حاجتهم اليهم وافتقارهم ؞ ويلجئهم اضطرارهم ؞ الى التلقى مايروم الانصار وانصارهم
الغيرذ الذى مما فى قلوبهم من المنى والاهواء؛ وماتكن صدورهم من الفتن والاسواء؛
كالافتتان بمنع الختان؛ ورفع الحجاب من العقائل والخواتين ؞ وطمس سائر احكام
الدين المحكم المتين؛ فعمدوا بادى بدء بمكائدهم ؞ الى ان يزلوا اجنودهم من مسلميهم

کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ سرِ نافرمانی کو جنبش دے سکے۔ انھوں نے تمام باشندگانِ ہند کو کیا امیر کیا غریب، چھوٹے بڑے، مقیم و مسافر، شہری و دیہاتی سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار و معاون نصیب ہو سکے گا اور نہ انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انھیں کی طرح ملحد و بے دین ہو کر ایک ہی ملّت پر جمع ہو جائیں۔ اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔ انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف، تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اس لئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا۔ انھوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے۔ پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمینِ ہند کے غلہ کی پیداوار، کاشتکاروں سے زرِ نقد دام ادا کئے جائیں۔ اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے، اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں میں آ پڑے۔ اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان کے اعوان و انصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف و پردہ نشیں خواتین کا پردہ ختم کرانا۔ نیز دوسرے احکامِ دینِ مبین کو مٹانا۔ وغیر ذالک۔

اپنے مکر کی ابتدا اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے

وأَهانِهِم ؞ عن رسومهم وقواعدِهم ؞ ويُضلّوهم عن أَديانهم و عقائدِهم ؞ لزعمِهم أَن الجنودَ من الأَبطال ؞ إذا ارتضَوا الأَديانهم بالإِبدال والإِبطال ؞ وتلقَّوا أَحكامَهم بالقبولِ والامتثال ؞ لايكون لغيرِهم مساغٌ ومجال ؞ للنكول مخافةَ النكال والانكال ؞

فكلّفوا الاهاند منهم وهُم جمٌّ غفير ؞ وجمع كثير ؞ بإذاقةِ شُحومِ البقير ؞ والمسلمين وهم قليل نزير ؞ بإذاقة شحوم الخنازير ؞ فانحرف كل من الفريقين عن الطاعة والانقياد ؞ حفظا لما لهم من الدين و الاعتقاد ؞ فأَخذوا يقتلون فريقهم ؞ ويقطعون طريقهم ؞ ويغتالون كُبرائهم وبِطريقهم ؞ ومنهم مَن اعتدى وأَساء ؞ وارتكب الفظاظة والقساء ؞ فقتل الولدانَ والنساء ؞ فاستحقّ الخَذلانَ والهَوان ؞ من اغتيالِ النسوان ؞ واستوجب الخزيَ والصَّغار ؞ من قتل الصبية الصِّغار ؞

ثمّ انّ كلّا من الجنود المنحرفة قد انتهضوا من معسكرهم و مقامهم ؞ بعد الفَتك بأُمراءهم وحكّامهم ؞ وقد تطرّقَ الوهنُ و الاختلال ؞ في أَعمال العمّال ؞ وتمشّى في أَمنِ الطرائقِ الفسادُ و الفتور ؞ واختلّتِ الأَوامر والأُمور ؞ وهاجَت فتن وجوه من العناد ؞ بين العباد ؞ وشاعَ البواد ؞ في البوادى والبلاد فهي تمور ؞

فأَدى كثير من الجيوش الى دار الملك دهلى التي هي مصر مشهور ؞ وبلد معمور ؞ ومثوىً لجمع كثير من آلِ تيمور ؞

فأَمّروا بها من كان من قبلُ من بينهم رئيسا له عملة وتامور ؞ وهو هِمٌّ عُمُر ؞ قد رُدَّ الى أَرذل العُمُر ؞ وهو في الحقيقة لزوجه

رسوم و اصول سے ہٹانے اور مذہب و عقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے۔ ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکام نصرانیت بجا لانے پر آمادہ ہو جائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا و عقاب کے ڈر سے خود ہی مجال انکار نہ ہو سکے گی۔

انھوں نے ہندو لشکریوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ گائے کی چربی اور مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سُوَر کی چربی چکھانے پر زور ڈالا۔ یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے مذہب و اعتقاد کی حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت و انقیاد سے منھ موڑ لیا۔ ان کے اس اضطراب نے خرمنِ امن پر چنگاری کا کام کیا۔ گروہِ نصاریٰ کا قتل، ڈاکہ زنی ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کر دیا۔ بعض لشکری حد سے تجاوز کر گئے۔ انھوں نے قساوتِ قلبی اور شوریدہ سری کا انتہائی مظاہرہ کیا۔ بچوں اور عورتوں کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بے گناہ عورتوں کی قتل و غارتگری سے رسوائی و ذلّت کے مستحق بن بیٹھے۔ پھر تمام "باغی" گروہِ لشکریاں اپنی چھاونیوں سے، اپنے افسروں سے نبٹنے کے بعد چل کھڑے ہوئے عاملوں اور حاکموں کے نظام درہم برہم ہو گئے۔ راستوں کے امن میں خلل و فتور، مخلوق خدا میں فتنہ و فساد، اور دیہات و بلاد میں شور و شغب پھیل گیا طوفانِ حوادث جوش میں آ گیا۔

بہت سے لشکر شہرِ مشہور، بلدِ معمور، مسکنِ آلِ تیمور، دار السلطنت دہلی جا پہونچے۔ وہاں پہنچ کر ان سب نے ایسے شخص کو سردار و پیشوا بنا لیا۔ جو اس سے پہلے بھی ان کا آمر و حاکم[لہ] تھا۔ جسکے پاس اس کے ارکان دولت اور وزیر بھی تھے لیکن وہ خود ضعیف، غمزدہ اور ناتجربہ کار تھا۔ عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو آمر و حاکم ہونے

[لہ] سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ۔

وتامورِهٖ مامورٍ؛ وكان عاملهُ الّذی کان فی المعنی والیا عالیا؛ للنصاری مُوالیا؛ فی حُبهم غالیا؛ ولمن عَدَاهم لاسیما العِدا هم مُبغِضا قالیا؛ و کذا عشیرته؛ وبعض من عشیرتِه؛ الأقربین من سریرہٖ وسریرتِه؛ یفعلون مایشاؤن؛ ویعملون بآرائهم وفی طاعته یُراؤن؛ وھو إمّرٌ لایعلم أمرا؛ ولایعمل إلا إمرا؛ ولایامر برائه أمرا؛ و لایفقه خیرا ولا شرًّا؛ ولایحکم بشیٔ جهرا وسرا؛ ولایملِک نفعا ولاضرًّا؛

هٰذا وقد اِنتهض من بعضِ القری والبلاد؛ جَمعٌ من المسلمین الجِلاد؛ للجِدال والجِلاد؛ والغزو والجهاد؛ بعد الاِستفسار والاِستشهاد من العلماء الزهّاد؛ وإفتائهم بوجوب الجهاد؛ بفتاوی اَیِمة الاجتهاد؛

وقد اَمّر ذالک الاِمّرُ علی الجیوش بعض من له من الاحفاد والابناء؛ وکانوا من السّفهاء الخَوَن الجُبَناء؛ المتنفّرین من العقلاء الأُمناء؛ لم یشهدوا مُلتحَمة وحَربا؛ ولم یُمارِسوا طَعْنا وضربا؛

اِختاروا المعاشرة والمشاوَرة منُوقَة من اَهلِ السوق؛ فغامروا ولتلک الأغمارُ فی غُمورِ الاِتراف والاِسراف وغمَراتِ الفسوق؛ کانوا فی عسر ثم فَجَروا[1]؛ وإذا فَجِروا[2] فَجَروا[3]؛

---

[1] فجر من المرض، من باب نصر: بریٔ منه ای خلصوا ونجوا من العسر ۱۲ م

[2] فجر من باب سمع: تکرّم ۱۲ م

[3] فجر من باب نصر: رکب المعاصی۔ ای اذا صاروا متکرّمین بکثرة المال، والنجاء من الفقر والعسر ارتکبوا المعاصی ۱۲ محمد احمد المصباحی

کے بجائے اپنی شریک حیات[1] اور وزیر[2] کا مامور و محکوم تھا۔ اس کا یہ وزیر جو حقیقت میں نصاریٰ کا کارپرداز، اور ان کی محبت میں غالی تھا صحیح معنوں میں حاکم و والی اور نصاریٰ کے دشمنوں کا شدید ترین مخالف تھا۔ یہی اس آمر و حاکم کے اہل خاندان کا حال تھا۔ ان میں سے بعض[3] مقرب بارگاہ اور رازدار بھی تھے۔ یہ سب کے سب جو جی چاہتا تھا کرتے تھے۔ اپنی آراء پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ لیکن اس کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ اور وہ سردار ایسا ضعیف الرای ناتجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ کوئی کام اپنی رائے سے نہ کر سکتا تھا۔ نہ اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ نہ کسی کو خفیہ یا علی الاعلان کوئی حکم دے سکتا تھا۔ نہ کسی کو نفع و ضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا۔

یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت[4] علما، زہاد اور ائمۂ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر، جدال و قتال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ادھر اس ناتجربہ کار سردار نے اپنے بعض ناعاقبت اندیش، سفیہہ خائن اور بزدل اولاد[5] کو امیر لشکر بنا دیا۔ یہ لوگ دیانتدار عقلمندوں سے متنفر تھے۔

انھیں نہ تو میدان کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا ہی موقع ہوا تھا۔ انھوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہمنشین و جلیس بنا لیا۔ اس طرح یہ ناآموزدہ کار، آرام طلبی، اسراف بے جا اور فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔

وہ تنگدست ہو چکے تھے پھر مالدار ہو گئے۔ جب مال دار ہو گئے تو عیش پرستیوں

---

[1] ملکہ زینت محل [2] حکیم احسن اللہ خاں [3] شہزادہ مرزا مغل وغیرہ۔ [4] مولوی ابو سعید وغیرہم مستفتی نور جمال مجیب، توثیق کنندگان ۳۳ علماء [5] مرزا مغل و خضر سلطان وغیرہما ۱۲

کانوا یاخذون من الناس بحیلة تزوید الجیوش وتجهیزهم مالًا
جمًّا ؞ ولا ینالون شیئًا منه احدا من الجیش فیاکلون کل ما
یاخذون اکلا لمًّا ؛ شغلهم قواد البغایا ؞ عن قیادة البغایا ؞
واقعدهم القعود مع السراری عن السری مع السرایا ؛ و
الهاهم ملاهیهم فی رخاء العیش ؞ فاخّرتهم عن مقدمة الجیش ؛
وقلّبهم ما فی قلوبهم من الفشل والهم الخسیس ؞ عن الثبات فی
قلب الخمیس ؛ وثبطهم المشأمة عن المیمنه ؞ وعاقهم المیسر والمیسرة
عن المیسره ؛ وکفّهم من معهم من السوقة السوقیه ؞ عن
الانسیاق مع الساقة ؞ وکذلک من یتولی خطبا جلیلا مع عدم
الخلاقة ؞ وحمّل حملا ثقیلا مع عوز الطاقة ؛ یبیتون
نیاما ویظلون سکاری ؞ واذا انتبهوا وصحوا فهم
اغفال حیاری ؞ وقد هجمت علیهم بالجنود النصاری ؛
قد عرجوا وعرّجوا تجاه المصر علی جبل شاهق ؞ و
حصّنوه وحفروا حوله خنادق ؞ ونصبوا
علیه مجانق ؞ یرمون بها نحو البلد والسور
والمساکن والدور بنادق ؞ کانها شهب
وصواعق ؛

والجنود المنحرفه ؞ اشتات مختلفه ؛ صاروا
طرائق قددا ؞ بعضهم لا یطیع احدا ؞ و
البعض لا یجدون ملتحدا ؛ منهم من فنت
لفترة طاقته ؞ واقعدته عن القیام للحرب
فاقته ؛ ومنهم من عوقه عن المبارزة ما نهث
ومنهم من هرب ؞ وقلبه رهب ؛

میں پڑ گئے۔ لوگوں سے لشکروں کے ساز و سامان کے بہلنے سے کافی مقدار میں مال جمع کرتے تھے۔ اور اس میں سے ایک حبّہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے تھے۔ جو کچھ وصول کرتے تھے خود کھا جاتے تھے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن ان کو تو زنانِ فاحشہ و تباہ کار نے طلایہ کی قیادت، اور کنیزوں کی شب باشی نے لشکروں کے ساتھ رات کو چلنے سے روک دیا۔ اور آلاتِ عیش و طرب نے آرام طلبی میں ڈال کر مقدمۃ الجیش سے بھی پیچھے کر دیا ان کے دلوں میں نامردی اور ذلیل اندیشہ بیٹھ گیا۔ اسی نے ان کو وسطِ لشکر میں ثابت قدمی سے روکا۔ اور شومیٔ قسمت نے میمنہ سے اور قمار و تونگری نے میسرہ سے باز رکھا۔ ان کے خوشامدی اور بازاری ہم صحبتوں نے ساقہ (پچھلا دستہ) سے بھی علیحدہ رکھا۔

ایسا ہی ہوا کرتا ہے جب کسی نا اہل کو کوئی بڑا کام سپرد کیا جاتا ہے۔ اور کمزور پر بھاری بوجھ لادا جاتا ہے۔ وہ رات سو کر اور دن بدمست ہو کر گذارتے۔ جب بیدار و ہشیار ہوتے تو غافل و حیران پھرتے۔ نوبت بایں جا رسید کہ نصاریٰ کا لشکر اُن پر آ کر ٹوٹ پڑا۔

ایک بلند پہاڑی[لہ] پر چڑھ کر شہر کا رخ کر دیا۔ شہر کا محاصرہ کر کے خندقیں کھود ڈالیں۔ پہاڑی پر توپیں اور منجنیقیں نصب کر کے شہر پناہ اور مکانات پر گولہ باری شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بجلیاں اور تارے ٹوٹ ٹوٹ کر عمارتوں پر گر رہے ہیں۔

ہندوستانیوں کا برسرِ پیکار اور ”باغی“ لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا۔ بعض گروہ کا کوئی جنرل ہی نہ تھا۔ بعض کو جائے پناہ بھی میسر نہ تھی۔ بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔ کچھ تھوڑا سا مالِ غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ کچھ ترساں و لرزاں قلب کے

[لہ] پہاڑی دھیرج ۱۲

ومنهم من طغى وبغى ؛ وابتغى له من البغايا ما ابتغى ؛ ومنهم من يستنكف بلبس الشفوف ؛ عن الدخول في الصفوف ؛ ومنهم من كان يجالد ويحادب ؛ ويحاوب النصارى ويضارب ؛

والنصارى بعد ما وهنوا واستكانوا ؛ استمدوا في الحرب هنالک الغرب واستعانوا ؛ فامدوهم بكثير من العدد والعُدد ؛ واعانوهم بمدد بعد مدد ؛ في اقصر المُدد ؛ فجمع النصارى علىٰ ذالک الجبل للحرب العوان ؛ كثيرا من الجنود والاعوان ؛ فمن جنودهم اشياعهم البيضان ؛ ومنهم اُجرائهم من اراذل الهنادک الخمّان ؛ والمسلمين الذين ارتدّوا بولاء النصارى بعد الايمان ؛ وباعوا دينهم بخُس من الاثمان ؛

وقد ائتلف بالنصارى من سكّان البلد الاف ائتلافا ؛ فالهنادک كلهم معهم واما المسلمون فقد اختلفوا اختلافا ؛ فبعضهم للنصارى قالون ؛ وبعضهم لهم موالون ؛ وفي حبهم غالون ؛ ويجدون لكسر الجنود المنحرفة بالحِيَل والمكائد جدّا ؛ ويجهدون في فلّ شوكة المجاهدين وقلعهم وقمعهم وتبديد شملهم وتفريق جمعهم ولا يالون في هٰذا كلّه جهدا ؛ فطفق النصارى يحملون على البلد وابوابه ؛ ويسطون على درابنته وحجّابه ؛ والمجاهدون الشهود ؛ وفريق من الجنود ؛ يعوّقونهم عن البلد ويصالون ؛ ويحولون بينهم وبين ما يحاولون ؛ يتجالد الفريقان ليلا ونهارا ركبانا ورجالا

ساتھ بھاگ چھوٹے تھے۔ بعض طغیان و سرکشی سے بدکار عورتوں پر قبضہ جما بیٹھے، بعض نے میدان جہاد کے تنگ و سخت فوجی کپڑے پہن کر صفوفِ جنگ میں داخل ہونے کو برا جانا۔ صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے اور پست ہو گئے تو غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز و سامانِ حرب سے تھوڑی سی مدت میں پے در پے مدد کی تب نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان دی۔ اور اس پہاڑی پر بہت سا لشکر اور مددگار و معاون جمع کر لیے۔ ان کے لشکریوں میں گورے مخنث کے گروہ بھی تھے۔ اور ذلیل ترین ہندو اجیر بھی۔ اور وہ بدبخت و بدکیش مسلمان بھی جو ایمان کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد ہو کر اپنے دین کو چند ٹکوں کے بالعوض بیچ چکے تھے۔

ہزاروں شہری بھی نصاریٰ کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ اور تمام ہندو ان کے ساتھی ہو گئے، مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ تو ان (غیر ملکیوں) کا جانی دشمن تھا۔ دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس نے ہندوستانی لشکر کی بربادی، مجاہدین کی شوکت و وقار کی خواری اور ان کے قلع و قمع کرنے میں مکر و حیلہ سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ان کے اندر افتراق و انشقاق پھیلانا، ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

پھر تو نصاریٰ شہر اور اس کے پھاٹکوں دربانوں اور محافظوں پر حملہ کرنے لگے۔ ادھر جماعت مجاہدین اور لشکریوں کے ایک بہادر گروہ نے ان کے حملوں کو روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل ہونا اپنے لیے اہم ترین فرض قرار دیا۔ دن رات پیدل اور سوار دادِ شجاعت دینے لگے۔

وكانت الحرب بينهما اربعة اشهر سجالًا ؛ ولم يجد العدى فى تلك المدة ؛ مع غاية الشدّة وكثرة العدّة والعدة الى دخول البلد سبيلا ومجالا ؛ بل كلما هجموا صُدّوا ؛ ومهما اقدموا ردّوا ؛ كان المجاهدون الغزاة الحماة الكماة يدافعونهما اشدّ دفاع ؛ ويقارعونهم اسد قراع ؛ يثبّتون عند الالتحام الاقدام ؛ ويتقدمون على كل مقدام ؛ لدى الاقدام ؛ فذاق كثير منهم شهد الشهادة ؛ وسعدوا وصعدوا معارج السعادة ؛ "وللذين احسنوا الحسنٰى وزيادة" ؛ ومابقى من المجاهدين الا قليل يبيتون جياعا ؛ ويصبحون الى الغزو سراعا ؛ فيقارعون العدو قراعا ؛ فكانوا مع جمع من الجيش يحفظون السور ؛ ويسدّون الثغور ؛ حتى اقعدت بلية ثلّة من الجيش قد تعوّدوا بالدعة والكسل ؛ وجبلوا على الجُبُن والفشَل ؛ فى مرصد محاذ للجبل ؛ فوضعوا اسلحتهم وباتوا نياما ؛ فبيتهم العدوّ واخذوا اسلحتهم واخترموهم اختراما ؛ وانامو اولئك النيام فما استطاعوا قياما ؛

فلما استولى النصارى على ذلك المرصد ودخلوا فيه ؛ نصبوا مجانق كثيرة لهدّ سور يليه ؛ وهدم برج كان فى حواليه ؛ وفتح باب يحاذيه ؛ وامطروا بنادق ثقالا كبارا ؛ فى كل آن ليلا ونهارا ؛ فحدثت الفطور والكسور ؛ فى حائط السور ؛ وبدا الفروج ؛ فى الجدر والبروج ؛ وتضعضع الباب ؛ وتقطع الاسباب ؛ وارتفع الحجاب ؛ ولم يستطع احد من الجيوش هناك قياما وقعودا ؛

چار[1] مہینے تک متواتر جنگ ہوتی رہی۔ دشمن اس مدت میں کثیر لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ جب بھی حملہ کرتے تھے روکے جاتے تھے۔ جس وقت اقدام کرتے تھے لوٹائے جاتے تھے۔ بہادر اور نگہبان غازی بڑے زور شور سے یلغار کو روک رہے تھے۔ مدافعت و مبارزت میں خوب خوب جوہر دکھا رہے تھے۔ مقابلے میں ثابت قدم تھے اور ہر پیش قدمی کرنے والے پر آگے بڑھ کر حملہ آور تھے۔ ان میں سے بہت سے جام شہادت پی کر سعادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔

"نیکو کاروں کے لئے بہشت، حوریں اور اس سے بڑھ چڑھ کر بھی نعمتیں ہیں۔ اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت باقی رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کر کے رات گذارتی اور صبح ہوتے ہی دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ کر نبرد آزما ہوتی لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہی شہر پناہ کی حفاظت، اور شہری سرحدات کی نگہداشت کرتی۔ بدقسمتی سے ایک شب کو پہاڑی کی محاذی کمین گاہ پر ایک عیش پرست، بزدل اور کسل مند جماعت مقرر کر دی گئی۔ وہ اپنے ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سو گئی۔ دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر شبخون مارا۔ اور ہتھیاروں پر قبضہ کر کے اسے قیامت تک کے لئے ابدی نیند سلا دیا۔

جب نصاریٰ نے اس کمین گاہ پر قبضہ کر لیا تو بہت سی توپیں اور منجنیقیں نزدیک ترین شہر پناہ اور قریب ترین برج پران کے گرانے اور محاذی پھاٹک کھولنے کے لئے لگا دیں۔ اور دن رات گوپھنوں اور بندوقوں سے گولیوں کا مینہ برسانا شروع کر دیا جس سے شہر پناہ کی دیوار اور برجوں میں شگاف پڑ گئے۔ پھاٹک گر پڑا۔ اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ حائل پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ کوئی لشکری اٹھنے بیٹھنے

---

[1] مئی ۱۸۵۷ء سے دسمبر ۱۸۵۷ء تک ۱۲

ولا اطلوعا على ذلك السور وصعودا ؛ فكل من طلع رمى ببندق ؞ وتردّى في خندق ؛

وبعد ذلك خادَع النصارى واحتالوا ؞ ووجّهوا فريقا من جنودهم تِلقاءَ باب آخر ليخيّل أنّهم على ذلك الباب الآخر صائلوا ؛ فاشتغل الغُزاةُ وفريقٌ من الجيش بِقراعهم ودفاعهم ؞ وغفلوا عن كيد النصارى وخِداعهم ؛ فدخل البلدَ فريقٌ من النصارى وجنودهم من بابٍ أَوْهَنُوه ؞ وسورٍ هدَمُوه ؞ وبرجٍ هدّوه ؛ ولم يجدوا هنالك مزاحما ومقاوما ؞ ولا مدافعا وممانعا ؞ ولا معاوقا ومنازعا ؛ فجاسوا خلالَ الديار ؞ ديار الذين كانوا من قبلُ النصارَ الانصار ؛ وضربوا عليهم لوقايتهم من الدور لسور ؞ وعجّلوا الهُمْ ما اَعتدوا لهم من القِرى والسور ؛ واَشبعوهم باللحوم والاكبان ؞ وقضَوا ما كان لهم من الاَوطار واللُّبان ؞ وفتحوا رَوازن في الجدران والحيطان ؛ وغلّقوا الابواب ؞ ليتمكنوا من رَمْيِ البندق ويحترِسوا ممن ينحو نحوهم للحِراب ؛ فكلمّا برز لهم احد ؞ من الجيش او اهلِ البلد ؛ رموه ببندق يصرعه قتيلا ؞ ولا يجد المبارز الى ضربهم سبيلا ؞ وكانوا ينتهِزون فرصة للخروج الى دور أُخَر ليتخذوها كذلك أَوليائهم مبيتا ومقيلا ؞

لكنّهم كلّما برزوا ، ملعونين اينما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتيلا ؞

فكانوا لا يبرزون حيث يستشعرون مقاتلا ومقابلا الا قليلا ؛ ومع ذلك كان ياتيهم من الجبل مدد مُتوال ؞ يؤديه كل هنديٍّ للنصارى مُوال ؞

کی وہاں قدرت نہ رکھتا تھا۔ نہ دیوار پر چڑھ کر جھانک سکتا تھا۔ جو جھانکتا تھا گولی کا نشانہ بن کر خندق میں جا پڑتا تھا۔

اب نصاریٰ نے یہ چال چلی کہ ایک لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا۔ تاکہ دوسری طرف سے حملہ محسوس کیا جائے۔ یہ دیکھ کر مجاہدین، اور لشکریوں کا گروہ ادھر متوجہ ہو گیا۔ اور دشمن کا مکر نہ سمجھتے ہوئے وہاں مدافعت میں مشغول ہو گیا۔ یہ موقع پا کر نصاریٰ اور ان کا لشکر، اسی گرے ہوئے پھاٹک، ٹوٹی ہوئی دیوار اور منہدم برج سے داخلِ شہر ہو گئے۔ وہاں انھیں کوئی مزاحم و مدافع نہیں ملا۔

پس وہ تلاش کر کے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچ گئے۔ جو پہلے ہی سے ان کے معاون و مددگار بن چکے تھے۔ انھوں نے فوراً ان کی حفاظت کا گھروں میں انتظام کیا۔ اور جلد جلد پہلے سے تیار شدہ ضیافت سے نوازا۔ انھیں خوب پیٹ بھر کر گوشت اور دودھ کھلایا پلایا اور تمام ضرورت کی چیزیں مہیا کیں۔

مکانوں کے دروازے بند کر کے دیواروں میں روزن کر دیئے تاکہ جو "باغی" ادھر آ نکلے اس پر گولی چلا کر اپنی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ جو لشکری یا شہری ادھر آ نکلتا یہ بندوق چلا کر مار ڈالتے۔ اور مقابل کا ان پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔

وہ فرصت کے منتظر رہتے تھے کہ موقع پا کر اپنے دوستوں کے گھروں کی طرح دوسرے گھروں میں بھی پہونچ کر انھیں شب و روز کی آرام گاہ بنائیں لیکن وہ لعنتی جب بھی نکلتے پکڑ کر قتل کر دیئے جاتے۔ اس لیے جہاں انھیں مقابلہ کا اندیشہ ہوتا وہاں بہت کم نکلتے۔ اس کے باوجود انھیں پہاڑی سے، مسلسل مدد پہنچ رہی تھی۔ اور ہر عیسائی دوست ہندوان کی مدد میں پیش پیش تھا۔

ثمّ انّه لم یبق فی البلد من وأَل ولا وال ؛ اذ خرج الملک مع من له من آل وعیال ؛ الی مقبرة هی من البلد ثلثة امیال ؛ وکان مطیعا لزوجته وعاملا لخوَان ؛ مغترا بما کان یختلقه من الکذب والبهتان ؛ ویسوّل له ان النصاری بعد تسلطهم یتبعونه باحسان ؛ ویمکّنونه فی الملک بِأُبَّهة وسلطان ؛ فکان مغرورا مسرورا بما یمنّیه ویعِده الشیطان ؛ وخرج مع الملک من له من الامراء والأُجراء مستصحبین اهالهم وعِیالهم ؛ تارکین فی دورهم وبیوتهم اللاتی خلّوها امتعتهم واموالهم ؛ وبخروجهم من البلد استولی الرعب علی کثیر من سکانه ؛ فخرج کلّ من اولاء من مکانه ؛ فلمّا خلت الدیار من اهلیها ، دخلت النصاری وجنودهم فیها ؛ فنالوا علی ما وجدوا فیها من الوجد والمال ؛ واغتالوا من بقی فی دار من النسوان والاطفال ؛ والضعفاء من الرجال ؛ فلم یبق من اهل البلد ؛ لمجادلتهم ومجالدتهم احد من اهل الجلد ؛

واما الجیوش المنحرفه فمنهم من فرّ قبل اتیان النصاری فرارا ؛ ومنهم من لم یستطع بعده ثباتا وقرارا ؛ ومنهم من قاتلهم فی البلد مِرارا ؛ فدبّر البله الون ؛ وهنالک آخرون ؛ هم للنصاری مُوالون ؛ وعُمّالُ الملکِ الاولی هم للمقاتلین قالون ؛ تدبیرا یتبّرهم تتبیرا ؛ فقتّروا علیهم الاقوات تقتیرا ؛ فواروا ما کان فی البلد من الحبوب والغَلّات ؛ وسدّوا ما کان یجبی ویُجلب الیهم من القُری والقصبات ؛

بڑی مصیبت یہ آپڑی تھی کہ شہر میں نہ کوئی جائے پناہ رہی تھی۔ اور نہ حاکم ہی رہا تھا کیونکہ حاکم (بادشاہ) اپنے اہل وعیال کو لے کر شہر سے تین میل دور مقبرہ[1] میں جا چکا تھا۔ وہ دراصل اپنی بیگم اور خائن وزیر کا مطیع تھا۔ جس نے کذب وبہتان سے کام لے کر دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر بادشاہ کو پھسلایا تھا کہ نصاریٰ قابض ہونے کے بعد اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ اور اسی کو بزرگی وسرداری بخش دیں گے۔ وہ فریب خوردہ ان شیطانی وعدوں اور ابلیسی آرزوؤں پر خوش تھا۔

بادشاہ کے ساتھ اس کے تمام امراء ومتعلقین بھی اپنے اہل وعیال کو لے کر گھروں میں مال ومتاع چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان سب کے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے شہریوں پر سراسیمگی اور رعب طاری ہو جانا قدرتی امر تھا۔ مرعوب ومتاثر لوگ بھی مکان چھوڑ بھاگے۔

جب شہر کے مکان مکینوں سے خالی ہو گئے تو نصاریٰ اور ان کا لشکر ان میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے مال ومتاع لوٹنا، باقیماندہ ضعیفوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ بہادرانِ شہر میں سے ایک بھی ایسا نہ بچا تھا جو ان کا کسی اعتبار سے مقابلہ کر سکتا۔

"باغی" لشکروں میں سے بعض تو نصاریٰ کے قبضہ سے پہلے ہی بھاگ گئے۔ بعض قبضہ کے بعد ثابت قدم نہ رہ سکے۔ بعض کئی بار شہر میں معروف کارزار رہ کر بے دم ہو چکے تھے۔ اب بنیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے اور بادشاہ کے ان کارپردازوں[2] نے جو مجاہد گروہ کے دشمن تھے ایسی تدبیر سوچی جس سے شہریوں اور لشکریوں کو ہلاک کر سکیں۔ انھوں نے وہ سب غلہ جو بنیوں کے پاس تھا چھپا دیا اور دیہات وقصبات سے جو ان کے پاس اناج آتا رہتا تھا۔ وہ روک دیا۔

---

[1] مقبرہ ہمایوں ۱۲ [2] مرزا الٰہی بخش وغیرہ ۱۲

U-110476

حتّٰی ظلوا وباتوا جیاعا؛ والتاحوا التیاحا؛ والتاعوا التیاعا؛ فاضطرّوا اشدَّ اضطرار؛ وفرّوا اشنعَ فرار؛ فاستولی النصاری علی البلد وابوابه وسورِه؛ وقلعتِه واسواقه وابیاته ودُورِه؛ واذ کان فی دهلی؛ کثیر من عیالی و اهلی؛ ومع ذلک کنت مَدعُوّا؛ وکان الافلاح والافلاج مرجوا؛ والفرج والفرحُ مظنونا؛ وما قدّر فی الغیب مکتوبا مکنونا؛ توجّهت تلقاءَ دهلی؛ مما کان محلّی؛ فالقیت بها رَحلی؛ ولاقیت بها اَهلی؛ واَشرتُ الی الناس بما اقتضیٰ رائی وقضیٰ به عَقلی؛ فلم یأتمِروا بما اشرت؛ ولم یاتمِروا بما اَمرت؛

فلمّا استولی النصاری علی البلد؛ ولم یبق فیه من الجیوش ومن سکّانه احد؛ وغاذَتُ فیه الاقوات؛ ولم یتیسّر لنا الماء الفُرات؛ اذ قد استبدّ به العُداة؛ مکثت فیه خمسة ایام و لیالی؛ ثم خرجت مع اهلی وعیالی؛ بعد ترک مالی؛ من کتبی ونَشَبی و مالی؛ لنحوَ زما یکفی لنقل احمالی؛ واخذت للنجاء سبیلا؛ متوکلا علی الله وکفی بالله وکیلا؛

والنصاری بعد استیلاءهم علی البلد وسَواده؛ بسَواد بیضانهم عمَدوا الی اخذ الملک واولاده واحفاده؛ وهم لم یبرحوا مستقرهم؛ والقضاءُ مکّنهم فی ذلک المکان و اَقرّهم؛ وهم مستوثقون بمن غرّهم؛ باکاذیبه وسرّهم؛ وکان فی تلک المقبرة مغرورا مسرورا، محشودا محفودا؛ فاضحیٰ ماسورا، محسورا مکمودا مصفودا؛ واخذوا من معه من الابناء

یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ لشکری اور شہری، بھوک، پیاس، سوزش اور بےچینی سے دن رات گذارنے لگے۔ بالآخر مجبور و پریشان ہو کر بھاگ چھوٹے۔ پھر تو نصاریٰ نے شہر کے پھاٹک، شہر پناہ، قلعہ، بازار اور مکانوں پر مکمل قبضہ جمالیا

اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل و عیال[1] موجود تھے۔ اور مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح و کامیابی، کشائش و شادمانی، کی امید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا۔ میں نے دہلی کا رخ کر دیا وہاں پہنچ کر اہل و عیال سے ملا۔ اپنی عقل و فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن نہ انھوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔

جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح تسلّط ہو گیا اور کوئی لشکری و شہری باقی نہ رہا۔ غلہ اور پانی دشمنوں کے ظلم و استبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا تو پانچ شبانہ روز اسی حالت میں گذار کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں مال و اسباب چھوڑ کر (باربرداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔

شہر اور اس کے مال و دولت پر سفید رو لشکریوں کے ذریعہ، قابض ہو کر نصاریٰ کی تمام تر توجہ، بادشاہ اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے پکڑنے کی طرف مبذول ہوئی۔

ان سب نے اپنا مستقر (مقبرہ) اب تک نہ چھوڑا تھا۔ تقدیر الٰہی نے وہیں برقرار رکھا تھا۔ انھیں اپنے جھوٹے اور مکار وزیر کی کذب بیانی پر اعتماد تھا۔ وہ اس مقبرہ میں بڑے خوش اور مگن تھے۔ مخدوم بنے ہوئے دن گذار رہے تھے۔

اس فریب خوردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت کشیدہ، دل تپیدہ بیٹوں

---

[1] مولوی شمس الحق اور ان کی والدہ وغیرہ ۱۲

والاحفاد ∴ مُقرنین فی الاصفاد ؛ وذهبوا به الی البلد ∴ مع من معه من الاهل والولد ؛ فاغتال احد من عظمائهم هو طرخان[1] او بِطرِیق ∴ اَبنائَه واحفادَه بالبندق فی اثناء الطریق ؛ واَهدَوا رؤسَهم مقطوعةً الی رئیسهم فی خوان موضوعة ∴ وترکوا جُثَثَهم منبوذة ∴ ثم نبذوا تلك الرؤسَ مجذوذة ؛ وحبسوه فی بیت من سمّ الخیاط اضیق ∴ فی حرس ابیض اسود الکبد اصهب الشعر ازرَق ؛ ثم نفوه من ممالكَ واسعة ∴ الی بعض جزائرَ شاسعة ؛ مع زوجه التی کانت[2] لهم و کانت لهم موالیة ∴ اذ کانت فی الحقیقة ملکة والیة ؛ وقد خابت فی ما طمعت ∴ وسلبت اموالاً قد جمعت ؛ وقد شِینت ∴ بعد ما کانت زینت وابتذلت بعد ما صِینت ؛ وقتّلوا مَن وجدوا مِن قومه بالضرب والخنق ∴ کما خنقوا وقتلوا ممن عداهم کثیرا من الخلق ؛ ولم ینج من هؤلاء الضعفاء الا مَن فرّ مستخفیا متواریا ∴ بالليل ساریا ؛ اومن جدّ مسرعا هاربا ∴ بالنهار ساربا ؛ وقلیل ما هم

ثم النصاریٰ قتلوا مَن کان فی نواحی المصر وتلك الارجاء ∴ مِن الاراکین والرؤساء ؛ وغصبوا ارضَهم وعَقارَهم ∴ ومساکنهم و دیارَهم ؛ وامتعَتَهم واموالَهم ∴ واسلحتهم واثقالَهم ∴ و افراسهم وافیالهم ∴ وجمالهم وجبالهم ∴ فاهلکوهم واهالیهم ؛ وعیالهم جمعا ∴ مع انهم کانوا رعایا لهم وتبعا ∴ یطیعونهم خوفا وطمعاً ثم انهم حشروا جنودَهم بکل سبیل ∴ لیاخذوا مَن فرّ بالاخذ الوبیل ∴ فاَخذوا کثیرا من الهاربین وما نجا منهم الا قلیل ؛

---

[1] طرخان اس پیشوا کو کہتے ہیں جس کے تحت پانچ ہزار آدمی ہوں۔ اور بطریق وہ ہوتا ہے جس کے ماتحت دس ہزار ہوں ۱۲

[2] ای خضعت لهم من کان له یعنی خضع له ۱۲

اور پوتوں کے ساتھ پابہ زنجیر شہر کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں ان بیٹوں اور پوتوں کو کسی سردار[1] نے بندوق کا نشانہ بنایا۔ دھڑ وہیں پھینک کر، سروں کو خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے تحفۃً پیش کیا۔ پھر ان سروں کو بھی کچل کر پھینک دیا۔

بادشاہ کو، گورے منھ، سیاہ دل، گندمی بال اور کنجی آنکھ والوں کی حراست میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ کوٹھری میں مقید کر دیا۔ پھر اس وسیع ملک سے نکال کر دور دراز جزیرہ[2] میں پہنچا دیا۔

بادشاہ کے ساتھ اس بیگم کو بھی روانہ کیا گیا جو نصاریٰ کی اس وقت بھی مطیع و دوست تھی جب کہ وہ حقیقت میں ملکہ تھی وہ اپنی آرزوؤں، (بیٹے کو جانشیں بنانے) میں ناکام رہی۔ اس کا جمع کردہ مال بھی چھین لیا گیا وہ زینت[3] بننے کے بعد بدصورت اور حفاظت کے بعد بدہیئت بنی۔ بادشاہ کی قوم میں سے جو بھی ملتا اس کی گردن ماردی جاتی۔ یا پھانسی دی جاتی جیسا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی عمل کیا گیا۔ ان کمزوروں میں سے وہی بچ سکا جو رات میں چھپ کر یا دن میں نظریں بچا کر تیزی سے بھاگ گیا۔ اور ایسے خوش نصیب بہت کم تھے۔

پھر نصاریٰ نے شہر کے گرد و نواح کے رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا ان کی جائداد، عمارتیں، مویشی، مال و متاع، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور ہتھیاروں وغیرہ کو لوٹنا شروع کیا۔ اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اہل و عیال کو بھی قتل کر ڈالا۔ حالانکہ یہ سب رعایا بن چکے تھے۔ اور ڈر یا لالچ سے فرمانبردار بن ہی جاتے۔ انھوں نے تمام راستوں پر چوکیاں بٹھا دیں تاکہ بھاگنے والوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جائے۔ ہزاروں بھاگنے والوں میں تھوڑے ہی بچ پائے باقی سب پکڑے گئے۔

---

[3] زینت محل اس ملکہ کا نام تھا ۱۲

[1] مسٹر ہڈسن نے مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہما کو گولی کا نشانہ بنایا تھا [2] رنگون۔

فنَهَبوا اوّلا ما كان مع الماخوذِين من النقدَين ؛ الذهب واللُّجين ؛ بل الجلابيب والسرابيل ؛ والمآزر والسراويل ؛ ثم بلغوهم عظماءهم فقضَوا عليهم بالخنق والتقتيل ؛ ولم يذَرِ الفتكُ شبّانا ولا ضِعافا ؛ ولا اَشرافا ولا اَجلافا ؛ فبلغ القتلى والخنقى آلافا ؛ وجُلّ مَنِ ابتُلی بظلم الظلّام ؛ اَهل الایمان والاسلام ؛ واَمّا الاَهانِد فقد سلموا الّا من ظنّ به اَنه ممن يعانِد ؛ ولم يسلَم من المسلمين الّا مَن خرج مِن بيته مهاجرا ؛ او مَن كان للنصاری ناصرا ؛ وفی دِینه قاصرا ؛ ومَن كان لهم جاسوسا ؛ ومِن رحمة الرحمٰن الرحيم يَئوسا ؛ كعامل الملِك الذی يتولّاهم ؛ بل سلّطهم وولّاهم ؛ لكنّه تعنّیٰ ؛ اذ حُرم ما تمنّیٰ ؛ وبقی حَسران ؛ فی الخسران ؛ قد حال حاله وبطلَ محالُه ؛ وبث كاَنه دهِين مَّهين ؛ فی ذل مُّهين ؛ خسِر الدنيا والاخرة ذلك هو الخسران المبين ؛

ثم النصاری اَرسلوا الی رُؤساء الهنادك الذين هم يملِكون من الاراضی اَقطاعا ؛ وكانوا لهم اَتباعا ؛ ليأخذوا مَن دخلَ ديارهم فارّا ؛ او وُجد فی ارضهم مارّا ؛ فاخذوا هؤلاء جمًّا كثيرا من الغرَباء، واَسَرُوهم واَسَرُوهم اُساریٰ ؛ الی عظَماء النصاریٰ ؛ فقتلوهم جميعا ؛ ولم يذَروا رفيعا ولا وضيعا ؛ ثم حشروا ونشروا اَشياعهم واَتباعهم فی اقطار الملك ؛ واَجدّ وانی اخذ النّاس وابتلائُهم بالرَّدیٰ والهُلك ؛

واذ خرجت الخواتين والمحصنات من النساء ؛ فی هذه الداهية الدهياء ؛ وعجزن وفيهنّ عجائز وعجازی عن الفرار للاِعياء ؛ فمنهن من هلكت من غلَـ[illegible]ـت ؛

ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے۔ پھر چادر تہبند، قمیص، پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے۔ اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے۔ وہ ان کے لئے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے۔ جوان، بوڑھا، شریف اور رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا! اس طرح پھانسی پانے والوں اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزارہا تک پہنچ گئی۔ ظالموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔

ہندوؤں میں سے صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا یقین تھا۔ اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب میں قاصر تھے۔ یا وہ جو ان کے جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے۔ انھیں میں سے بادشاہ کا وہ عامل[1] بھی تھا جس نے نصاریٰ کو مسلط کر کے حاکم بنایا تھا۔ لیکن اسے امیدوں کی محرومی اور ناکامی کی حسرت کا غم اٹھانا پڑا۔ اس کا حال متغیر ہو گیا۔ زمانے میں ذلیل و خوار ہو کر جیا۔ دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان میں رہا۔ اور یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔

ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندو رؤسا کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمہارے علاقہ میں سے گذرے اسے پکڑ لیا جائے۔ ان بد اطواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔ ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا۔ نہ کوئی عالی خاندان فرد بچ سکا۔ نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔ پھر اطراف و اکنافِ ملک میں لشکر بھیجے جنھوں نے قتل و غارتگری کی انتہا کر دی۔

اس ابتلاء عظیم میں پردہ نشین خواتین پیدل نکل کھڑی ہوئیں۔ ان میں بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں۔ جو تھک کر عاجز ہو گئیں۔ بہت سی خوف کی

---

[1] حکیم احسن اللہ خاں۔

و منهنّ مَن اَهلكتُ نفسَها بالغرَق ؞ صَونا لعِرضها وحرمتها ؞ وحفظا لعفّتها وعصمتها ؞ واكثرهنّ صِرن سَبايا ؞ وابتُلين برزايا ؞ واُصبن ببلايا ؞ فمنهنّ مَن استرقّها بعض الخمّان ؞ و منهن مَن بيعت ببخسِ الاَثمان ؞ وكثير منهنّ هلكنَ عطَشا وجوعا ؞ وكثير منهنّ غِبنَ ولم يستطِعن رجوعا ؞ ولم يُرَ لهنّ اثر ؞ ولم يُسمع عنهنّ خبر ؞ وجُلّ النساء ؞ اُتُين من الاولياء ؞ والبعولةِ والآباء ؞ و الاخوة والابناء ؞ اذ كان كلّ يوم من هذا الزمن الكريه ؞ يومَ يفرّ المرءُ من اخيه ؞ وامه وابيه ؞ وصاحبته وبنيه ؞ وفصيلته التى تؤيه ؞ فكم من نِسوة اَمسين اَيامىٰ ؞ وَالِدةٍ اَصبحوا يتامىٰ ؞ وكم من ثكلىٰ تبكى وتنوح ؞ وكم مِن ثكلانَ تعبر عبَراتُه عن حزنه وبِسِرّه يبوح ؞ وقد صار البلد قاعا صفصفا ؞ و قفرا سبسبا ؞ واَهلوه تفرقوا وتمزّقوا و ذهبوا اَيدى سبا ؞

ثم توجهتِ النصارىٰ الىٰ جانب الشرق وما فيه من القرىٰ والبلاد ؞ فاكثروا فيها الفساد ؞ وعمّمُوا فيها القتل بالضرب والخنق بين العباد ؞ فحضرتِ الآجال ؞ كثيرا من الرجال ؞ و ربّات الحجال ؞ واخترمتِ المنايا ؞ جمّا غفيرا من البرايا ؞ واصيب بالمنا والحتوف مئات والوف، من الرعايا ؞

واما انا وقد كنت انحو نحوَ ناحية الوطن المالوف ؞ والسبيلُ مَخُوف ؞ وعابره مَؤُوف ؞ وبيني وبين وطنى اقطار ؞ فيها مخاوف واَخطار ؞ والنصارىٰ وجنودهم متجسّسون ؞ ومن المارّة متحسّسون ؞ وقد اَمروا الزط وقبيلهم وفريقَهم ؞ بأن يقتلوا المارّة ويُرهبوهم ويَنهبوهم ويقطعوا سبيلهم وطريقهم ؞

وجہ سے جان دے بیٹھیں۔ اور پچاسیوں عفت وعصمت کی بنا پر ڈوب کر مر گئیں۔ اکثر پکڑ کر قیدی بنالی گئیں۔ اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئیں۔ کچھ کو بعض رذیلوں نے لونڈیاں بنالیا۔ اور بعض چند ٹکوں کے بالعوض بیچ ڈالی گئیں۔ بہت سی بھوک، پیاس کی تاب نہ لا کر مر گئیں۔ بہت سی ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نہ تو لوٹ کر ہی آئیں۔ نہ ان کا کچھ پتہ ہی چل سکا۔

ہزاروں عورتیں، اپنے سرپرستوں، شوہروں، باپوں، بیٹوں، اور بھائیوں سے جدا کر دی گئیں، جب کہ وہ ایسی مصیبت کا زمانہ تھا۔ جو قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کہ اس دن انسان اپنے بھائی ماں باپ بیوی، اولاد، اور اہل خاندان سے بھاگتا نظر آئے گا۔ بہت سی صبح کی سہاگن عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں۔ اور شب کو آغوشِ پدر میں سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر اٹھے۔ کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں۔ اور کتنے مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ شہر چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل بن گیا تھا۔ اور شہری تباہ وبرباد ومنتشر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی شہروں اور دیہات کی طرف مبذول ہوئی۔ وہاں بھی بڑا فساد مچایا۔ قتل، غارتگری اور پھانسی کا بازار گرم کر دیا۔ بے شمار مرد اور پردہ نشیں مستورات موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور سینکڑوں، ہزاروں رعایا کے آدمی مار ڈالے گئے۔

میرا کیا پوچھنا، میں اپنے وطنِ مالوف (خیر آباد) کی طرف چلا جا رہا تھا۔ راستہ خوفناک اور رہگذار اندوہناک تھا۔ میرے اور وطن کے درمیان کئی خوف وخطرہ سے بھری ہوئی منزلیں تھیں۔ نصاریٰ اور ان کا لشکر، دن رات تلاش وتجسس میں سرگرداں رہتا۔ جاٹوں کو مسافروں کے مار ڈالنے، لوٹنے، ڈاکہ ڈالنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔

ولم یخلّوا سبیلا لعابر ؞ لم یذروا فلکا فی فلک فی معبر من
المعابر ؞ اخذوا السفائن وخرّقوها ؞ بل حرّقوها او عابوها
واَغرقوها ؞ وحجروا علی الملّاحین ؞ لئلّا یتیسّر العبور للسیاحین
والسبّاحین ؞ فی وقت وحین ؞ فقد نجّانی ومن معی مالکُ الملک ؞
من کل بلیّة وهُلک ؞ وجاوزنی وبهم بحارا وانهارا بلا جسر و
فُلک ؞ وحفِظَنا جمیعا من آفات تلک المسافات، ومهالکِ تلک
المسالک، وطوارقِ تلک الطرائق، وقوارع تلک الشوارع ؞ وبلغنا
بوقایته الکافیه ؞ وحمایته الوافیه ؞ ونعمتِه الضافیه ؞ ورحمتِه
العافیه ؞ وطنی وسکنی وداری ؞ ووِجاری واهلی وجاری ؞
فقد امنّا من المخافات ؞ فی تلک المسافات ؞ ومنّ علینا
بالمعافات ؞ من جمیع الآفات ؞ فحمِدنا اللہ المالک ؞ حمدا
کثیرا علی ذلک ؞

وقد کان جمع ممن انحرفوا عن النصاری وکانوا فی دیارنا من
الجیوش والفیالق ؞ أمّروا بعد انحرافهم امرأةً من نسل والیہ المعزول
السابق ؞ وابناً لها لم یترعرع ولم یُراهِق ؞ وقد کان النصاری اخذو
ذلک الملکَ من والیہ وکان واهیا ؞ بالملاهی لاهیا ؞ عن
الملکِ لاهیا ؞ ولم یکُ حازما ولا داهیا ؞ ینقض العهود
والمواثق ؞ فخلا لها الملک بعد ما بطل عمل النصاری وهو
زاهق ؞ وابنها صغیر غریر ؞ غریّ ذو غریر ؞ لاهٍ مع
لِداته لاهٍ عن عُداته ؞ لا یستطیع ان یدّبر ویدبّر
فی امور الملک وتجویزِها ؞ وإمضاء الأوامر و
تنجیزِها ؞ وقیادة الجیوش وتجهیزِها ؞ واعیانُ عَمَلته
وارکانُ دولته ؞ جُلّهم فُسل فُشل

انھوں نے سارے ناکے بند کر رکھے تھے۔ اور کسی گھاٹ پر کوئی کشتی یا ناؤ تک نہ چھوڑی تھی۔ کشتیوں کو پھاڑ ڈالتے۔ بلکہ خراب کر کے غرق کر دیتے یا جلا ڈالتے۔

ملاحوں کو روک دیا تھا تاکہ کوئی سیاح یا مسافر کسی وقت بھی ادھر سے نہ گذر سکے۔

خدائے مالک الملک نے مجھے اور میرے متعلقین کو ہر مصیبت و ہلاکت سے محفوظ رکھ کر، پل اور کشتی کی مدد کے بغیر، دریاؤں اور نہروں کو عبور کرا کے نجات دی۔ اور ہم سب کو آفاتِ مسافات، مہالکِ مسالک، حوادثِ راہ، اور مصائبِ گذرگاہ سے مصؤن و مامون رکھا اور اپنی پوری حفاظت، کامل حمایت، مکمل نعمت اور بے شمار رحمت کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے جوار و دیار اور احباب و رشتہ دار تک پہنچایا۔ ہم خدا کی اس بے پناہ عنایت اور تمام آفات سے حفاظت پر اس کا شکر بجا لائے۔

نصاریٰ کے "باغی" گروہوں اور ہمارے نواح کے متعدد لشکروں نے اپنے سابق معزول والی[1] کی ایک بیگم[2] اور اس کے ایک ناتجربہ کار اور ناسمجھ لڑکے[3] کو امیر و حاکم بنا ڈالا۔ نصاریٰ نے اس والی سے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ وہ بڑا واہی و لاہی تھا۔ عیش و طرب میں منہمک، انتظامِ ملکی سے غافل، عقل و خرد سے بیگانہ اور نقضِ عہد و میثاق میں یگانہ تھا۔ نصاریٰ کی عملداری ختم ہونے پر وہ ملکہ، مالکہ بن گئی۔ اس کا لڑکا چھوٹا، ناتجربہ کار، نازپروردہ، ہمسنوں کے ساتھ کھیلنے والا اور دشمن سے لاپرواہ تھا۔ تدبیرِ امورِ مملکت، اجراءِ احکام اور قیادتِ فوج کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے اعیانِ[4] سلطنت و ارکانِ دولت سب کے سب نااہل، سست،

---

[1] واجد علی شاہ اختر [2] حضرت محل، [3] برجیس قدر [4] ممو خاں وغیرہ۔

جُبَناء ؞ حَمقیٰ خُوّان لاعُقَلاء ولا اُمَناء ؞ جلهم دون ؞ وبعضهم عبدون ؞ فمنهم سفیه رفیه، ورقیع رفیع، وواهٍ واهن، ومُدهن داهن مداهن، وهَجین عَجین، ونَذُل مَذِل، وحائر بائر، وجابر جائر، ومختان مختال ؞ وخادع محتال ؞ ومنهم عبدُ عَین ؞ ومنهم عینٌ ذُو وجهین ؞ ومنهم مدبّر لکنّه مدبر، یفضی به التدبیر الی الادبار ؞ والدبار والتبار ؞ ویبصّر اولی الابصار ؞ بصائرَ الاعتبار ؞ واکثرهم للنصاری ناصحون ؞ وفی تولّیهم متناصحون ؞ وکلّهم عن تدبیر تتبیرهم مقصّرون ؞ او مقصِرون قاصرون ؞ او متقاصرون ؞ والنصاری مع نسوانهم و وِلدانهم محصورون فی المصر فی قُصور ؞ محفوظون لما فی تدبیر مُحاربیهم من قُصور ؞ وقد حصّن النصاریٰ تلك القصور ؞ بالخنادق والسور ؞ والجیوشُ المنحرفة حولهم یصُولون ویفشَلون ؞ ویقولون ما لا یفعلون ؞ ثم اتی جندٌ من البیضان ؞ لامداد المحصورین، ودخلوا المصر فقاتلهم الغُزاة الشجعان ؞ فقُتل کثیر من البیضان ؞ ودخل بقیتهم علی المحصورین ؞ محسورین مکسورین ؞ ثم خرج کل مَن فی القصور ؞ ولم یتعرَّض لهم احد باقتناء الفَتَل والقصور ؞ وتحصّنَ النصاری فی حدیقةٍ هی علی میلین من البلد ؞ وحصّنوها کل تحصین بِقوة وجلَد ؞ و طلبوا فیها مددا علی مدد ؞ وجمعوا فیها عددا علی عدد ؞

وجموعُ الجیوش التی کانت فی البلد ؞ من قبلُ فی الایام الخالیة ؞ والجیوش التی اتت بعد الفرار من دهلی، ادتْ[1] الی الوالیة ؞ فآوتُهم واکرمتهم

---

[1] آد الی فلان، مال وتوجه ورجع الیه ۱۲

بزدل، احمق، خائن اور غیر دیانتدار تھے۔ اکثر ذلیل اور بعض بندگانِ زر تھے۔ ان میں سفیہ، عیش پرست، نادان، بلند آواز، سُست، مُنافق، چرب زبان، ذلیل، غلام زادہ، حیران و پریشان، ظالم و جابر، حیلہ ساز و متکبر، خائن و مکّار، بندۂ زر و غیبت خور، سبھی قسم کے لوگ تھے۔

بعض ایسے بھگوڑے مدبّر تھے کہ ان کی تدبیر، تباہی و بربادی و ادبار کی طرف لے جاتی تھی۔ اور صاحب نظر افراد کو عبرت کے عجیب عجیب مناظر دکھاتی تھی۔ ان میں سے اکثر نصاریٰ کے معاون و مددگار اور محبّ و وفاشعار تھے۔ اور یہ سب کے سب دشمن کی ہلاکت خیز تدبیروں سے ناواقف اور ان کی مصلحت اندیشی سے بے خبر تھے۔

نصاریٰ اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ شہر[1] میں محصور مگر مخالف گروہ کی ناقص تدبیروں کی وجہ سے اپنے مکانوں[2] میں محفوظ تھے۔ نصاریٰ نے خندقیں کھود کر اور حصار بنا کر ان مکانوں کو قلعہ کی شکل دے لی تھی۔ مقابل لشکر ان پر حملہ آور ہو کر پسپا ہو جاتا تھا۔ جو کچھ کہتا وہ نہ کر پاتا تھا۔ اسی حالت میں محصورین کی امداد کے لئے سفید رُو گروہ آ گیا۔ شہر میں داخل ہونے لگا۔ تو بہادر غازیوں نے ڈٹ کر مقاتلہ کیا۔ بہت سے گورے مارے گئے۔ باقی ماندہ دل شکستہ اور حسرت زدہ ہو کر محصورین تک پہنچ گئے۔ پھر تازہ دم ہو کر یہ مکانوں سے نکلے تو بزدلی اور کوتاہی کی وجہ سے کوئی مقابلہ پر نہ آیا۔ نصاریٰ نے شہر سے دو میل دور باغ پر قبضہ جما لیا۔ اور قوت و بہادری سے اسی کو اپنا گڑھ بنا لیا۔ وہاں مدد پر مدد اور سامان پر سامان جمع کر لیا۔

وہ لشکر جو شہر میں پہلے سے موجود تھے اور وہ جو دہلی[3] سے بھاگ کر بیگم کی پناہ میں آ گئے تھے۔ جن کو ملکہ نے قدر و منزلت کے ساتھ جود و

---

[1] لکھنؤ [2] بیلی گارد ۱۲ [3] جنرل بخت خاں و شہزادہ فیروز شاہ وغیرہما ۱۲

بالنِّعَم المتواليه ؛ وجمّ غفير من الأُجَراء الاولٰى لم يشهَدوا
حربا ؛ ولم يشاهِدوا طعنا ولا ضربا ؛ ولم يعرِفوا مصلحة ؛
ولم يزاولوا أسلحة ؛ ولم يلتحِموا فى معركة ؛ ولم يقتحِموا فى
فى مهلكة ؛ تبوّءوا تجاه تلك الحديقة مقاعد ؛ وحفَروا
هناك خنادِقَ ومراصد ؛ وطال بين الفريقين التراخى و
التناصُل ؛ وامتدّ بينهما التقابل والتقاتل ؛ استمد النصارى
من والى الجبال، فأسعفهم بما كانوا يتمنّون ويريدون ؛
وأمدّهم من افواجه الجَبَليّين بجيلٍ كثير كانوا ثلثين الفاً و
يزيدون ؛ فصالتِ النصارىٰ وبيضانُهم ؛ واجرائهم واعوانهم ؛
صولاتٍ شديدةً متتابعةً متوالية ؛ وحملوا حملاتٍ سديدةً متشافعة
متتالية ؛ قلعتْ مُحاربيهم عن مقاعدِهم ؛ وزلزلتْ أقدامهم
ففرّوا من مَّراصِدِهم ؛ فرارا، لم يستطيعوا معه قرارا فى
البلدة وثغورِها ؛ حتى تركوا الوالية وابنها وحيدين فى
قصورِها ؛ وخانهما كثير من اولياءِ دولتهما ؛ واراكينِ
ملكهما واركانِ سلطنتهما ؛ ودَهاقينِ ارضهما ؛ وهم كانوا
قد جاءوا لِإعدادهما وإمدادهما ؛ وإعانتهما وصيانتهما ؛
وحِفظ عَرضهما وعِرضهما ؛ فنكثوا المواثقَ والأيمان ؛ واستبدلوا
الكفر بالإيمان ؛ ونافقوا فوافقوا النصارىٰ، ورافقوهم، و
انتصروا لهم انتصارا، فدخَلَ النصارىٰ واعوانهم البلدة وخرج اهلوه وتركوا
دورَهم وبيوتهم خالية ؛ حتى حصرتِ النصارى وبيضانُهم وجنودهم واعوانُهم
مقصورةً كانتْ فيها الوالية ؛ فخرجتْ مع ابنها وامرأتين من صواحبها من المقصورة
المحصورة من ظهرها راجلةً ؛ ودخلتْ محلّةً اخرى عاجلة ؛ ومكثتْ فى البلدة ثلثة
ايام تستعيد جنودَها الفارّة وتسترِدّ ؛ وتستعينهم وتستمِدّ ؛ وهم قد مُلئوا
من الدهش والرعب ؛

بخشش سے نوازا تھا۔ اور تنخواہ دار سپاہیوں کا وہ جم غفیر جو حرب وضرب سے نابلد، اسلحہ بندی سے ناواقف، اور مصلحت و معرکہ سے ناآشنا تھا۔ یہ سب اس باغ پر خندقیں کھود کر اور کمین گاہ بنا کر جا ڈٹے۔

دونوں فریقوں میں ایک مدت تک مقابلہ ومقاتلہ اور نیزہ بازی و تیراندازی ہوتی رہی۔ تنگ آکر نصاریٰ نے پہاڑوں کے والی سے مدد مانگی اس نے ان کی آرزو کے مطابق تیس ہزار سے زیادہ پہاڑی لشکر بھیج کر مدد کی۔

اب تو نصاریٰ، ان کی گوری فوجوں، کرایہ کے سپاہیوں، اور لالچی معاونین نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ یہ حملے بڑے سخت، متواتر اور مسلسل تھے جنھوں نے مقاتلین کو ان کی جگہ سے ہلا دیا۔ اور ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وہ کمین گاہوں سے ایسی بری طرح بھاگے کہ شہر کی سرحدوں پر بھی نہ ٹھیر سکے۔

ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ بھاگے۔ ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکان دولت اعیانِ سلطنت نے دغا کی۔ اور وہ دیہاتی جو ان کے علاقہ سے ان کی مدد و اعانت، عزت و آبرو، مال و دولت کی صیانت وحفاظت کے لئے آئے تھے عہد شکنی کر کے اور کفر کو ایمان سے بدل کر منافق بن گئے۔ نصاریٰ کی موافقت و رفاقت کرنے لگے۔ نصاریٰ مع معاونین شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے رہنے والے گھروں کو خالی کر کے نکل گئے۔

نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس محل شاہی کا جسمیں ملکہ تھی محاصرہ کر لیا۔ بیگم اپنے ولی عہد اور دو سہیلیوں کو لے کر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلہ میں تیزی سے پیدل پہونچ گئی۔ تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس کرنے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ لشکر ایسا دہشت زدہ ہو چکا تھا کہ کسی صورت

فنكصوا ونكلوا عن الاقتحام فی هٰذا النكال الصعب؛ فلم يرجعُ اليها احَد؛ ولم يبق لها فی البلد مُلتَحَد؛ فلما استيئسُت من الاعوان والانصار؛ نَفرَتْ مع ابنها وعدّةٍ من الانفار للسفار الی القلاع والقِفار؛ فاجتمع اليها جماعات من الفرسان الوجال؛ وجمٌّ غفير من الرّجال الرجال؛ وجمع كثير من اهل البلد وربّات الحجال؛ وهم حفاة عُراة؛ وقد كانوا من السّراة؛ وهنّ حافيات؛ غير خافيات؛ وقد كنّ عقائلَ ذواتِ اخادير؛ مقصوراتٍ فی مقاصير؛ فَرُمين من بقاع بِقاع؛ واقتنعن للقنوع برقاع؛ فاقتنعن بها من دون قناع؛ تقاذفهنّ القفار والبلاقع؛ وانتُضِيت عنهنّ الستور والبراقع؛ كنّ فی زَهو وتِيه؛ ثم تهُنَ فی مهامِهَ وتِيه؛ قد تركوا اَمكِنة ومكانة ودُوَلا؛ كانوا لا يبغون عنها حِوَلا؛

حتی حال الحال؛ وحل الوبال؛ وفشا الخَبال؛ فصار بلاء مُبيدا؛ ترك البلاد بِيدا؛ والاحرار عبيدا؛ والاغنياء مساكين؛ والنبلاء مَهاجين؛ كانوا مستوطنين فی رُفهنية وبلهنية مع الاهل والعيال؛ فاغتربوا مطمئنّين برَفاء الحال؛ وفَراغ البال؛ فاضطربوا اثنائهم المتربة والاِتراب؛ عن المتارَبة مع الاَتراب؛ واضطرهم الاضطراب؛ الی الاِضراب عن الاَضراب؛

فمن باكٍ يتفجع؛ وشاكٍ يتوجع؛ وحَنّانٍ يرجّع؛ ولَهفانَ يسترجِع؛ صبيان فطِموا قبل الابّان عن اللبان؛ وشيب وشبان قد استيئسوا عن الحاجات

اس سے نازک موقع پر دستگیری کو تیار نہ ہوا۔ نہ ان میں سے کوئی متنفس لوٹا اور نہ شہر بھر میں کہیں جائے پناہ ہی رہی۔ آخر کار بیگم اپنے اعوان و انصار سے مایوس ہو کر ولی عہد اور چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر، چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ اب اس کے گرد، کمزور دل سواروں کی کچھ جماعتیں، پیدل مردوں کا انبوہ کثیر، شہریوں اور عزت دار عورتوں کی کافی تعداد آ کر جمع ہو گئی۔ وہ شہری ننگے بدن اور ننگے پاؤں تھے۔

حالانکہ سرداروں میں سے تھے اور عورتیں ننگے پاؤں اور بے پردہ تھیں حالانکہ گرامی قدر، پردہ نشین اور محل سراؤں کی رہنے والی تھیں۔ وہ سرسبز و شاداب خطوں سے چٹیل میدانوں کی طرف پھینک دی گئیں۔ وہ پیوندوں کے کپڑے پہن کر ستر پوشی کرتی تھیں اور برقعے نہ ہونے سے اسی پر اکتفا کرتیں۔ ایک میدان سے دوسرے میدان میں پہنچتیں بے پردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا۔ وہ عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ پھر دور دراز جنگل اور پرخطر میدان میں ڈال دی گئیں۔ ان لوگوں کو محلات، پائیگاہیں اور ریاستیں چھوڑنی پڑیں۔ حالانکہ وہ ان سے ذرا بھی ہٹنا نہ چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ حال متغیر، وبال نازل اور ہلاکت عام ہو گئی۔

یہ ایسی مہلک مصیبت نازل ہوئی جس نے شہروں کو میدان، آزادوں کو غلام، مالداروں کو فقیر و مسکین اور شریفوں کو خوار و ذلیل بنا دیا۔ وہ اپنے اہل و عیال میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ خوش حال، اور فارغ البال تھے۔ کہ مجبور ہو کر نکلنا پڑا۔ فقیری و تنگدستی نے ہمسنوں کی مجالست اور اضطراب و اضطرار نے برابر والوں کی رفاقت سے دور کر دیا رونے والے آہ و زاری، بیمار فریاد و شیون کرتے، آرزو مند چلاتے، اور حسرت کشیدہ انا للہ پڑھتے۔ بچے اپنی ماؤں کے سینوں سے قبل از وقت جدا کر دیئے گئے تھے۔ بوڑھے اور جوان حاجتوں کے پورا کرنے

واللبان ؛ مالهم مثوى وثواء : ولا لدواهم دواء : وافئدهم هواء : لا تطيب لهم هوى وهواء : فالعيش و الموت عندهم سواء ؛ كانوا فى سرور وسرير : واستبرق وحرير ؛ وفواكه وفكاهة : ورفاهة ونزاهة : و نعمة ونَعمة ؛ وغنى وغناء : ونغمة وسرّاء : وسَرار ودولة وثراء ؛ اليوم وطائُهم قتاد : مالهم زاد وعتاد ؛ وثيابهم اخلاق : ومالهم من الراح خلاق ؛ عافاهم الله برحمته : واخذ الظالمين ببطشه ونقمته ؛ ثم ان الوالية اى الحضرة العالية ؛ بعد ما اوىٰ اليها جموع من الجيوش الاولىٰ هربوا : وكثيرا من الذين اغتربوا ؛ عبرت معهم من البحار والانهار، اللاتى لا يعبر منها بدون الفلك : واقامت مع من شايعها فى قرية على شاطئ بحر فى شمال المُلك ؛ واقعدت اذ اقامت بها فرسانا ورجالا على المعابر، ليقبضوا على السفائن : ويصدّوا عن العبور اهل الضغائن : وارسلت عمّالا لاخذ الخراج واصلاح الرعايا فى القرى والمدائن وجهّزت جيوشا وبعثتها ليقيموا بمراصد قريبة من دار ملكها التى استولى النصارى عليها، ليقاوموهم ويلاحموهم : ويحاوقوهم ويزاحموهم ؛ عند انتهاضهم من حواليها، لكنّها فوّضت الامر كلّه : عقده وحلّه : دِقه وجِلّه ؛ الى عامل خامل : ذاهلٍ داهل ؛ لم يكن للامر اهلا : لا يستشير ويأتمِر جهلا : يستصعب كل سهل، ويحسب كل صعب سَهلا ؛ وكان وَغداً رهَدَناً دُهدُناً : لا يستخلص للمعاشرة والمشاورة والمجاورة والمحاورة

سے ناامید تھے۔ نہ ان کا کوئی ٹھکانہ تھا نہ بیماری کی دوا تھی۔ ان کے دل خالی تھے ان میں نہ کوئی خواہش تھی نہ انھیں کوئی بات بھاتی تھی۔ زندگی اور موت ان کے لئے دونوں برابر تھے وہ مسرت و شادمانی، تخت شاہی، دیباج و حریر، میوے، خوش طبعی، عیش و عشرت، نظافت و نزاہت، نزاکت و نعمت، نغمہ و سرود، مال و دولت، خیر سگالی و مروّت میں پلے تھے۔

آج ان کی راہ میں کانٹے ہیں، سامان و زادِ راہ کا پتہ نہیں۔ کپڑے بوسیدہ ہیں اور عیش و راحت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انھیں، معاف کرے اور ظالموں کو سخت گرفت میں لے۔

پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آگیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور نہروں سے گذری جن سے بغیر کشتی کے عبور مشکل و دشوار تھا۔ وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہو گئی اور دریا کے گھاٹوں پر سوار، پیادے بٹھا دیئے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کریں۔ اور دشمنوں کو دریا عبور نہ کرنے دیں۔

اس نے انتظام رعایا اور حصول خراج کے لئے شہروں اور قصبات و دیہات میں عامل بھیج دیئے۔ لشکروں کو آراستہ کر کے اپنے اس دارالسلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا تھا بھیج دیا تاکہ اگر دشمن ادھر کا قصد کرے تو اس سے ڈٹ کر مقابلہ و مقاتلہ، مزاحمت و مجادلہ کیا جائے لیکن یہ تمام امورِ مہمہ اور ان کا اہتمام و انصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل[1] کو سونپا گیا تھا جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ وہ صحیح مشورے سے گریزاں اور جہل سے ہم کنار تھا۔ آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا۔ وہ ذلیل احمق اور بزدل تھا۔ اس نے مکالمت اور مشاورت، مجالست اور

---

[1] نواب احمد علی خاں عرف ممو خاں ۱۲

الا سفلة جهلا دونا ؛ يتجنب النبلاء الدهاة، والعقلاء الهداة نخوته ؛ ولا يستصحب ولا يؤمّر ولا يستعمل الا السّفلة الجهلة من عشيرته واخوته ؛ فامّر ذلك الإمّر على تلك الجيوش سُفلا جبناء أنذالا ؛ وفُسلا فُشُلا أرذالا ؛ يطمعون فيطعمون ما درّ للجيوش لاقواتهم، ويختانون لما فى صدورهم من غِلّ فيغلّون ويغلون من غلاتهم، يحسبون كلّ صيحة عليهم هم العدو ؛ فلا يزالون من الفرَق فى القلق ما لهم قرار ولا هدو ؛ يظنون من غاية الوجَل ؛ كل صيحة مقدمة الأجل ؛ ويخالون كل صوت ؛ داعىَ موت ؛ و لعلّهم يلقون الى العداة اللئام ؛ بالمودّة واللؤام والالتيام ؛

والنصارى بعد استيلاءهم على دار الملك بثوافيها ؛ ولم يخرجوا الى ارجائها ونواحيها ؛ وطفقوا يؤلفون كفار الاقطار واراكينها ؛ وحُرّاثَ القرى ودهاقينَها ؛ بالصفح والعفو عن المعاصى والجنايات ؛ والتخفيف فى الخراج، والتطفيف فى الجبايات ؛

فلما دانوهم دانوا لهم اعضادا ؛ وكانوا لهم فكانوا لهم اعضادا ؛ فبرز النصارى الى نواحى الملك واقطاره ليستولوا على قراه وامصاره ؛

فلمّا عمدوا الى مرصد كان من دار الملك فى جهة الشمال[١] على ثمانية[٢] اميال ؛ وفيه خيل ورجال ؛ مع قائد كبير من السّفل الرذال ؛ فهرب ذلك القائد الرذيل ؛ مع من معه من ذلك القبيل ؛ اذ سمع من لقائهم

---

[١] فى نسختنا بدل الشمال «الشرق» [٢] فى نسختنا عشرة اميال ١٢

منادمت کے لئے احمق، جاہل، اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا۔ وہ نخوت و غرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزّہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب و حاکم بناتا۔

چنانچہ اس ناتجربہ کار نے ان لشکروں پر کمین، ذلیل، بزدل اور رذیل لوگوں کو سردار بنادیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے۔ جو کچھ لشکریوں کو خوراک وغیرہ دی جاتی کھا جاتے۔ وہ بددیانت تھے اپنی کینہ پروری کی وجہ سے ان کے غلّہ اور جنس میں خیانت کرتے اور گراں فروشی کے مرتکب ہوتے ہر آواز کو دشمن کی آواز سمجھتے، ہمیشہ اضطراب کے ساتھ خوف کی وجہ سے لرزتے رہتے۔ کسی وقت بھی ان کو راحت و سکون میسر نہ تھا بزدلی سے ہر آواز کو موت کا پیش خیمہ اور ہر صدا کو موت کی پکار سمجھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمینے دشمنوں کے سامنے محبت و حاجت کے ساتھ پیش ہو رہے ہیں۔

نصاریٰ دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں ڈٹے رہے۔ اطراف و جوانب کی طرف نہ نکلے۔ انھوں نے گرد و نواح کے کافروں دیہاتیوں اور کاشتکاروں کی تالیفِ قلب شروع کر دی۔ ان کی خطاؤں کو درگزر، ان کے خراج میں تخفیف اور تاوانوں میں کمی کی۔

اس مہربانی پر وہ مطیع و فرمانبردار اور معاون و مددگار بن گئے۔ ادھر سے مطمئن ہو کر اطرافِ ملک میں شہر و دیہات پر قبضہ کرنے کیلئے نصاریٰ نکل کھڑے ہوئے۔ جب نصاریٰ اس مرشد[1] کی طرف متوجہ ہوئے جو دارالسلطنت سے جانب شمال آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اور جس میں سوار، پیادے اور وہ رذیل و ذلیل قائد عظیم بھی تھا۔ تو وہ کمین قائد ان کی آمد کی خبر سن کر ہی اپنے ذلیل سرداروں کے ساتھ بھاگ

---

[1] نواب گنج ضلع بارہ بنکی ۱۲

خبرا؛ قبل ان يرى لاحد منهم اثرا؛ وثبت هنالك للقتال جمع قليل من الهنادك الاقتال؛ مع اُركون دكين كان من شجعان الابطال؛ ولم يكن عدد تلك الفئة؛ زائدا على المائة؛ فقاتلوا وقتلوا وقتلوا ولم يبق منهم احد؛ لتجنّبهم عار الفرار؛ وفقد المدد؛ من قبل القائد الفرّار؛ مع كثرة من كان معه من العدد؛ وما كان معه من العُدد؛ فاستولى النصارى على قرية كان فيها ذلك الجبان الخوان للرصد؛ اذ وجدوها خالية؛ على عروشها خاويه؛

فجعلوا تلك القرية حصنا حصينا؛ وحصارا منيعا رصينا؛ وجمعوا عددا؛ ولبثوا فيها مُدَدا؛ لا يقدمون ميلا؛ كانّهم ينتظرون ما امّلوا من قواد الجيوش تاميلا؛ ويرتقبون ما وعدهم اولٰئك الخوّان فيؤجلون الى انجاز الوعد تاجيلا؛

ثم انّهم خرجوا في جانب الغرب من البلد الى ناحية جلّ دهاقينها وسكانها لهم يدينون؛ ولهم على اعدائهم معينون؛ وكان فيها من قِبَل الوالية العلية عامل خامل لم يكن حازما ولا مجربا ولا مدبرا؛ فولّاهم الدبر وتولّى وهو مدابر لهم مدبرا؛ وهرب بلا مقابلة ومقاتلة هربا؛ واتخذ سبيله سَربا؛ لقلة الخيل والرجل لديه؛ وعدوان الدهاقين والكفار عليه؛ وقد كانوا واثقوه؛ على انهم وافقوه؛ ثم خالفوه بعد ما حالفوه؛ وغدروا غدرا؛ ومكروا مكرا نكرا؛ وكفروا بنعمة كانوا بها رافهين؛ ونَعمة كانوا فيها فاكهين دهرا؛ وازدادوا الى الكفر والكفران بترك كفران الأيمان؛ والارتداد عن الإيمان؛ كفرانا وكفرا؛ فانتهض لمحاربة النصارى المتسلطين على تلك الناحية عامل ناحية اخرى؛ قد ادّخر من الحسنات والخيرات والسعادات والمبرات ذخرا؛ كان بَرّا تقيا؛ صفيا نقيا؛ شجاعا كميا؛ لرسول الملاحم

گیا۔ بہادر ہندوؤں کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤں کے بہادر مکھیا کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئی۔ یہ تیس سے زیادہ نہ تھے۔ دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے۔

وہ فرار کی عار برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بھگوڑے قائد کی طرف سے کافی لشکر اور ساز و سامان کے ہوتے ہوئے بھی انھیں کوئی مدد نہیں پہنچ سکی تھی نصاریٰ نے جب اس گاؤں کو جس میں وہ نامرد خائن عامل نگہداشت کے لئے موجود تھا، خالی اور ویران پایا تو اس پر قبضہ جما کر اپنا مضبوط و محفوظ قلعہ بنا لیا۔ وہیں فوج جمع کر لی اور مدت تک وہیں مقیم رہے وہ ایک میل بھی نکل کر نہ گئے وہ سرداران لشکر کی امیدوں کی تکمیل، اور ان خائنوں کے ایفاء عہد کے منتظر تھے اسی لئے اپنے ایفائے وعدہ میں بھی تاخیر کر رہے تھے۔

ادھر سے فارغ ہو کر انھوں نے اس مغربی گوشے کا رخ کیا۔ جہاں کے تمام باشندے ان کے مطیع ہو چکے تھے۔ اور دشمنوں پر ان کے معاون تھے۔ وہاں بھی ملکہ کی طرف سے، ناعاقبت اندیش، غیر مدبر، ناتجربہ کار، اور ذلیل عامل تھا۔ وہ بھی پیٹھ پھیر کر مقابلہ کئے بغیر بری طرح بھاگا۔ سرنگ میں ہو کر اپنا راستہ بنایا۔ اس کے پاس سوار اور پیادے بھی کم تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہاتیوں نے معاہدہ و قسم کے باوجود وقت پر دغا کی۔ غدر و مکر کی انتہا کر دی۔

ناز و نعمت اور پُر عیش و مسرت زندگی کا کفران کیا۔ معاہدوں سے انکار کر کے کفر میں اضافہ اور ارتداد میں زیادتی کر لی۔ اس موقع پر متسلط، نصاریٰ سے قتال کے لئے دوسری طرف کا ایک عامل[1] اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خیرات و مبرات اور سعادات و حسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔ وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر اور رسولِ طاہم

---

[1] شاہ احمد اللہ مدراسی ۱۲

نبی الملاحم صلی الله علیه وآله وسلم سمیا ؛ فاغار علی النصاری وجندهم ؞ فهزمهم فی اول سطوة ففروا بعد بذل جهدهم ؛ وتحصنوا مع عصبة ؞ فی دار هندکی فی القصبة ؛ وکانت تلک الدار منیعة حصینة ؞ وکتبوا الطلب کتیبة یمدونهم الی عظماء النصاری کانوا فی المدینة ؛ فارسلوا الامدادهم کتیبة من فیالقهم ؞ ومعها جم غفیر من الدهاقین والمنافقین الذین نکثوا الایمان وکفروا بعد الایمان بنقض مواثقهم ؛ وقد خادع بعض الکفار من الدهاقین الکفار ؞ ذلک العامل البار الکرار ؞ بمکر کبار ؛ فواثقه بتاکید الأیمان ؞ بانه یمده اذا التقی الجمعان ؞ باربعة آلاف ابطال الشجعان ؞ فلما ترائی الفئتان ؞ صال ذلک العامل المتدین الکامل مع عدة من الفتیان ؞ علی عسکر النصران ؞ متوقعا بامداد ذلک الکافر الدهقان ؛ فرمی عسکر النصاری بالبنادق والمجانق من امامهم وجوههم وصدورهم ؞ ورمت جماعة ذلک الدهقان الکفار المکار الغدار من خلفهم ادبارهم و ظهورهم ؞ وکانت تلک الجماعة فی الحقیقة انصار الانصار و اعوانهم ؞ واتباع الشیاطین واخوانهم ؛ فاستشهد ذلک العامل الکامل، فخر فی المعرکة شهیدا صریعا ؞ واستشهد کل من معه عند الصیال والقتال استشهادا سریعا ؛ وبعد استشهاد ذلک البار الکرار ؞ وهؤلاء الابرار ؞ ولی من ورائهم الادبار للفرار ؞ وفروا فرارا لم یلتفتوا فیه الیٰ ما خلفهم وما ورائهم لغلبة القتل والاضطرار ؛ وتعقبهم جنود النصاری فعاقبوهم بالاثخان و التقتیل ؞ فما نجا منهم الا قلیل جدوا عند الفرار فی الاسراع والتعجیل

وعند ذلک لان ودان ؞ وکان کل من کان ؞ فی تلک الناحیة من الاراکین والارکان ؞ وغیرهم من الرعایا والدهاقین والسکان ؞

اور نبیِ مراحم صلے اللہ علیہ وسلم کا ہمنام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کرکے پہلے ہی حملہ میں شکست دیدی۔

اپنی ساری کوششیں ختم کرکے وہ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط ومحفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اور عظمار نصاریٰ کے پاس شہر میں پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ انھوں نے ایک لشکر اور منافقین ودہاقین کا جمّ غفیر جنھوں نے عہد شکنی کی تھی۔ ان محصورین کی مدد کو بھیجدیا۔

ادھر اس نیک سرشت بہادر عامل سے ایک دیہاتی کافر زمیندار[1] نے بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ پر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا۔ جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمین دار کی قسموں پر بھروسہ کرکے اس دیانتدار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے تو بندوقوں اور توپوں سے، چہروں اور سینوں پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں۔ اور پیچھے سے اس غدّار مکّار زمین دار کی جماعت نے پُشت و سُرین کو پھوڑنا شروع کیا۔

وہ دراصل نصاریٰ کے انصار واعوان اور شیاطین کے اتباع و اِخوان تھے۔ وہ خداپرست عامل معرکہ میں گر کر شہید ہوا۔ اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔ ان سب ابرار واخیار کی شہادت کے بعد بزدل لوگ ایسے بھاگے کہ نامردی، اور اضطرار سے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نصاریٰ نے تعاقب کرکے ان سب کو پکڑ کر قتل کر ڈالا۔ تھوڑے سے وہ بچ رہے جنھوں نے بھاگنے میں پوری تیزی اور عجلت سے کام لیا۔

اس نواح کے سارے باشندے دہقانی، کاشتکار، مکھیا اور مقدم

---

[1] بلدیو سنگھ راجہ پوائیں ضلع شاہجہاں پور۔

لعسكر النصران؛ ماعدا اثنين؛ ابيّين كميين؛ مغيارين مغوارين؛ قاتلا النصارى اشدّ قتال؛ فقتلو كثيرا من جنودهم من خيل ورجال؛ بشدة حماستهما وشجاعتهما؛ مع قلة بضاعتهما وجماعتهما؛ ثم استخلصا منهم بتصلّبهما؛ فلم يهمّ النصارى بتعقّبهما؛ فصفت لهم تلك الناحيه؛ والقت الرعب فى قلوب مخالفيهم تلك الواقعة الداهيه؛ وكانت من ادهى الخطوب؛ الباعثة للكروب؛ وكانت تلك الهيجاء كانها خاتمة الوقائع والحروب؛

فبعد ما غلب فيها النصارى وانتصروا؛ تفسحوا فى النواحى الاخر وانتشروا؛ فكلما همّوا بدخول قطر واهتمّوا باخذه اهتماما؛ همّ همّهم من فى ذلك القطر من مخالفيهم فاهتمّوا اهتماما؛ ما استطاعوا معه هناك قياما؛ وانهزموا قبل المكافحة انهزاما؛

ومع ذلك كادت ملكة النصارى كيدا؛ قد ازدادوا به قوة وايدا؛ وذلك انها قد شهرت بارسال بطاقات مطبوعة فى كل من الاقطار؛ والقرى والامصار؛ فاشتهر غاية الاشتهار؛ انها قد عفت عن الجيوش التى انحرفوا؛ والرعايا الذين ارتكبوا العصيان واقترفوا؛ الّا الذين قتلوا النسوان والصبيان؛ والنصارى الاولى جاءُوا مضطرين للاستيمان؛ فاغتالوهم بالعداوة والعدوان؛ والذين قاموا للملك والرياسة والسلطان؛ والذين كانوا يحثّون الناس على الاعتداء والطغيان؛ وقد كانت الجيوش المنحرفة وغيرهم ممن رافقوا ووافقوا الوالية واجتمعوا لديها لِعَوَز المعائش؛ اذ قدرت ارزاقهم وقترت اقواتهم وعدم ما كانوا يعطون مشاهرة او مياومة لفقد خراج كان يجبى اليها؛ لانتشار جنود النصارى فى اقطار الملك وتسلطهم عليها؛ فضاقت عليهم الارض بما رحبت،

وغیرہم سب مطیع و فرمانبردار بن گئے۔ البتہ دو بہادر غیرت مند اور غارتگر جوانمردوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔ اپنی بے پناہ شجاعت و بسالت سے قلت اسباب و جماعت کے باوجود دشمن کے ہزاروں سوار، پیادے ٹھکانے لگا دیئے۔ آخرکار مجبور ہو کر اپنی بہادری سے جان بچا کر نکل گئے اور دشمن ان کا تعاقب نہ کر سکا۔ اب وہ نواح بھی صاف ہو گیا۔ ان دونوں سرداروں کی شکست کے بعد مخالفوں کے دل میں دشمن کا رعب قائم ہو گیا یہ واقعہ رنجدہ واقعات میں سے سب سے اہم اور آخری واقعہ اور اس جنگ کا خاتمہ تھا۔

نصاریٰ یہاں غالب ہونے کے بعد دوسرے اطراف میں پھیلنا شروع ہوئے۔ وہ جب کسی طرف کا قصد کرتے تو وہاں کے رہنے والے غم و فکر میں مبتلا ہو جاتے۔ اور لڑے بھڑے بغیر شکست مان لیتے۔ ان تمام فتحمندیوں کے بعد بھی ملکۂ نصاری (وکٹوریہ) مکر سے باز نہ رہی۔ اس مکر کی وجہ سے انھیں بڑی قوت و طاقت حاصل ہو گئی۔ اس نے تمام دیہات، شہروں اور قصبوں میں مطبوعہ حکم نامے جاری کئے۔ جن میں عام معافی کا اعلان کیا۔ کہ تمام باغی "لشکر اور سرکش و نافرمان رعایا کو اُن لوگوں کو چھوڑ کر معاف کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے عورتوں، بچوں اور ان نصاریٰ کو جنھوں نے مجبور ہو کر پناہ لی تھی۔ ظلم و عداوت سے قتل کر ڈالا۔ یا وہ جنھوں نے سلطنت و ریاست قائم کی۔ یا وہ جنھوں نے سرکشی و عدوان پر لوگوں کو ابھارا۔ ادھر وہ "باغی" لشکر اور دوسرے بیگم کے ساتھی، روزی کے نہ ہونے اور تنخواہ و ضروریاتِ زندگی میسر نہ آنے سے پریشان ہو چکے تھے۔

نصاریٰ کے مسلّط و منتشر ہو جانے کی وجہ سے بیگم کے پاس خراج اور محاصل کا آنا بند ہو گیا تھا۔ زمین کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی

وضاقت علیهم انفسهم فی ضنک شدید؛ وضیق مدید؛ وکان کل منهم صفر الکف والراحة؛ فقید العافیة والراحة؛ مقسّم البال بالبلبال؛ لتنائی الاهل والعیال؛ فارتدّ کثیر منهم الی النصاری واشیاعهم؛ واختاروا الانقیاد لطاعتهم واتباعهم؛ فسلبهم النصاری ما کان لهم من الافراس والسلاح؛ واعطوهم خطوط الامان؛ فرجعوا الی الاهل والاوطان؛ آئبین خائبین مع الخسران والحرمان؛

فتسلط النصاری علی الملک کله بلا مزاحم؛ واستراحوا من المعارک والملاحم؛ واوی الوالیة بعد هٰذا الخبال والوبال؛ مع قلیل من الرجال الی قلل الجبال؛

واذ کنت قد طال اغترابی؛ واکتئابی واضطرابی؛ واشتدّ ارتغابی فی ایابی؛ الی داری واهلی وجیرتی واحبابی؛ ورأیت موثق الایمان؛ موثقا بالایمان؛ رجعت الی اهلی ووطنی؛ وداری وسکنی؛ مطمئنّا بموثق الایمان؛ غافلا عن انّه لا ایمان؛ لمن لیس له ایمان؛ وانه یمینٌ بعد الیمین؛ من لا یتدین بدین؛ ولا یخاف یوم الدین؛

فبعد ایام دعانی؛ من معانی؛ عامل نصرانی؛ فحبسنی وعنّانی؛ وحزننی وعنّانی؛ ثم ارسلنی ماسورا الی قاعدة الملک؛ التی صارت دار الهلک؛ وفوّض امری الی حاکم متحکّم؛ ظالم لا یرثی لمتظلم؛

ووشی علیّ عنده مرتدّان؛
اشد ان الدّان؛ جادلانی فی آیة
من آی القرآن؛ محکمة حکمت بان

تھی۔ وہ بڑی سخت مصیبت و تنگی میں پڑ گئے تھے۔ وہ سب تنگدست، اور عیش و راحت سے دور تھے۔ ان کے دل اہل و عیال کی جدائی سے پارہ پارہ تھے۔

ایسے حالات میں مجبور و مضطر ہو کر بہت سے لشکری وغیرہ نصاریٰ کے اطاعت گذار بن گئے۔ ان کے پاس ہتھیار، گھوڑے جو کچھ تھا چھین لیا گیا۔ اور پروانۂ امان دیدیا گیا۔ اب وہ اہل وطن کی طرف خائب و خاسر ہو کر لوٹے۔ پھر تو نصاریٰ سارے ملک پر بلا مزاحمت قابض ہو گئے میدان کارزار اور لڑائیوں سے نجات پا گئے۔ بیگم اس تباہی و بربادی کے بعد، بچے کھچے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑ ونجؔ کی چوٹیوں پر چلی گئی۔

میں مسافرت و غربت، اضطراب و مصیبت کی زندگی گذار رہا تھا۔ اور میرا اشتیاق و رغبت اپنے گھر، اہل و عیال، پڑوسی اور احباب تک پہنچنے کے لئے بڑھ رہا تھا۔ کہ امن و امان کا وہی پروانہ جسے قسموں سے مؤکد کیا گیا تھا، نظر پڑا۔ اس پر بھروسہ کر کے اپنے اہل و وطن میں پہنچ گیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا۔ کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کے قسم و یمین پر اعتماد کسی حالت میں درست نہیں خصوصاً جب کہ وہ بے دین جزا و سزاءِ آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔

تھوڑے دن کے بعد ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کر دیا۔ اور رنج و غم میں مبتلا و مقید کر کے دار السلطنت (لکھنؤ) جو دراصل خانۂ ہلاکت تھا بھیجدیا۔ میرا معاملہ ایسے ظالم و حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا اور میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تندخو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ

لہ سرحد نیپال ۱۲

من يتولّى النصارى نصران ⁖ وهما على توليهم يصدان ⁖ فارتدّا واستبدلا الكفر بالايمان ؛ فقضى عليّ بتخليد حبسي وتعذيبي ⁖ وجلائي وتغريبي ؛ وغصب كل مالي ⁖ من كتبي ونشبي ومالي ⁖ و غصب دارا كانت لاهلي وعيالي ؛ وهم لم يخصّوني بهذا العذاب الفظيع بل عاملوا خلقا كثيرا بما هو افظع من هذا الصنع الشنيع ؛ فهم نكثوا موثقهم كل نكث، واغتالوا كثيرا من الخلق ⁖ بالضرب و الخنق ؛ واخذوا كثيرا منهم بالابتلاء ⁖ بالاسر والجلاء ؛ بلا تانٍّ ومكث، واخلفوا كل وعد كل اخلاف، واتلفوا النفوس والنفائسَ ايّ اتلاف ⁖ فقد جاوز العدّ دماء مطلولة لا تحصى بمئات والاف ⁖ وتعدّى الحدّ رقاب مغلولة من اشراف واجلاف ؛

سيّما فيما بين دهلي وبين ديارنا من فسيح قطر ⁖ فيه بلاد وقرى وقصبات هي مواطن لاكثر نبال وخُطر ؛

وقد ارسل اليهم رئيس يدعي الاسلام والايمان ⁖ جموعا اُوَوْا الى دار رياسة بالاستيمان ⁖ فاسرهم وقسرهم بعد ما وعدهم بالايمان ⁖ فعذبهم ارضاءً للنصارى بما هو محظور في جميع الاديان ⁖ ولم يخش لاسترضاء النصارى سخط العزيز المنتقم الديّان ؛ فقيّد النصارى اولئك المرسلين مغلولين مسلسلين ؛ فغالوا كثيرا من النبلاء ⁖ وعذّبوا جمعا جمّا من هٰؤلاء ⁖ بالقيود والجلاء ⁖ وما يشق جدّا من اشد البلاء ؛ فقد شارك النصارى ذلك الرئيس في ما استحقّوا من الاجور في ابتلائهم عباد الله بكل ——

تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مُصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اور میری کتابیں، جائداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس شرمناک رویہ کا تنہا میں ہی شکار نہ بنا تھا۔ بلکہ بہت سی مخلوق سے اس سے بڑھ چڑھ کر ناروا سلوک روا رکھا گیا۔ انھوں نے عہد و پیمان توڑ کر ہزاروں مخلوقِ خدا کو پھانسی، قتل، جلاوطنی قید و حبس میں بلاتاخیر مبتلا کر دیا۔ وعدہ خلافی کر کے بیشمار نفسوں اور لاتعداد نفیس چیزوں کو تباہ کر ڈالا۔

اس طرح خونِ ناحق شمار سے آگے بڑھ گیا۔ سینکڑوں اور ہزاروں سے گنتی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شریف و غیر شریف قیدیوں کی تعداد حد سے متجاوز ہے۔ خصوصاً دہلی اور ہمارے دیار کے مابین وسیع علاقے میں جہاں شریف و عظیم خاندانوں کے شہر، گاؤں اور قصبے کے قصبے آباد ہیں۔

ان شرفاء و عظماء کے پاس ایک رئیس نے جو اسلام و ایمان کا مدعی بھی تھا۔ دار الریاست میں طلبی کے ساتھ امن و امان کا پیغام بھیجا۔ وہاں پہنچنے پر اپنے وعدے سے پھر کر نصاریٰ کی خوشنودی کی خاطر غداری کر کے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ بدعہدی کے سارے مذاہب میں مذموم و ممنوع ہے۔ اس کا بھی لحاظ نہ کیا۔ یہ بدبخت نصاریٰ کی رضاجوئی میں خدائے عزیز و منتقم کے غصہ سے بھی نہ ڈرا۔ نصاریٰ نے ان سب کو ہتھکڑی، اور بیڑی پہنا کر محبوس کر دیا۔ اکثر شرفاء کو قتل اور باقی کو قید، جلاوطنی، اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا۔ اس طرح وہ بدنصیب رئیس بھی نصاریٰ کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو سخت عذاب میں مبتلا کرنے کی وجہ سے اجر و انعام کا

عذاب بئیس؛

هذا ولما ابتلانی النصاری بالحبس؞ بما اختلفوا من الخدع واللبس؛ نقلونی من سجن الی سجن؞ ومن حزن الی حزن؞ وتادونی شجنا علی شجن؞ وحزنا علی حزن؛ وسلبونی النعال واللباس؞ ولبسوا علی کسی الکساء والکرباس؛ واخذوا منی فراشا لینا حسنا؞ ومهّدوا لی وطاء من الخشنا؛ کانه شوک قتاد؞ او جمر وقّاد؛ ولم یترکوا عندی ابریقا ولا قعبا ولا آنیة؞ واطعمونی ضنّانا وسقونی میاها آنیة؛ تعوّضت من حمیم دان؞ بحمیم آن؞ وبلیت مع ما لی من کبر وتوان؞ بصغار وهوان؞ فی کل اٰن؛

ثم قذفنی شط الخضم الکالح؞ الی شط الخضم المالح؛ الی جبل مستوبل راس؞ اسمه راس؞ لا یزال الشمس فیه علی سمت الراس؛ فیه شعاب صعاب؞ وعقاب فیها عقاب؛ وفجاج تغشاه امواج؞ من بحر لجّی ماءه اجاج؛ نسیمه احرّ من السموم؞ ونعیمه اضرّ من السموم؛ غذاءه امرّ من طعوم العلاقم؞ وماءه اضر من سموم الاراقم؛ سماءه غمام یمطر الغموم؞ وسحابه الهموم یفیض الهموم؛ وارضه کالجدری والحصبة حصباء؞ وریحه من النکبة نکباء؛ کل بیت فیه من الخشاش والقصب؞ مملوّ من الوصب والنصب؛ لا یزال سقفه یکف؞ قطره کدمع عینی لا تقف؛ لا یزال تعفّن فیه الهواء؞ فجمّت فیه الادواء؞ وهانت [illegible]؛ وعزّ الدواء؞ وشاعت فیه الاوباء؞ وعمّت فیه [illegible]

مستحق بن گیا۔

یہ المناک کہانی یوں ختم ہوئی۔ اب میرا ماجرا سنئے۔ مکر و تلبیس سے نصاریٰ نے جب مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے، اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہونچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے، اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم و بہتر بستر چھین کر، خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیئے گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈالدی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی۔ اور گرم پانی پلایا۔ محبانِ مخلص کے آبِ محبت کے بجائے گرم پانی اور ناتوانی و کبر سنی کے باوجود ذلت و رسوائی سے ہر وقت سامنا رہا۔

پھر ترش رو، دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا۔ جہاں سحر رنج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا۔ اس میں دشوار گذار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنھیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ سقر تھی۔ اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا، اس کا بادل رنج و غم برسانے والا، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں اور اس کی ہوا ذلت و خواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جسمیں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں۔ ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی۔ مرض سستا اور دوا گراں، بیماریاں بے شمار، خارش و قوبا، (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے)

ما فيه التئام لكليم ؞ ولا سلامة لسليم ؞ ولا علاج لسقيم ؛ ومن يداوى فيه يدوى ؞ ومن يداوٰى فيه يودى ؛ ومن اسى اساء، و زاد فى الاسىٰ ؞ ومن اسِىَ لا يوسىٰ، عليه ولا يواسىٰ ؞ وما من كرب فى الدنيا يقاس على كرب ههنا يقاسى ؛ ما فيه سقام ؞ الا وهو داء عقام ؞ فالحمّى فيه مقدمة الحِمام ؞ و عموم علة السرسام والبرسام ؞ علة تامة للسّام ؛ وكم فيه من مرض وسقم ؞ لا يوجد منه اسم ورسم ؞ من كتب الطب فى رقم ؛ والسّاعور يسعر حشا المرضى كالساعور والنطيس ؞ لا يحمى المريض ولكن يحمِى عليه قبّة الوطيس ؛ فهو لا يعرف مرضا ؞ ويسقى المريض ما يصير به حرضا ؞ واذا مات فيه احد من الناس ؞ جرّ رجله احد من الانجاس الادناس ؞ هو كناس ؞ كانّه شيطان خناس او نسناس ؞ فيواريه بعد نزع ماله من اللباس ؛ فى كثيب من رمل ؞ بلا تكفين وغسل ؛ فلا يحفر له لحد ؞ ولا يصلّى عليه احد ؛

هٰذا ولو لا للميّت فيه هذه الحالة الدَّنيّة ؞ لكانت فيه المنيّه، هى الامنيه ؛ وكان فجاءة الاجل ؞ هى الامل لاجل ؛ وكان المنا ؞ اقصى المنى ؞ ولو لم يكن قتل المرءُ نفسه فى الدين محظورا ؞ وعذاب يوم الدين فيه محذورا ؞ لم يرهق من جيءُ به ههنا ماسورا معسورا ؞ وكان النجاء مما ابتلى به ميسورا ؛ هٰذا و قد ابتليت فيه باعراض عديدة ؞ وامراض شديدة ؛ وقد عيل بها صبرى ؞ وضاق بها صدرى ؞ وامتحق بدرى ؞ وهان قدرى ؛ و كيف الخلاص والمناص ؞ عما شجانى فاعتاص ؛ لا ادرى و بليت مع ما اقاسى من الكرب ؞ بشدة الهتواء والجرب ؛

عام تھی۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقائے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔ بعلاج، مرض میں اضافہ کرنے والا معالج، ہلاک کرنے والا طبیب، تکلیف و رنج بڑھانے والا تھا۔ رنجیدہ کی نہ غمخواری ہی کی جاتی نہ اس پر رنج و افسوس کا ہی اظہار ہوتا۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی المناک مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جا سکتی یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔ بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام و نشان نہیں۔ نصرانی ماہر طبیب، مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے اوپر بناتا ہے۔ مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منھ کے قریب پہونچا دیتا ہے۔ جب کوئی ان میں سے مر جاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطانِ خناس [illegible] ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل و کفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

یہ کیسی عبرتناک و الم انگیز کہانی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا تو اس جزیرہ میں مر جانا سب سے بڑی آرزو ہوتی۔ اور اچانک موت سب سے زیادہ تسلی بخش تھی۔ اور اگر مسلمان کی خودکشی مذہب میں ممنوع اور قیامت کے دن عذاب و عقاب کا باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں مقید و مجبور بنا کر تکلیف مالایطاق نہ دیا جا سکتا۔ اور مصیبت سے نجات پا لینا بڑا آسان ہوتا۔

یہ ناقابل برداشت حالات تھے ہی کہ میں متعدد و سخت امراض میں مبتلا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے میرا صبر مغلوب، میرا سینہ تنگ، میرا چاند دھندلا، اور میری عزت ذلت سے بدل گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اس دشوار و سخت رنج و غم سے کیونکر چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش و قوباء میں ابتلاء اس پر مستزاد ہے

اغدو واروح ؞ وجثماني كلّه مصاب بقروح ؞ تربو عليّ كلوم و جروح ؞ مع ما لي من اوجاع تحلّل الروح ؞ يكاد يفضي بي البثور الى الثبور والبور ؞ بعد ما عِشتُ عمرا في عافية وحبور ؞ ورفاهة وحبور ؞ قد كنت قبل مبشورا ؞ والآن صرت مبثورا ؞ بل مثبورا ؞ وكنت زمناً سليما فرحانا ؞ واليوم صرت زمنا كليماً قرحانا ؞ اعاني شدائد مصائبا ؞ واكافح من صعائب عصائبا

شعر
حملنا من الايام ما لا نطيقه
كما حمل العظم الكسير العصائبا

ومع ذلك كله ؞ احمد الله سبحانه واشكره على منّه وفضله ؞ فانّي ارى غيري من الاسرى مثقلا باغلال ؞ مبتلى باعلال ؞ يساق في اقياد ؞ ويقتاد بقياد ؞ يسوقه ويقوده غليظ شديد حديد ؞ في قيود من حديد ؞ يسومه كل مهنة ومحنة ؞ ويبدي له كل حِقد واحنة ؞ ويزيده اوجاعا على اوجاع ؞ ولا يرقى له اذا تعطّش وجاع ؞ فاحمد الله ربي على المعافاة ؞ من هذه الآفات ؞ واشكره على ما له من المِنَن ؞ وصيانته اياي من هذه المحنة واني وان استيئست نظرا الى ظاهر الاسباب من نجاتي ؞ وقطعت رجائي ؞ فانّ اعدائي يجدّون في ايذائي ؞ ويبغون بما يبغون ايذائي ؞ وادوائي لا يستطيعون مداواة دائي ؞ وقد رسخت في قلوب العدى منّي اضغان وحقائد ؞ كما ترسخ في القلوب من الاديان عقائد ؞

وقد شحنت صدورهم الوخيمة ؞ بالشحناء والسخيمة لكنّي ارجو رحمة ربّي العزيز الرّحيم ؞ البرّ الرؤف

صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے روح کو تحلیل کر دینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچا دیں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عیش و مسرت، راحت و عافیت میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ اب محبوس و قریب ہلاکت ہوں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب محسودِ خلائق غنی، اور صحیح و سالم تھا، اب اپاہج اور زخمی ہوں۔ بڑی سخت مصیبتیں اور بیسیوں صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی ہیں ؎

ٹوٹی ہوئی ہڈی جس طرح لکڑی اور پٹی کا بوجھ اٹھاتی ہے اسی طرح
ہم بھی ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔

ان تمام مصائب کے باوجود اللہ کے فضل و احسان کا شکر گذار ہوں کیونکہ اپنی آنکھوں سے دوسرے قیدیوں کو بیمار ہوتے ہوئے بھی بیڑیاں پہنے ہوئے زنجیروں میں کھنچے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ انھیں لوہے کی بیڑیوں اور زنجیروں میں ایک سخت، تیز اور غلیظ انسان کھینچتا ہے۔ محنت و ہنت، کینہ و عداوت کا پورا مظاہرہ کرتا ہے۔ تکلیفوں پر تکلیفیں پہنچاتا اور بھوکے پیاسے پر بھی رحم نہیں کھاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان آفات و تکالیف سے محفوظ رکھا۔ میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں۔ میرے دوست میرے مرض کے مداوا سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہو گیا ہے۔ ان کے پلید سینے کینہ و عداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔

ان ظاہر اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی نجات سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں۔ لیکن اپنے رب عزیز و رحیم، رؤف و

الكريم ؛ الذی ينجي الضعفاء العاجزين من الفراعنة الجبابرة ؛ و يلئم جروح المظلومين المكلومين بمراهم مراحم الجابرة ؛ فهو الجبار على كل جبير ؛ وهو الجبار لكل كسير ؛ وهو الجبار لكل فقير وخير ؛ وهو المنجي للمرتجی الاسير ؛ وهو الميسر لكل عسير ؛ وهو الذی نجّى نوحًا من الغرق ؛ وابراهيم من الحرق ؛ وايّوب ممّا مسّه واصاب ؛ من الضرّ والاوصاب ؛ ويونس من بطن النّون ؛ وبنی اسرائيل ممّا كانوا يعانون ؛ وكفى موسى وهارون فرعون وهامان وقارون ؛ وكفى المسيح ما مكر الماكرون ؛ وكفى حبيبه المصطفیٰ ما كان يمكر به الكافرون ؛ فان رمقني صعوب ولحقني خطوب ؛ ومحقني كروب ؛ وحاقت بي ذنوب ؛ فلست بفضله بمبتئس ؛ ولا من رحمته بمتأس ؛ فربّي هو الشافي والكافي ؛ والمعافي والعافي ؛ فكم ضرير يكون على شفا ؛ اذا دعاه شفى ؛ وكم معتذر اذا اعتذر اليه واستغفره عذره وعفا ؛ وكم كريب اذا ناداه كشف كربه ؛ وكم غريب اذا ناجاه اسعف اربه ؛ وكم مسجون يشدّ عليه الوثاق ؛ يمنّ عليه الربّ الخلّاق ؛ على الاطلاق بالتخليص والاطلاق ؛ عن الحبس والاصفاد ؛ من دون مانّ ولا فاد ؛ وانا مظلوم مهضوم مضطر ؛ ومسكين مستكين معتر ؛ ادعوه مناجيا ؛ وابتهل اليه راجيا ؛ واناديه متضرّعا ؛ بحبيبه اليه متذرّعا ؛ وقد وعد ولا يخلف وعده باجابة المضطرّ وكشف السوء عنه اذا دعاه ؛ واعانة المظلوم اذا استصرخه وناداه ؛ فهو ينجيني ؛ عمّا يشجيني ؛ ويطلقني ؛ عمّا يقلقني ؛ ويشكيني ؛ عمّا يشكيني ؛

کریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ وہی تو جابر فرعونوں سے عاجز ضعیفوں کو نجات دلاتا ہے۔ اور وہی تو زخمی مظلومین کے زخموں کو اپنے رحم و کرم کے مرہم سے بھرتا ہے۔ وہ ہر سرکش کے لئے جبار و قہار ہے۔ ہر ٹوٹتے ہوئے دل کا جوڑنے والا، ہر نقصان رسیدہ فقیر کا کامیاب بنانے والا اور ہر دشوار کو آسان کرنے والا ہے۔

اسی نے نوح (علیہ السلام) کو غرق اور ابراہیم (علیہ السلام) کو طیش و حرق، ایوب (علیہ السلام) کو مرض و مصائب، یونس (علیہ السلام) کو شکم ماہی، اور بنی اسرائیل کو بربادی و تباہی سے نجات دی۔ اسی نے موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کو ہامان و فرعون، قارون اور عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کو مکرِ ماکرین، اور اپنے حبیب مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دجل و فریبِ کفار پر غالب کیا پھر اگر مجھے مشقتوں، صعوبتوں اور حوادث و معاصی نے گھیر لیا ہے، تو اس کی رحمت و فضل سے کیوں مایوس ہوں۔ وہی میرا رب، شافی و کافی اور خطا پوش و آمرزگار ہے۔ بہت بیمار جو موت کے کنارے پر پہنچ کر بھی اسے یاد کرتے ہیں شفا پاتے ہیں۔ بہت خطا کار جب استغدار و استغفار کرتے ہیں، مقبول بارگاہ ہوتے ہیں۔ بہت دردمند جب اسے پکارتے ہیں مصیبت سے نجات پلتے ہیں۔ بہت مسافر جب اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں، مراد کو پہنچتے ہیں۔ بہت قیدی جو زنجیروں میں جکڑے ہوتے ہیں خلاقِ مطلق انھیں بیڑیوں اور قیدوں سے بلا فدیہ و احسان چھٹکارا دلاتا ہے میں بھی مظلوم و دل شکستہ و مضطر اور مسکین و ذلیل و محتاج بن کر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں۔ اس کے حبیب کو وسیلہ بنا کر اور امیدوار رحمت ہو کر اس کی بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اس نے مظلوم و مضطر کے یاد کرنے پر اجابتِ دعوت اور کشفِ مصیبت کا وعدہ کیا ہے۔ وہی مجھے تکلیف سے نجات دے گا۔ وہی قلق و اضطراب سے آزاد کرے

ویبرئنی؛ عما یبرینی؛ وینقذنی؛ عمن یاخذنی؛ ویسلّنی؛ عمن یظلمنی؛ ویرحم علی عویلی وبکائی؛ ویشفینی عن اشتکائی وشکائی ویمحو شأمتی وشقائی؛ انہ سامع الدعاء؛ واسع العطاء؛ دافع البلاء؛ فھو الذی ارجوہ لجلاء حزن الجلاء؛ وابلاء حسن البلاء من الآلاء؛ یاربّ فانجنی مما انا فیہ، یا معوّل المرتجین؛ یا موئل الملتجین؛ اٰمین بحرمۃ حبیبک الاٰمان الامین؛ وآلہ المیامین؛ وصحبہ المحامین؛ یا ارحم الراحمین؛ یا احکم الحاکمین؛ المنتقم للمظلومین من الظالمین؛ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین؛

ھذا، وقد وصفت[لہ] بعض ما نابنی؛ ونبذا مما اصابنی؛ فی قصیدتین احدھما ھمزیۃ، تحکی ھمزات الشیاطین؛ والاخری دالیۃ، دالۃ علی ما یعانی ھذا الحزین الزمین؛ وختمتھا بمدح سید المرسلین؛ الرسول المکین الامین؛ علیہ ازکی صلوات المصلّین؛ وتسلیمات المسلمین؛

وکنت قد نظمت قبل قصیدۃً فی قوافی النون؛ فریدۃً کالدرّ المکنون؛ کل بیت منھا بیت القصید؛ بل بیت مُشید؛ عدد ابیاتھا ثلث مأتۃ، او یزید؛ لم یتیسّر لی اتمامھا؛ وعاقنی ھجوم البلایا وارتکامھا؛ مطلعھا: شعر

ما ناح اورق فی اوراق اشجان
الّا وھیّج اشجانی واشجانی

فان منّ علیّ ربی الخلاق؛ بالتخلیص والاطلاق؛ ذیّلتھا بحسن التخلّص بمدح من خص من مکارم الاخلاق؛ باوفی خلاق؛ علیہ وعلی آلہ اطوق الصلوات الی یوم التلاق؛ واللہ سبحانہ ولی التوفیق والاحقاق؛

[لہ] وفی بعض النسخ وضعت ۱۲

گا۔ وہی امراض سے شفا بخشے گا۔ وہی پکڑنے والے سے چھڑائے گا۔ وہی ظالم سے بچائے گا۔ وہی میرے گریہ وبکا پر رحم کرے گا، وہی میری بدبختی وشامت کو مٹائے گا۔ وہ دعا کا سننے والا، بہت دینے والا اور بلاؤں کا دفع کرنے والا ہے۔ اسی سے جلاوطنی کے غم کو دور اور بہترین نعمتوں کے عطا کرنے کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اے میرے رب! مصیبتوں سے مجھے نجات دے۔ اے امیدواروں کے امیدگاہ اور اے التجا کرنے والوں کے پناہ گاہ، اپنے حبیب امین، اس کی آل طاہرین ومبارکین اور اس کے صحابہ محافظینِ دین کے صدقے میں ہماری سُن لے۔ اے ارحم الراحمین اور اے احکم الحاکمین! تو ہی ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے۔ بیشک ساری تعریفیں، سارے جہاں کے پالنے والے کے لئے ہیں۔

یہ پُر درد والم انگیز کہانی ختم ہوئی۔ میں نے اپنی مصیبت وپریشانی کا کچھ حال دو قصیدوں میں بھی لکھا ہے۔ ایک قصیدہ ہمزیہ ہے جس میں شیطانی وساوس کا ذکر ہے۔ اور دوسرا دالیہ ہے جسمیں اس غمگین ومعذور کی تکلیف ورنج کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں قصیدوں کو سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدح پر ختم کیا ہے۔ ان دونوں میں سے پہلے نونؔ کے قوافی میں بھی قصیدہ لکھا تھا۔ جو درِّ یتیم کی طرح فرید ویگانہ ہے۔ اس کا ہر شعر مضبوط ومرتفع قصر کی طرح ہے۔ اس کے تین سو سے کچھ زیادہ اشعار ہو کر رہ گئے۔ اس کے اتمام کی نوبت نہیں آئی۔ مصائب وآلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا۔ اس کا مطلع یہ ہے:۔

مَاناحَ اَوْرَقُ فی اَوْراقِ اشجانٖ اِلّاوَ هَيَّجَ اَشجانی و اَشجانی

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے احسان فرمایا تو اس ذات کی مدح اس میں شامل کر کے ختم کروں گا جسے مکارم اخلاق سے پورا پورا حصّہ ملا ہے۔ اس پر اور اس کی آل پر قیامت تک صلوٰۃ وسلام واللہ سبحانہ ولیّ التوفیق والاکرام۔

بسم الله الرحمٰن الرحيم

۱ - لِجَوًى لهُ بِجَوانِحي إِيراءُ   جَمَدَ الدُّموعُ وذابَتِ الأحشاءُ
۲ - ولِمَا أَلَمَّ منَ النَّوائبِ والنَّوىٰ   يَبكي الصَّديقُ ويَشمَتُ الأعداءُ
۳ - قد كنتُ في عِزٍّ وجاهٍ كانَ لي   أَعيانِ أَعيانٍ بهِ اِقتداءُ
۴ - أَمسىَ الصَّديقُ على أَسايَ حارِنْ   حَوِرَىْ وفي أَسوىٰ أَساءَ اِساءُ
۵ - شَمِتَ العِدىٰ إِذْ حالَ حالي فاعترىٰ   ما شاءَني المشّاءُ والوشّاءُ
۶ - أَلَمٌ أَلَمَّ بنا وهَمٌّ هَمَّنا   وَنَوًى لَنا منها بِلًى وَبَلاءُ
۷ - حَلَّتْ عِظامُ مَصائبٍ جَلَّتْ بها   وَهَنَ العِظامُ ودَقَّتِ الأعضاءُ
۸ - إِنّي بَلاني خُدعةُ امرأةٍ[له] بَلىٰ   كيدٌ عظيمٌ ما تَكيدُ نِساءُ
۹ - يَحلِفْنَ حَلْفًا بالمَواثِقِ ثُمَّ لا   لِعُهودِهِنَّ وعَهدِهِنَّ وَفاءُ
۱۰ - خَدَعَتْ بأنْ قَدْ شَهَّرَتْ أَنْ آمَنَتْ   قومًا نَبَتْ بِهِمُ الدِّيارُ ونَاءُوا
۱۱ - إِذْ غَرَّهُمْ ميثاقُها رَجَعوا إِلىٰ   أَوطانِهِمْ مُستَبشِرينَ وفاءُوا
۱۲ - فَأَتَيتُ داري آمنًا إِذْ غَرَّني   أَيمانُ كافرةٍ لها استيلاءُ
۱۳ - ثُمَّ اعتدىٰ عُمّالُها إِذْ ما رَعَوا   ميثاقَها فأتانيَ استدعاءُ
۱۴ - مِنهُمْ فَعَنَّوني فعَنَّوني كأَنْ   لم يُوفِ فيما عاهَدَتْ إِيفاءُ
۱۵ - لمّا عَنَوْتُ وما عَنَوْتُ لَهُمْ رَبَتْ   مِنْ ظُلمِهِمْ بي مِحنَةٌ وعَناءُ
۱۶ - إِذْ كنتُ في عَيشٍ رَغيدٍ رابغٍ،   هَجَمَ الكُروبُ فجاءَتْ أَرزاءُ
۱۷ - شَحَنَ الحُقودُ صدورَهم حتّى بَدَتْ   بالضِّغنِ من أَفواهِهِم بغضاءُ
۱۸ - قد ضَيَّقوا عيشي عليَّ فعِفتُهُ   ونَسِيتُ عيشًا كانَ فيهِ رَخاءُ
۱۹ - يومي وليلي في اشتِدادِ حرارةٍ   وَدُجًى هُمَا الباحورُ واللَّاداءُ

[له] ملكة الافرنج ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱ سوز دل سے میرے پہلو کی ہڈیوں میں آگ بھڑک رہی ہے، آنسو خشک اور اندرونی اعضا پگھل گئے ہیں

۲ مجھ پر نازل شدہ مصیبتوں اور میری اہل وطن سے دوری پر دوست روتے اور دشمن خوش ہوتے ہیں

۳ میں عزت و عظمت کی زندگی بسر کر رہا تھا جو شرفاء و عظماء کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔

۴ میرے درد و غم اور تباہی و ہلاکت پر دوست غمگین و حیران ہیں اور چارہ گروں نے تیمار داری میں برا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے

۵ میرے اس تغیر حال پر چغلخوروں کی خبر رسانی اور مخبروں کی ریشہ دوانی پر دشمن خوشیاں منا رہے ہیں۔

۶ رنج نازل، اور غم ہم پر طاری ہو گیا۔ اور ہماری دوری میں تنگی و سختی ہے۔

۷ بڑی بڑی مصیبتوں نے گھیر لیا جنکی وجہ سے ہڈیاں کمزور، اور اعضا ریزہ ریزہ ہو گئے

۸ مجھے ایک عورت[1] کے مکر نے مبتلائے مصائب کر دیا۔ عورتوں کا مکر بڑا ہی زبردست مکر ہے

۹ یہ عہد و پیمان کر کے مخلوق کو فریفتہ بنا لیتی ہیں پھر ان کے عہد و میثاق کو وفا و قرار نہیں ہے

۱۰ اس نے یہ کہہ کر شہرت دی کہ جو لوگ گھر سے دور پڑے ہیں انھیں امن دے دیا گیا

۱۱ ایسے لوگ اس کے اعلانِ امان سے دھوکے میں آ کر اپنے گھروں کو خوش خوش واپس ہو گئے

۱۲ میں بھی کافرہ متسلطہ کے اعلانِ امان سے فریب کھا کر مکان پہنچ گیا۔

۱۳ پھر تو حکام سلطنت نے اس کے عہد و میثاق کی پروا نہ کرتے ہوئے سختی شروع کی۔ اور میری بھی طلبی ہوئی

۱۴ انھوں نے مجھے روک لیا اور خوب اذیتیں پہنچائیں گویا کہ اس عہد ملکہ میں ایفاء عہد کی نیت بھی نہ کی گئی تھی

۱۵ جب میں قیدی بن کر بھی ان کا اطاعت گذار نہ بنا تو ان کی طرف سے رنج و تکلیف میں اور بھی زیادتی کر دی گئی

۱۶ میں خوشگوار عیش و عشرت میں تھا، پھر غموں کا ہجوم اور مصائب کا ناگہانی ورود ہوا۔

۱۷ ان کے سینوں کو کینوں نے بھر دیا۔ ان کی زبانوں پر بھی بغض کی وجہ سے دشمنی ظاہر ہونے لگی۔

۱۸ انھوں نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ میں اس زندگی سے دل برداشتہ ہو گیا۔
اور اس پر مسرت زمانہ کو بھول گیا۔ جس میں آسانی تھی۔

۱۹ میرے رات، دن سخت گرمی اور اندھیرے میں گذرتے ہیں گویا کہ سخت موسم گرما کے دن اور آخر ماہ کی اندھیری راتیں ہیں

---

[1] ملکہ وکٹوریہ ۱۲

۲۰ فاللیلُ ساجٍ ما لَہ صبحٌ و لا   لليوم عَوضُ عشیۃٌ و مَساءُ
۲۱ حَجَرٌ واعلىّ واَسکنونى حُجرۃً   لمیاتها غیر السَّموم هَوَاء
۲۲ یا ویلها مِن حجرۃ جُدُرَانُها   تَشْوِى الشَّوٰى وتُرابها رَمضَاء
۲۳ یا ویلَ سجنٍ لا مُبالَ بساحِہٖ   وکنیفُہٗ ما فیہ قطّ خَلاء
۲۴ منعوا اَشَدَّ المنعِ اَن یلقانىَ الْ .....   اَحْبابُ الاِخْوانُ و الاَبناء
۲۵ وسُلِبتُ اثوابى و بَعدَ تجرّدى   لِلُبس اُعطى مِیزَرٌ و کِسَاء
۲۶ سَلَبُوا الکُسٰى لَبِسوا علىّ کِسارهم   مالى سوى ذاك الرَّدِىّ رِداء
۲۷ سلبوا الاوانىَ والنعالَ بظلمهم   لم یبقَ عندىَ قَصعۃٌ و اِناء
۲۸ مالى حَفىٌّ فى حَفاىَ وکانَ لى
مِن قبلِ لُبسى للکِساء کِساءُ
۲۹ کم من صفىّ بى حفىّ مخلص   فى الود منہ محوضۃ و صفاء
۳۰ صُدّوا فصدّوا عن محاورتى فلم   یمکنْ مزاورۃٌ لهم ولقاء
۳۱ لو شاهدونى حافیا لاَسترجعوا   ولکانَ منهم فى حَفاىَ حِفاءُ
۳۲ لم یترکوا فى السجن عندى خادما   لیزید فى ایذائهم ایذاء
۳۳ امسى واصبح مقلقا مالى سوا   شوك القتاد او القتاد وطاء
۳۴ یعدو علىّ سَوادُ بیضانٍ عِدٰى   صُهُبِ الشواربِ شُربُهم صَهباءُ
۳۵ سُودُ الکُبودِ وجوهُهم بیضٌ لهم   فى الجِلد لینٌ فى القلوب قَساء
۳۶ نُکُدٌ وِقاحٌ ما لهم عارٌ و لا   غارٌ و لا حِلم و لا استحیاء
۳۷ لُدٌّ غِلاظٌ لیس فیهم رِقّۃٌ   وحمایۃ وحَمِیّۃ و اِباء
۳۸ جُمِعَ المعائبُ کلُّها فیهم ففى   الذکرانِ بَغىٌ فى الاناث بِغاء
۳۹ بمذالهم وبغارهنّ وبغیهم
کثُرَ الفسوقُ و شاعتِ الفحشاء

۲۰ رات تو دوامی شکل اختیار کر چکی ہے جسکی صبح نہیں ہے اور نہ دن کیلئے شام اور رات ہی ہے۔

۲۱ مجھے سب تصرفات سے روک کر ایک کوٹھری میں ٹھہرا دیا جسمیں زہریلی ہوا کے سوا اور کسی قسم کی ہوا نہ پہنچ سکتی تھی

۲۲ کیسی مصیبت تھی اس کوٹھری کی دیواریں انسانی اعضاء کو بھونتی تھیں اور اسکی بھی تپتی ہوئی زمین تھی۔

۲۳ کیسا پریشان کن قید خانہ تھا، نہ تو اس کے میدان میں پیشاب خانہ تھا نہ اسکے پاخانہ میں آب دستخانہ تھا

۲۴ انھوں نے سختی کے ساتھ، دوستوں، بھائیوں اور بیٹوں کو مجھ سے ملنے سے روک دیا۔

۲۵ میرے کپڑے چھین کر، مجھے تہبند اور کملی پہننے کے لئے دے دی گئی

۲۶ کپڑے اتار کر قیدیوں کی کملی پہنادی، میرے پاس اس خراب کملی کے سوا کوئی دوسری چادر نہ رہی

۲۷ میرے برتن اور جوتے بھی ظلماً چھین لئے میرے استعمال کیلئے کوئی برتن اور پیالہ بھی باقی نہ چھوڑا

۲۸ میرے ننگے پاؤں رہنے پر کوئی مہربانی سے پوچھنے والا بھی نظر نہ آیا۔ حالانکہ اس کملی
اوڑھنے سے قبل مجھے مجد و شرف حاصل تھا

۲۹ میرے بہت سے مہربان، مخلص اور صاف دل دوست جنکی محبت، صدق و صفا پر مشتمل تھی

۳۰ انھیں روک دیا گیا وہ میری ملاقات، بات چیت اور زیارت سے مجبوراً محروم ہیں

۳۱ وہ مجھے ننگے پاؤں دیکھتے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے اور میری برہنہ پائی پر ان سے جھگڑا کر بیٹھتے۔

۳۲ قید خانے میں میرے پاس کوئی خادم بھی، ایذا رسانی کے ازدیاد کی وجہ سے نہ چھوڑا۔

۳۳ صبح و شام بےچینی سے گذرتے ہیں، کانٹے اور چنگاریاں، بستر کے بجائے مقرر ہو چکی ہیں۔

۳۴ بہت سفید رنگ، شرابخوار، اور میگوں مونچھوں والے دشمن مجھ پر ظلم و بیداد کرتے ہیں۔

۳۵ وہ سیاہ جگر، سفید فام، نرم جلد اور سخت قلب واقع ہوئے ہیں۔

۳۶ وہ بدبخت و بےشرم ہیں انھیں ننگ و عار ہے نہ غیرت و حلم و حیا ان کے پاس ہو کر گذری ہے۔

۳۷ بڑے جھگڑالو اور سخت دل ہیں، ان میں نرمی اور مادہ حمایت و حمیت نام کو نہیں۔

۳۸ سارے عیوب ان میں موجود ہیں، مردوں میں سرکشی اور عورتوں میں حرام کاری پائی جاتی ہے

۳۹ ان سب کی بدمعاشیاں، مردوں کی سرکشیاں، عورتوں کی حرام کاریاں، فسق و فجور کی
اشاعت و کثرت کا سبب بنی ہوئی ہیں۔

۴۰ لم یکتفوا ظلما بحبس بین ربا   فوق احتباس غربة وجلاء
۴۱ اَسَروا واَسَروُنی اِلی جبل به   قد باد من اِسرائهم اُسراء
۴۲ جبل احاطت ابحرٌ بشعابه   ماحوله غیر الفناء فناء
۴۳ مستوبل حاقَ الوبال لکل من   یاتیه اذ عمّت به الاوباء
۴۴ ذَلّ الاعزّة فیه وَاعتلوُّا وَقَلَّ   عَزّ الدواء وشاعتِ الادواء
۴۵ عَمّ العقابَ عقابُه وفشا الوذی   یُرجی الدّوی فیها دوی ودواء

۴۶ ما ساغ ماء فیه للصادی ولم   یهنأ بطاءٍ فیه قطّ غذاء
۴۷ اَلاُکُلُ زِنٌّ ماهنا لحم ولا   بَصل ولا بَقل ولا قثّاء
۴۸ هو شطّ بحرٍ ماهنا بَرّ و لا   بِرّ و لا بُرّ و لا حَلواء
۴۹ قد مات اَحیاء من الاُسراء والباقون لا موتی و لا اَحیاء
۵۰ مافیه لموتی صلٰوةٌ جنازةٍ   وثری ولا کفنٌ لهم وغطاء
۵۱ مافیه من عارٍ علی عارٍ و لا   للمعتری المعترِ فیه حیاء
۵۲ هو بِرّة سوداء مَن یثوی بها   غَلَبَتْ علیه مرّة الصفراء
۵۳ شقّوا علیٰ اُسرائهم فاصابهم   بالاسر من ایذائهم ایذاء
۵۴ قد اُوثقت من غِلّهم وغَلیلهم
اَغلالهم فدَهاهمُ الاِعیاء
۵۵ اَوُدتْ بهم محنٌ وباْسٌ سامَهم   اَحراسهم والبوسُ والباساء
۵۶ وغلیلُهم حزنا وغُلّتهُم علی   جوعٍ وقلّة غلّةٍ وغَلاء
۵۷ ولقد اَحلّونی بمهلکةٍ بها   لا الارضُ ارض لا السّماء سماء
۵۸ فسمائُها الدنیا غمامٌ صَوبُها   سَیلُ الغموم وارضها حَصباء
۵۹ لاغیث فیها انما من حرّها   من جوّها یتصبّب الرُحَضاء
۶۰ عَمَّ السموات الغمامُ فلا یُری   لیلا ویوما نیّرٌ و ذُکاء

۴۰ ظلم وستم کیلئے میری قید ہی کافی نہ سمجھی بلکہ جلاوطنی! در غربت و مسافرت کی سزا بھی دی۔
۴۱ قید کر کے مجھے ایسے پہاڑ پر رات میں دھرے گئے جہاں پہنچ کر قیدی ہلاک ہو چکے ہیں
۴۲ اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو دریا گھیرے ہوئے ہیں۔ موت کے سوا اس کا کوئی صحن نہیں۔
۴۳ یہاں کی آب وہوا ناموافق اور آنے والے کے لئے وبال ہے۔ وبائیں ہر طرف عام ہیں۔
۴۴ یہاں شریف و عزیز، ذلیل و گریہ کناں ہیں، دوا ناپید اور بیماریاں بیشمار ہیں۔
۴۵ اس کی گھاٹیوں میں عقوبت و ہلاکت عام ہے۔ اس میں دوا، دارو بھی بیماری
میں اضافہ کرتی ہے۔
۴۶ اس میں نہ تو پیاسے کے حلق سے پانی اترتا ہے اور نہ بھوکے کو غذا ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔
۴۷ ماش کی دال غذا ہے، گوشت، پیاز، ترکاری، ککڑی کچھ میسر نہیں
۴۸ وہ دریا کا کنارا ہے جہاں میدان، نہر پانی، گیہوں اور شیرینی کسی چیز کا پتا نہیں۔
۴۹ قیدیوں کے گروہ کے گروہ مر چکے جو بچے ہوئے ہیں وہ نہ مردوں میں ہیں نہ زندوں میں
۵۰ میت کی نماز جنازہ، قبر، کفن اور پوشش کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔
۵۱ یہاں ننگے کے لئے کوئی عار اور طالب احسان محتاج کے لئے سوال کی حیا نہیں۔
۵۲ وہ ایسی خراب جگہ ہے جہاں طاقتور انسان پر بھی رہنے کے بعد زرد پتوں کا غلبہ ہوتا ہے
۵۳ قیدیوں کو ایسی مشقت میں مبتلا کیا گیا کہ ان کی ایذا ہلاکت کے درجہ تک پہنچ گئی۔
۵۴ ان کے کینوں کی وجہ سے قیدیوں کی بیڑیاں مضبوط ہو گئیں۔ اور تھکن نے دشواری
میں ڈال دیا۔
۵۵ بلاؤں اور سختیوں نے انھیں ہلاک کیا اور چوکیداروں اور مصیبتوں نے رنج میں مبتلا کر دیا۔
۵۶ ان کی غم انگیز تشنگی اور بھوک پر پیاس، قلت غلہ و گرانی نے بھی مبتلائے مصیبت کر دیا۔
۵۷ انھوں نے مجھے ایسے مہلکہ میں ڈال دیا جہاں زمین، زمین ہے نہ آسمان، آسمان۔
۵۸ اس کا قریبی آسمان وہ بادل ہیں جن کی بارش غموں کا سیلاب ہے اور اسکی زمین سنگریزے ہیں۔
۵۹ اسمیں بارش نہیں ہوتی، گرمی کی شدت سے فضاء آسمانی سے بخار کا پسینہ گرنے لگتا ہے
۶۰ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے جسکی وجہ سے دن میں سورج اور رات کو چاند نظر نہیں آتا۔

٦١ فالليل فيها ظلمة في ظلمة   واليوم فيها ليلة ظلماء
٦٢ ما كان فيها قطّ يومٌ شامسٌ   ابدا ولم تك ليلةٌ قمراء
٦٣ أُفقٌ بهيمٌ ما استهلّ هلالهُ   احد ولم ير شمسها حرباء
٦٤ ظلماء قد غشيت بحر مظلم   لا لؤلؤ فيها ولا لألاء
٦٥ لا فصل بين ربيعها وخريفها   لا الصيف صيف لا الشتاء شتاء
٦٦ تيهاء آتيها يتيهُ وللعدى   يزداد فيها التيه والخيلاء
٦٧ هم في غنى وقنى ومال اذ علوا   مالوا على الاسرى فهم فقراء

٦٨ وطريقها سفن تمور فكل من   ركبوا عليها صُدّعوا او قاءُوا
٦٩ وتبلّ امواج تجوش ثيابهم   ووطاءهم وتبلّهم أنداء
٧٠ أُنئيتُ عن وطني واهلي بغتةً   ظلمًا ولي ذرّية ضعفاء
٧١ هم أُخرجوا عن دارهم ظلما فما   سكن واسكان لهم وثواء
٧٢ فتمسكنوا اذ ما لهم سكنى ولا   قوت ولا شيءٌ ولا اشياء
٧٣ وتركتهم غرثى جياعا ما لهم   مال ولا مغنى لهم وغناء
٧٤ قد جانبتهم اقربون تجنّبوا   كما جانب وجفاهم الاكفاء
٧٥ أَلْأَسْرُ أَنأىٰ أُسرتي واقاربي   ما من حميم فيه الا الماء
٧٦ عَمِيَتْ على الأَبناءِ أَنبائي كما   عَمِيَتْ علينا منهمُ الأَنباء
٧٧ ابكي لبعد اقاربي واحبتي   ولهم على فقدي أسًى وبكاء
٧٨ حق البكاء لهم عليّ اذ الردى   والعيشُ في الحبس المدى سواء
٧٩ اسكنت وحشا لا يرى فيه سوى
الوحشين الغربان والغرباء
٨٠ مستوبلا وخما فما بطعامه   شبعٌ ولا في مائه إرواء

۶۱ رات میں تو اندھیرے پر اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ اور دن اندھیری رات کی طرح ہے 〃

۶۲ اس میں سورج کبھی نہیں نکلتا۔ اور نہ چاندنی والی راتیں ہوتی ہیں۔ 〃 〃

۶۳ اس کے سیاہ افق پر کسی نے چاند نکلتا نہیں دیکھا۔ اور نہ گرگٹ ہی سورج دیکھ سکا

۶۴ وہ خود تاریک ہے اور تاریک دریا سے گھرا ہوا ہے۔ اس دریا میں نہ موتی ہے نہ روشنی۔

۶۵ یہاں کی فصل بہار و خزاں میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں نہ گرمی، گرمی ہے۔ نہ جاڑا جاڑا

۶۶ یہاں آنے والا حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ اور دشمن کا کبر و غرور اور بڑھ جاتا ہے

۶۷ وہ تونگری مسرت اور مال و دولت سے ہمکنار تھے متکبر بن کر قیدیوں پر ظلم و ستم ڈھانے لگے تو فقیر بن گئے (گویا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے)

۶۸ اس کا راستہ ہچکولے کھانے والی کشتیوں کے ذریعہ ہے جو بھی ان پر سوار ہوتا ہے درد سر یا متلی میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔

۶۹ اس کی جوش مارتی ہوئی موجیں کپڑوں اور بستروں کو تر کرتی ہیں اور ان کی تری سے مسافر بھیگ جاتے ہیں

۷۰ مجھے ظلماً اہل وطن سے اچانک دور کر دیا گیا مجھے کمزور و نحیف ذریت کو بھی چھوڑنا پڑا۔

۷۱ ان کو زبردستی ان کے مکان سے نکال دیا گیا۔ ان کے لئے آرام و سکون کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔

۷۲ وہ مسکین و فقیر بن گئے کیونکہ مکان، روزی، اور کوئی چیز بھی ان کے لئے نہ رہی 〃 〃 〃

۷۳ میں نے انھیں حالت گرسنگی میں چھوڑا۔ نہ ان کے پاس مال و دولت ہے نہ مسکن و منفعت

۷۴ ان سے اپنے بیگانے بن کر علیحدہ ہو گئے۔ اور بربر والوں نے ظلم و ستم اختیار کیا۔

۷۵ میرے خاندان اور اقارب کو قید و بند نے دور کر دیا۔ اب یہاں پانی کے سوا کوئی دوست نہیں ہے

۷۶ میرے بیٹوں سے میری خبریں ایسی ہی پوشیدہ ہیں، جیسی ان کی مجھ سے 〃 〃 〃 〃

۷۷ میں احباب و اعزہ کی دوری پر روتا ہوں اور وہ میری جدائی پر۔

۷۸ ان کا مجھ پر رونا ایک حد تک ٹھیک بھی ہے کیونکہ مرنا اور ذلیل قید میں زندگی گذارنا دونوں برابر ہیں۔

۷۹ مجھے وحشیوں میں بسا دیا گیا، اس قید خانہ (جزیرے) میں دو قسم کے وحشیوں، کووں، اور اجنبیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

۸۰ اس کی آب و ہوا ناموافق اور وبائی ہے نہ تو اس کے کھانے میں شکم سیری ہے نہ پانی میں سیرابی 〃 〃

۸۱ فالماءآنٍ مابه ریٌّ کما   الماکول زنٌّ ماله استمراء
۸۲ مافیه من عذب یسوغ ولابها   طعم یلذّ ولا هناك فضاء
۸۳ زادت علی کربی عوارض جثتی
الفتق والقولنج والقوباء
۸۴ وجدی لعافیةٍ عفتْ عفتُ لیَ .... النکبات فیه وریحه نکباء
۸۵ کانت لفضل الحق فضل مثالة   منها علی الامثالِ لی اسْتعلاء
۸۶ ووجاهة بین الوجوه وجاهةً   تعنو لها الاعیانُ والرؤساء
۸۷ وبراعة ورفاعة ورفاهة   ونزاهة ونباهة وعلاء
۸۸ وُجدٌ وجدٌّ مُسْعَدٌ مع جدّةٍ
لم تُبلها بلویٰ ولا لاواء
۸۹ وتمامُ عافیةٍ وعِرضٌ زادهٗ   عَرض یزیدُ وعزّة قعساء
۹۰ کم نعمةٍ زالت وکم من نعمة   حالتُ وحلّ الضیّ والضرّاء
۹۱ اَللّٰهُ اَقنانی عُلوْماً یقتنی   مِنها علوماً جَمّةً عُلَماءُ
۹۲ حال النویٰ بینی وبین اَحبّتی   حالاً وحال الحال والنعماء
۹۳ هجم الشرور وفاجئت فِتَنٌ بها   ذَهَبَ السرورُ وولّتِ السرّاء
۹۴ قد سلّط الانصارَ فی اَمصارنا   اَنْ صار اَنصاراً لهم سفهاء
۹۵ لم یعلموا اَنْ لاوفاء لهم ولا   اَنْ لا لهم مندوحة ووقاء
۹۶ مِنْ قبلُ ولاّهم علیها من لها   اذ صدّه عنها غنی وغناء
۹۷ والآن اذ نُصی النصاریٰ اَفرطوا
فی الظلم فاخترم الضعاف جفاء
۹۸ اَقْوی دیارُ کن اهلتکما   اقوی الاولی اقووا وهم اُمراء
۹۹ تفرّقوا ایدی سبا واذا درکت   فرقاً کثیراً اخذة وسباء
۱۰۰ علك الغنیّ وذلّ ذو عزّ کما   هان الخطیر وصغّر الکبراء

۸۱ پانی گرم ہے جس میں سیرابی نہیں۔ جس طرح کہ غذا ماش ہے جس میں مزا نہیں

۸۲ وہاں نہ شیریں پانی ہے نہ لذیذ کھانا، اور نہ وسیع میدان ہی سامنے ہے۔

۸۳ میری مصیبت میں میرے بدن کے عارضوں، قولنج، فتق (فوطوں میں پانی اترنا) اور قوبا (داد)
نے اضافہ کر دیا۔

۸۴ میرا غم والم مٹنے والی عافیت پر ہے اور ایسے مصائب نے مجھے بھی مشائخ میں کر نہیں رکھی اور اس کی ہوا تیز بھی ہے۔

۸۵ فضل حق کے لئے رفعت وبلندی کا فضل تھا! اسی کی وجہ سے مجھے برابر والوں پر سربلندی حاصل تھی

۸۶ شرفا میں قدر و منزلت و وجاہت میسر تھی جن کے سامنے رؤسا و اعیان ملک جھکتے تھے

۸۷ کمال، رفعت، وسعت، نزہت، بزرگی، برتری

۸۸ تونگری قلب، خوش بختی، نصیبہ وری یہ سب نعمتیں حاصل تھیں۔ جنھیں آزمائش و
مصیبت بھی بوسیدہ نہ کر سکی ہے

۸۹ پوری عافیت بڑھتے ہوئے سامان کی بنا پر بڑھتی ہوئی آبرو اور پائدار عزت بھی نصیب تھی

۹۰ بہت سی عیش کی زندگی متغیر اور کتنی نعمتیں زائل ہو گئیں۔ سختی اور بدحالی نازل ہو گئی۔

۹۱ اللہ نے مجھے وہ علوم عطا کئے کہ ان میں سے بہت کچھ علماء نے حاصل کئے۔

۹۲ میرے اور میرے احباب کے درمیان جدائی حائل ہو گئی۔ حالت اور نعمت متغیر ہو گئی۔

۹۳ شرارتیں، گھر آئیں اور فتنے اچانک چھا گئے۔ مسرت جاتی رہی! اور شادمانی و راحت پھر گئی۔

۹۴ نصرانی ہمارے شہروں پر مسلط کر دیئے گئے۔ بیوقوف ہندستانی ان کے مددگار بن گئے

۹۵ وہ اسے نہ سمجھ سکے کہ نہ ان کے پاس وفاداری ہے نہ وسعت و حمایت

۹۶ اس سے قبل ان پر ایسا شخص حکمراں تھا جسے غنا و ثروت اور مال و دولت نے خدمت اہل دیار سے روک دیا تھا

۹۷ اب جب کہ نصاریٰ کی پورے طور پر مدد کی گئی تو وہ ظلم و ستم میں افراط سے کام لینے لگے! اور کمزوروں
کو تو جور و جفا نے جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا۔

۹۸ وہ دیار جو آباد تھا ویران ہو گیا۔ جس طرح کہ امراء و رؤسا تباہ و برباد ہو گئے۔

۹۹ وہ قوم سبا کی طرح متفرق و منتشر ہو گئے! ان کے بہت سے گروہوں کو قید و بند نے آدبایا

۱۰۰ مالدار فقیر، عزیز و شریف ذلیل، عظیم و کریم خوار۔ اور بڑے چھوٹے بن گئے۔

۱۰۱ قتلوا وغالوا اجلّ من اخذوا وهم   ممّا ادّعوا من جرمهم بُرَآء
۱۰۲ غالوا برایاهم برايا غيلةً   فجرت كما انفجر العيون دماء
۱۰۳ كم خرّبوا بلدا ولم يذروا به   بلدا فصار كانه بيداء
۱۰۴ هدّوا المساجد والقصور كانها   لم تبن لم يك ثم قطّ بناء
۱۰۵ بُخِسَتْ بِخِسّتِهِم زروعُ الارض من   شؤم فلا ريعٌ لها ونماء
۱۰۶ قدروا على الناس المعاش فقدرهم   اَن لا غداءُ عندهم وعشاء
۱۰۷ فظهورهم ثقُلت باوزارٍ بما   شَحنتْ بطونَ صدورهم شحناءُ
۱۰۸ افهل لعدوانٍ تعدّى حدّه   حدٌّ وهل للمعتدين جزاء
۱۰۹ لم اَقترِفْ ذنبا سوى اَن ليس لي   مع هؤلاء مودّةٌ وولاء
۱۱۰ فولائهم كفر بنصٍّ محكمٍ   ما فيه للمرءِ المحقّ مِراء
۱۱۱ كيف الولاء وهم اَعادى مَن له
خلقُ السّماء والارضِ والانشاءُ
۱۱۲ هو اوّل النور السنيّ تبلّجت   بضيائه في العالم الاَضواء
۱۱۳ هو اولُ الاَنباء اخرُهم به   خُتِم النبوّةُ وابتداء الاِبداء
۱۱۴ بَدأ به اَبدى المهيمنُ سرّهُ   فلاَجلِه الاِبداءُ والاِيداء
۱۱۵ قد خصّه البارى باوصافٍ عُلىً   لم يُعطها الاَحداثُ والقدماء
۱۱۶ اعطاه فضلا ليس يمكن ان يكو.... ن له شريك فيه او شركاء
۱۱۷ اَسماه اذ اَسماه بالحسنى فمن   اَسمائِ خالقِه له اَسماء
۱۱۸ بَرّ رحيم مِفضَلٌ ذو قوّة
هادٍ رؤف مُحسن مِعطاء
۱۱۹ قد زاد مكّة رفعةً ميلادُه   وتشرّفتْ بوجوده البطحاءُ
۱۲۰ قدْ طابَ طيبةُ اذ ثواها واَعتلتْ
شرفاً يُيمّمُ ساحها البُعداء

۱۰۱ جن کو پکڑ لیا ان کو قتل و ہلاک کیا۔ حالانکہ جو جرم ان پر لگائے گئے تھے ان سے وہ بری تھے

۱۰۲ انھوں نے اپنی بری اور بیگناہ رعایا کو بُری طرح ہلاک کیا۔ خون ایسا بہا جیسے چشمے ابل کر بہتے ہیں۔

۱۰۳ بہت سے شہروں کو برباد و خراب کر کے ان کا نشان تک نہ چھوڑا وہ جنگل اور میدان معلوم ہونے لگے۔

۱۰۴ مسجدوں اور محلوں کو منہدم کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی جگہ کوئی عمارت ہی نہ تھی نہ وہاں کبھی کچھ بنا ہوا تھا۔

۱۰۵ ان کی نحوست و ذلت کی وجہ سے زمین کی پیداوار میں بھی کمی ہو گئی۔ اس میں کوئی نشو و نما باقی نہ رہا۔

۱۰۶ انھوں نے لوگوں پر زندگی تنگ کر دی۔ ان کے لئے رات اور دن کا کھانا بھی نہ رہا۔

۱۰۷ ان کے سینوں میں بھرے ہوئے کینوں کے بوجھ سے ان کی پیٹھیں ثقیل ہو گئیں۔

۱۰۸ کیا حد سے متجاوز سرکشی کی بھی کوئی حد ہے؟ اور کیا سرکشوں کی کوئی سزا بھی ہے

۱۰۹ میں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ ان سے کسی قسم کی محبت و دلچسپی نہیں رکھی۔

۱۱۰ اور بات یہ ہے کہ بنص حکم قرآنی ان کی محبت کفر ہے۔ حق پرست انسان کو اسمیں تردد نہیں ہو سکتا

۱۱۱ ان سے محبت رو کیسے رکھی جا سکتی ہے جب کہ آسمان و زمین جس کی وجہ سے پیدا کئے
گئے اس ذات گرامی کے یہ نصاریٰ دشمن ہیں۔

۱۱۲ وہ پہلا نور ہے جو دنیا میں چمکا۔ اور اس کی روشنی سے سارا عالم منوّر ہوا۔

۱۱۳ وہ اول و آخر پیغمبر ہیں۔ انھیں پر نبوت ختم ہوئی۔ اور انھیں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔

۱۱۴ وہ بہترین سردار ہیں خدا نے اپنا بھید انھیں کے ذریعہ جھلکایا اور انھیں کی وجہ سے آفرینش و ہلاکت ہے

۱۱۵ خدا نے انھیں ایسے بلند اوصاف کے ساتھ مختص کیا جو کسی جدید و قدیم کو نہ بخشے گئے

۱۱۶ انھیں ایسا فضل و علوّ مرتبہ عطا کیا۔ کہ اس میں کوئی بھی ان کا شریک و سہیم نہیں۔

۱۱۷ ان کے اچھے اچھے نام رکھ کر رفیع الشان بنایا۔ خالق کے ناموں میں سے ان کے بھی بہت سے نام ہیں

۱۱۸ نیکوکار، رحم دل، کثیر الفضل، صاحب قوّت، ہادی، نرم خو، محسن، کثیر العطا ان کے
اوصاف و نام ہیں۔

۱۱۹ ان کی پیدائش نے مکہ کی شان دوبالا کر دی۔ اور بطحا نے ان کے وجود سے شرف پایا۔

۱۲۰ ان کے قیام سے طیبہ (مدینہ منورہ) پاک و بلند رتبہ ہوا۔ دور دور سے لوگ اس کی
زیارت کا قصد کر کے آتے ہیں۔

۱۲۱ بَشَرٌ بشيرٌ بَشّرت زُبُرٌ به   مِنْ قبله اَنبا به الأنباءُ
۱۲۲ اَنبا ببعثته المسيحُ و قبله   موسى كما اَنبا به شعياء

۱۲۳ جاءت بنات الملك ساحتَه كما   انبا الزّبور به وهنّ إماءُ
۱۲۴ اَومى الى القمر المنير فشقّه   وابانه شِقّين ذا الايماءُ
۱۲۵ والشمسَ شفت للغروب فاُرتقت   ليكونَ منه للصّلوٰة اداء
۱۲۶ حيّته احجار واشجارٌ وكم   نَطقت له بفصاحةٍ عجماء
۱۲۷ اروى بماء من اصابعه جرى   عطشى فانهلَهم روى ورواء
۱۲۸ كما اشبع الغرثى الكثيرَ بيُمنه   نَزرٌ وكم نال المُقلّ ثراء
۱۲۹ قد حنّ جذع حين فارقه كما   تُبكي المتيّمَ في النّوى البرحاءُ
۱۳۰ امّان امّان يُعلّم حكمةً   قد اُحكمتُ عن دركها الحكماءُ
۱۳۱ حكم تلا ذكرا حكيما اُحكمتْ   آياته فيها هدى وشفاء
۱۳۲ ذكراً احوى حِكما واَحكاما بها   عقل العقول وعيّت العقلاء
۱۳۳ بلغت بلاغته الكمال فافحم   البلغاء منه واعجم الفصحاءُ
۱۳۴ جلّى سواد شرائع منسوخة   بشريعة هي سمحة بيضاء
۱۳۵ فظهور ملتِه محَا مِللاً كما   تمحو الكواكب من ذكاء ذُكاءُ
۱۳۶ يمحو ضياء الشمس نور كواكب   ويطمّ فوق كواكب داماء
۱۳۷ فالله اظهر دينه واَدامه   فله على مرّ الأبود بقاء
۱۳۸ لا غرو ان جحد السّفاه به ومَن   في قلبه داء العنادِ عَياء
۱۳۹ ما ضرّ عينَ الشمس ان جحدتْ به   عينُ الضرير ومقلةٌ عَمياء
۱۴۰ الله اوجب ان ينوّه باسمه   في حين يُرفع للصلوٰة نداء
۱۴۱ ان زاد آدم من بنوّته علىً   فكما اعتلى ببنيهم الآباء
۱۴۲ قد شاء رسل ان يكونوا اُمّة   رسل فما عصى به منهم ما شاؤا

۱۲۱ وہ خوشخبری سنانے والے انسان ہیں، ان سے پہلے صحف آسمانی اور انبیاء کرام ان کی بشارت دیتے آئے۔

۱۲۲ ان کی بعثت کی عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے قبل موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی جیسے کہ شعیا ابن اصیا
نے عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔

۱۲۳ شہزادیاں ان کے دربار میں لونڈیاں بن کر حاضر ہوئیں۔ اسی طرح صحیفہ آسمانی کی پیشن گوئی تھی۔

۱۲۴ چمکنے اور چمکانے والے چاند کو انھوں نے اشارہ سے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو جدا جدا کر دیا۔

۱۲۵ سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ ادائے نماز کے لئے ٹھہر گیا۔

۱۲۶ پتھروں اور درختوں نے انھیں سلام کیا اور بہت سے چوپائے ان سے فصاحت کے ساتھ ہمکلام ہوئے۔

۱۲۷ انگلیوں سے پانی جاری کر کے انھوں نے پیاسوں کو سیراب و شاداب کیا۔

۱۲۸ ان کی برکت سے بہت بھوکوں کا تھوڑی سی غذا نے پیٹ بھر دیا۔ اور بہت نادار مالدار بن گئے۔

۱۲۹ ان کی جدائی پر کھجور کا تنا اس عاشق کی طرح رویا جس کو محبوب سے دوری کی سوز و تپش رلاتی ہے۔

۱۳۰ وہ امین معتمد ہیں، امی ہو کر ایسی حکمت کی تعلیم دیتے ہیں جس کے سمجھنے سے حکماء و عقلاء بھی عاجز ہیں۔

۱۳۱ وہ حاکم ہیں، ذکر حکیم کو تلاوت کرتے ہیں۔ اس کی آیتیں محکم ہیں۔ ان میں ہدایت و شفا رہے۔

۱۳۲ وہ ذکر حکمتوں اور حکموں پر مشتمل ہے جن سے عقلیں دنگ اور اہل عقل و دانش عاجز ہیں۔

۱۳۳ اس ذکر حکیم کی بلاغت کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس نے بلیغوں کو ساکت اور فصیحوں کو گونگا بنا دیا ہے۔

۱۳۴ انھوں نے اپنی سہل و روشن شریعت کے ذریعے منسوخ شریعتوں کی سیاہی کو دور کر دیا۔

۱۳۵ ان کی ملت کے ظہور نے تمام ملتوں کو اس طرح مٹا دیا جیسے تارے سورج کے چمکتے ہی محو ہو جاتے ہیں۔

۱۳۶ سورج کی روشنی ستاروں کی چمک مٹا دیتی ہے اور سمندر دریاؤں پر غالب آجاتا ہے۔

۱۳۷ اللہ نے ان کے دین کو غالب و باقی رکھا۔ اور مرور دہور پر اسی کو بقا ہے۔

۱۳۸ اگر بے وقوف اور معاند دشمن ان کے ان کمالات کا انکار کرتے ہیں تو تعجب کی بات نہیں۔

۱۳۹ قرص خورشید کو اندھے کی آنکھ کی بے نوری ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

۱۴۰ اذان میں ان کے نام کو بلند آواز کے ساتھ پکارنا، اللہ نے ضروری قرار دیا۔

۱۴۱ اگر آدم کے مراتب اپنے فرزند سعید کی بدولت بلند ہو گئے تو تعجب کیوں ہے، بہت سے باپ بیٹوں کی وجہ سے بلند مرتبہ ہوئے ہیں۔

۱۴۲ بہت سے رسولوں نے امت وسط ہونا چاہا۔ ان میں سے بعض کی آرزو پوری کر دی گئی۔
(جیسے زمانہ امام مہدی میں عیسیٰ علیہ السلام یہ شرف حاصل کریں گے۔)

۱۴۳ هو مفزع للناس اذ فزعوا اذا حشروا فليس لهم سواه رجاء

۱۴۴ يأتون آدم ملتجين وغيره
مستشفعين فاحجم الشفعاء

۱۴۵ فأتوه حين استيئسوا فيجيبهم
مُجاباً الانجاح والانجاء

۱۴۶ طلبُ الانام رِضاءَ مَن مطلوبُه هو اَن يكونَ لمصطفاه رِضاء

۱۴۷ و رِضاءُه هو ان يكونَ بِمُنجِه للمؤمنينَ من العذاب نجاءُ

۱۴۸ اَولاده غُرٌّ اَماجدُ سادةٌ
فوق الانام لهم سنًا وسناء

۱۴۹ خُطُرٌ كبارٌ سادةٌ كرَمٌ هم النبلاء والنجباء والنقباء

۱۵۰ فلهم مناقبُ لا يحيط بوصفِها من واصفٍ مدحٌ ولا اِطراء

۱۵۱ افكيف يوصَفُ جدُّ خُطُرٍ جدُّهم
خَيرُ الانامِ وهُمْ له اَجزاء

۱۵۲ اصحابُه حُسُنَ اَشِدّاءُ على الكفّار فيما بينهم رحماء

۱۵۳ اثنى عليهم ربّهم في آية
ما فوق هذا للعباد ثناء

۱۵۴ السابقون الاوّلون خيارهم
وخيارهم خلصانه الخلفاء

۱۵۵ يا رحمة للعلمين ارحم على من لا له في العالمين رثاء

۱۵۶ اَفدِيكَ مُنَّ على اَسيرٍ ما لهٗ
راثٍ ولا مَنٌّ له وفداء

۱۵۷ فاشفع له من دون اِرجاءٍ فقدْ
ضاقتُ عليه الارض والارجاء

۱۴۳ میدانِ حشر میں لوگوں کی سراسیمگی کے وقت وہ جائے پناہ ہیں، ان کے سوا اور کسی سے امید نہیں ہو سکتی۔

۱۴۴ وہ سب حضرت آدم اور دوسرے رسل علیہم السّلام کے پاس طلبگار شفاعت ہو کر پہنچیں گے۔
مگر وہ سب خاموشی اختیار کریں گے۔

۱۴۵ ان سب سے مایوس ہو کر وہ سب، ان سخی داتا کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ یہ فلاح و نجات
والی شفاعت سے کام لیں گے۔

۱۴۶ انھوں نے مخلوق کیلئے خالق کی وہ خوشنودی چاہی جو اس کے برگزیدہ بندے کی رضا تھی۔

۱۴۷ اور ان کی رضا اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایمان والوں کو عذاب سے نجات ملے۔

۱۴۸ ان کی اولاد شریف، بزرگ اور سردار ہے مخلوق پر انھیں رفعت و بلندی حاصل ہے
اور ان کی چمک دمک کے سامنے سب ماند ہیں۔

۱۴۹ وہ عظیم و کریم، اور نجیب و نقیب ہیں۔

۱۵۰ ان کے اوصاف و مناقب کا احاطہ کسی مدح کرنے والے کی مبالغہ آمیز مدح بھی نہیں کر سکتی۔

۱۵۱ ان بزرگوں کی فیروز بختی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے جب کہ ان کے جدِّ امجد افضلِ خلقِ خدا
ہیں اور وہ سب ان کے اجزا ہیں۔

۱۵۲ ان کے صحابہ بڑے بہادر، آپس میں رحیم اور دشمن پر شدید ہیں۔

۱۵۳ اللہ نے قرآن کی آیت میں ان کا وصف بیان کیا ہے یہ وصف ایسا ہے کہ اس سے بڑھ کر انسانوں کی تعریف
نہیں ہو سکتی۔

۱۵۴ انھیں "السابقون الاوّلون" سے یاد کیا گیا ہے یہ طبقہ صحابہ میں سب سے بہتر ہے اور ان میں
بھی سب سے اعلیٰ خلفاء راشدین ہیں۔

۱۵۵ اے رحمتِ عالم! اس شخص پر رحم کیجئے جس کے لئے زمانے میں کہیں رحم نہیں۔

۱۵۶ میں آپ پر قربان! اس قیدی پر احسان فرمائیے جس پر نہ کوئی رحم کرنے والا ہے
اور نہ اس کے پاس فدیہ و احسان ہے۔

۱۵۷ نا امیدی اور تاخیر کے بغیر اس کی شفاعت فرمائیے۔ کیونکہ زمین اور اس کے وسیع و عریض
اطراف و اکناف اس کیلئے تنگ ہو چکے ہیں۔

۱۵۸ یا من اغاث بلطفہ جلا شکا   لطفا فلی شکوی نوی وشکا

۱۵۹ قد طال اِشکار الکروب فاَشکنی   فاشفع لیرُفعَ ذلک الاِشکاء
۱۶۰ لم یبق لی غیر امتیاحک لی لدی   الربّ الرحیم المستماح رجاء
۱۶۱ محنی ومحنی عندہ وارحم علی
مَحنی بمنعک لا یرُدّ دعاء
۱۶۲ یا ربّ حقّق لی رَجائی ولا یکن   لی فی النجاۃ من العِدیٰ اِرجاء
۱۶۳ قد قمتُ اُرجی القاعدین الی الوغیٰ   وقعدتُ لمّا قامت الھیجاء
۱۶۴ اجرمت اذا جمحت من کسلٍ فلم   اشھد اذا ما استشھد السعداء
۱۶۵ رب اعف عنّی ما اقترفتُ واعفنی
فرجائی منک العفو والاعفاء
۱۶۶ اِن جمّ اجرامی فعندک رحمۃ   ما حدّھا حدّ ولا اِحصاء
۱۶۷ فاغفر وعافِ وتب علیّ فنجّنی   ممّا ابتلانی الخصم والمشاء
۱۶۸ ان کان ما اشکوہ مقضیا فکم   بدعاء مظلوم یردّ قضاء
۱۶۹ لا تشقنی ابدا واسعدنی فلا   ینتاب من بعد السعود شقاء
۱۷۰ واجب لمظلوم دعاءک وضرّہ
فَاَضطَرّہ کفرٌ عَدَوا وَاَساؤا
۱۷۱ قد ضِقتُ ذرعا اذ تتابع منھم   الارزاء والازراء والاخزاء
۱۷۲ انت الوکیل فلا تکل امری الی   لُدٍّ دھانی منھم الاشحاء
۱۷۳ ربّ اجزِھم بالانتقام واَخزِھم   لیکون لی بجزائھم اجزاء
۱۷۴ ربّ انتقم لی من عدای وآبنی
وانصُر فمنک النصر والایواء
۱۷۵ طال انتظاری للنجاح فلا یکن   فیما رجوت من النجا ابطاء

۱۵۸ اے شاکی اونٹ کے فریاد رس! مجھ پر بھی ویسی ہی مہربانی فرمائیے۔ مجھے بھی بیماری اور مجبوری کی شکایت ہے۔

۱۵۹ مصائب کی رسی زمانہ دراز سے دراز ہے ان کو دور فرمائیے اور سفارش کیجئے تاکہ اس ذریعے سے نجات ملے

۱۶۰ آپ کی سخاوت وعطا کے سوا، رب رحیم ومعطی کے سامنے مجھے کوئی امید نہیں۔

۱۶۱ مجھے نفع پہنچائیے اور خدا کی بارگاہ میں سفارش فرمائیے، میری مصیبتوں پر رحم فرمائیے کیونکہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔

۱۶۲ اے خدا! میری امیدوں کو ثابت کر دکھا اور دشمنوں سے مجھے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما۔

۱۶۳ میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا۔ اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا۔

۱۶۴ میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقعہ پر باز رہا، میں نے بڑا جرم کیا، جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لئے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا، میں شہادت سے محروم رہا جب کہ سعادتمندوں نے جام شہادت نوش کیا۔

۱۶۵ اے آمرزگار! میرے قصور کو معاف کر، اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی اس سے درگذر، تجھی سے عفو و درگذر کی امید ہے۔

۱۶۶ اگر میرے جرموں کی فرد بڑی ہے تو تیرے پاس ایسی وسیع رحمت ہے جس کی حد و نہایت نہیں۔

۱۶۷ مغفرت و عفو فرما، توبہ قبول کرتے ہوئے دشمنوں اور چغلخوروں کے ابتلا سے مجھے نجات دے

۱۶۸ میری مصیبتیں اگر میرے حق مقدر بھی ہو چکی ہوں۔ تب بھی مظلوم کی دعا سے ردّ قضا ہو جایا کرتا ہے

۱۶۹ مجھے بدبختی میں نہ ڈال، نیک بخت بنا، سعادت کے بعد شقاوت نہیں لوٹا کرتی۔

۱۷۰ جو مظلوم تجھے پکار رہا ہے اس کی سن لے اور اس کی مصیبت دور کر۔ کافروں نے ظلم و تعدی کا اس کے ساتھ برا برتاؤ کیا ہے۔

۱۷۱ ان کی طرف سے مصائب، اہانت اور رسوائیوں کے پے بہ پے حملوں نے مجھے ضعیف و ناتواں بنا دیا ہے۔

۱۷۲ تو ہی میرا وکیل ہے، میرے معاملہ کو ایسے دشمنوں کے سپرد نہ کر جن کی ایذا رسانی نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔

۱۷۳ اے خدا! ان سے انتقام لے اور انھیں رسوا کر، تاکہ ان کی سزا سے میرے مصائب کی کچھ تلافی ہو سکے۔

۱۷۴ اے پروردگار! میرے دشمنوں سے انتقام لے اور مجھے پناہ دے، میری مدد کر۔ مدد و پناہ تیرے ہی پاس ہے۔

١٧٦ يارب عجّل ان يكون لما شجا.... نى من شجونى فى الجلاء جلاء
١٧٧ هب اُننى لم اقترف شيئا من الحسنات بل افعالى الاسواء
١٧٨ لقد انقضى عمرى سُدىً بملاعب فى اللهو الهانى بها الاهواء
١٧٩ لم اَقترِف عملا يثابُ وانّما قولى وفعلى سمعة ورياء
١٨٠ لكنّ فضُلَكَ واسع يُرجى به عن علّتى وما آثمى الإبراء
١٨١ فارحم علىّ فقد دهالى فتنة لم تغن عنها فطنة ودهاء
١٨٢ عافيتنى ستين عاما لاتنى تزداد لى من فضلك الآلاء
١٨٣ فاختلّ عافيتى وفاجأً خَلّة فارحم فنك الخير والاعطاء

١٨٤ ووسائلى ربى اليك محمّد
والمرتضى وابناه والزهراء
١٨٥ يارب صلّ عليه ماصدحت على
الأَيك الوريق حمامة ورقاءُ
١٨٦ حيّاهم الرحمٰنُ ما اُحيى حَيا
ارضاً وسحّت دِيمة وَطفاء

۱۷۵ کامیابی کا مجھے مدت سے انتظار ہے۔ اب میری امید نجات میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔

۱۷۶ اے پروردگار عجلت فرما تاکہ جلاوطنی کی تکلیفوں سے رہائی و خلاصی نصیب ہو۔

۱۷۷ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ بلکہ بد اعمالی ہی میں مبتلا رہا۔ ،، ،،

۱۷۸ میری عمر لہو و لعب میں بیکار گذری اور خواہشات نے مجھے نیکیوں سے غافل رکھا۔

۱۷۹ کوئی ثواب کا کام نہ کرسکا، میرے قول و فعل میں ریا و نمائش کو دخل رہا۔ ،، ،، ،،

۱۸۰ لیکن تیرا فضل و کرم وسیع ہے، اسی سے اپنی بیماری اور گناہوں سے برارت کی امید ہے۔

۱۸۱ مجھ پر رحم فرما مجھے ایسی آزمائش سے سابقہ پڑا ہے کہ اس سے زیرکی اور اصابت رائے بھی بچا سکی

۱۸۲ ساٹھ سال تک تو نے مجھے امن و عافیت میں رکھا تیرے فضل سے اس مدت میں نعمتیں بڑھتی ہی رہیں۔

۱۸۳ پھر اچانک میری عافیت مختل اور احتیاج مسلط ہو گئی، رحم فرما خیر و عطا تیری ہی جانب سے مل سکتی ہے

۱۸۴ اے میرے رب! تیرے دربار میں میرے وسیلے، حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم علی، حسن،
۱۸۵ حسین اور فاطمہ زہرا رہیں۔

۱۸۵ اے پروردگار! جب تک سرسبز و شاداب مرغزاروں میں کبوتروں اور سبز رنگ کے ندوں
کی آوازیں گونجتی رہیں، سرکار پر رحمتیں نازل فرما۔

۱۸۶ اور جب تک بارش اور مسلسل جھڑ زمین کو سیراب کرتے رہیں! اللہ کی برکتیں اور اس کی رحمتیں
ان سب بزرگوں پر نازل ہوتی رہیں۔

بسم الله الرّحمٰن الرّحیم

۱ عُودِیْ فعُودِیْ مریضاً دائم السُّعادی
اَشفی علی الحَینِ حتّی عادَهُ العادی

۲ عَوّاد سقم قلبی عُوّاده وبهَوا
وکان یُلهی بزَمّار وعَوّادِ

۳ واعتادَ عِیدَ وَدّی کلّ الاُساة به
فعادَ کلّاً علی اَهلٍ وعُوّادِ

۴ داءٍ دواه عیار لا دواء له
حِمامه حاضر من سقه البادی

۵ ویلاہ مِن زَمنٍ لا یشتفی زَمناً
علاجه لیس یجدی غیر اکماد

۶ دائی عضال ولا یجدی بعائدةٍ
عودٌ لداءٍ بعودِ الداءِ عَوّادِ

۷ حَشا حَشای جویً یشوِی الجوانح
والحشا کنارِ غَضا توری بایقاد

۸ کم بَینَ نارِ حَشا الثّورِ مَوقِدُها   وقودُها حَطَبٌ مِنْ بعضِ اَعوادِ
۹ وبینَ نارِ جوًی یَصْلی جوانحنا   وَقودُها مِنْ حَشا مِنّا واکبادِ

۱۰ وَلّی السعود فلا سلمی تسالمنی
ولا سُعاد قد ارتنی باِسعادِ

۱۱ خُلقی تنکّر حتی کاد یُنکرلی
مَن کان یعرفنی مِن یوم میلادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱ اے محبوبہ[1]! واپس آ۔ اور ایک ایسے مریض کی عیادت کر جس کا مرض قدیم اور متعدی ہے۔ اور جو ہلاکت کے اس درجہ قریب پہنچ چکا ہے کہ دشمن بھی عیادت کو آنے لگے ہیں۔

۲ وہ امراض کا عادی بن چکا ہے، اس کے عیادت کرنے والے اس سے تنگ آکر کنارہ کش ہو چکے ہیں حالانکہ ستار اور بانسری بجانے والے اس کے گرد رہا کرتے تھے۔

۳ وہ مرض ہلاکت کا خوگر ہو گیا ہے، چارہ ساز و غمخوار بھی تھک چکے ہیں، وہ عیادت گروں اور اہل و عیال پر بارِ گراں بن گیا ہے۔

۴ وہ ایسا مریض ہے جس کی بیماری ایسا عجز و درماندگی ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ اس کے ظاہر مرض کی وجہ سے موت ہر وقت سامنے کھڑی ہے۔

۵ زمانہ کی حالت پر حسرت و افسوس ہے کہ مریض مزمن کو شفایاب ہونے نہیں دیتا۔ اس کا علاج غم کی زیادتی کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

۶ میری بیماری سخت ہے، عیادت گروں کی بار بار چارہ فرمائی بھی ایسے مریض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی جو امراض کے ہجوم و ورود کا عادی ہے

۷ میرے سینے میں وہ غم و اندوہ بھر گیا جس نے اندرونی و بیرونی اعضا کو غضا[2] لکڑی کی آگ کی طرح جلا ڈالا جو جلاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے۔

۸ بہت فرق ہے اس آگ میں جس کے جلنے کی جگہ تنور کا پیٹ ہو جس کا ایندھن لکڑیوں کا گٹھا ہوتا ہے

۹ اور اس غم و الم کی آگ میں جو ہمارے اعضا کو جلاتی ہے جس کا ایندھن ہماری آنتیں، پسلیاں اور قلب و جگر ہیں

۱۰ نیکبختی نے پشت دکھادی، اب نہ سلمٰی ہی مصالحت کرتی ہے اور نہ سعادؔ ہی سعادتمندی کا اظہار کرتے ہوئے مدارات پر آمادہ ہے۔

۱۱ میں غم اٹھاتے اٹھاتے بدصورت بن گیا۔ جو لوگ مجھے یوم پیدائش سے پہچانتے ہیں انھیں بھی شناخت میں تامل ہونے لگا۔

---

[1] عربی شاعری میں ہم سفر ساتھیوں یا محبوبہ سے خطاب کیا جاتا ہے! اور علی العموم قصائد کی ابتدا اسی تخاطب سے ہوتی ہے۔ ۱۲ شاہد شروانی

[2] غضا ایک درخت ہے جس کی لکڑی سخت ہوتی ہے، اس کی چنگاری بہت دیر تک نہیں بجھتی۔ سلطان نجد کو اہل غضا بھی کہتے ہیں۔ ۱۲ شاہد شروانی۔

۱۲ فقوّتی ضعفت والضعف من ضعف   تنقصٍ فی القوی والجسم مزداد
۱۳ لم یبق لی جَلَدٌ مما اُصیب به   قلبی وروحی وجثمانی واجلادی
۱۴ اردیٰ للداهیة دَهیاء قد هجمتُ   هَمٌّ وهمٌّ بِاَرواحٍ واجساد
۱۵ فاجی بلاء فابکی اسرتی واولی القربی واشمتَ اَعدائی وحُسّادی

۱۶ لقد دهانی فاوهانی فزایلنی
الدّهاء اَن کادنی اَشرارُ انکادِ
۱۷ کادتُ ملیکتهما اذ آمنتَ فِرَقا   من الرعایا وافواج واجناد
۱۸ همّت بتنصیرهم قبلا وهم شِیَعٌ   من مسلمین ومن عُبّاد اَبداد
۱۹ فاستنکفوا وابَوا واستنکروا ونبَوا
۲۰ الا اَقلّاء من دونٍ واَوغاد
۲۰ مالوا علی حزبها البیضاءِ فانهزموا
کالشاء تنفِر من سِیبٍ و آساد
۲۱ فالّفت جمعَ زطٍّ مِنُ تکاکرة   من الهنادک لاستدعاء امداد
۲۲ وبعض من یدّعی الاسلام فانخدعوا   اذا استعدّ والاعداء واعداد
۲۳ قد اعتدَوا اذ عدوا الکفارهم وعدوا
اذا عَتد والعداهم کل اِعتاد
۲۴ فکم اعدّ والنصی الخصم من عُدد   ومن عساکر لا تحصیٰ باَعداد
۲۵ ثم استعانت جِبِلّا ساکنی جبلٍ   فانجدوهم باَنّهُا مبانجاد
۲۶ وشهّرت کتبا منشورة نشرت   اِیمانها المحاریب و آضداد
۲۷ اِلا الّذی قتلَ الصبیان اوقتل النسوانَ اوغالَ مغلولا باَقیاد
۲۸ من سالموا اسلموا آلَ القتالِ الی
عُمّالها واَطاعوا طوعَ مُنقاد

۱۲ میری طاقت کم ہوگئی اور ضعف دونا ہو گیا۔ یہ سب کچھ قویٰ اور جسم میں بہت زیادہ نقص کی وجہ سے ہوا۔

۱۳ میرے قلب، روح، جسم اور بدن کو جو مصیبتیں پہنچیں۔ ان کی وجہ سے مجھ میں قوت باقی نہیں رہی

۱۴ سخت مصیبت کی وجہ سے ہلاکت کو پہنچ گیا، روحانی اور جسمانی اذیتوں میں گھر کر شیخ فانی بن گیا۔

۱۵ اچانک مصیبت نے آدبایا۔ اس نے میرے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو رلایا اور دشمن وحاسد
کو ہنسایا۔

۱۶ اس مصیبت نے مجھے کمزور وناتواں بنادیا اور شریر وبدخصلت لوگوں کے مکر نے مجھ سے
زیرکی ودانائی کو زائل کر دیا۔

۱۷ رعایا، فوج اور لشکر کے گروہوں کے لئے امن کا اعلان کر کے ان نصاریٰ کی ملکہ نے بھی مکر سے کام لیا۔

۱۸ اس نے پہلے تو مسلمانوں اور بت پرستوں کی جماعتوں کو نصرانی بنانے کا قصد کیا۔

۱۹ ان سب نے اعراض کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور اسے برا سمجھتے ہوئے دوری اختیار
کرلی البتہ تھوڑے ذلیل ورذیل اشخاص نے اس کا کہنا مان لیا۔

۲۰ انھوں نے اس کی سفید فوج پر حملہ کیا اور گردش تقدیر سے شکست کھا گئے، جیسے بکریاں،
بھیڑیئے اور شیر سے دور بھاگتی ہیں یہی ان کا بھی حال ہوا۔

۲۱ پھر اس نے ہندؤں میں سے جاٹ ٹھاکروں کو اپنی مدد کے لئے جمع کیا۔

۲۲ اور بعض مدعیان اسلام کو بھی ساتھ لے لیا وہ دھوکے میں آکر مدد کیلئے آمادہ ہو گئے۔

۲۳ انھوں نے اپنے ساتھیوں پر حملہ کر کے زیادتی سے کام لیا۔ اور اپنے مقابل لوگوں سے پوری
طرح تیاری سے پیش آکر بڑا ظلم کیا۔

۲۴ ان سب نے دشمن کی مدد کے لئے بہت سا سامانِ جنگ۔ اور بیشمار لشکر اکٹھا کیا۔

۲۵ پھر اس ملکہ نے پہاڑیوں سے مدد لی۔ انھوں نے پوری رغبت اور بہادری سے مدد کی۔

۲۶ اس نے محاربوں اور دشمنوں کی امان کے اشتہارات جاری کئے۔

۲۷ کہ بچوں، عورتوں اور قیدیوں کے قاتلوں کے سوا سب کو امان ہے۔

۲۸ جنھوں نے صلح کی، آلات حرب اس ملکہ کے عاملوں کے سپرد کر دیئے اور فرماں برداروں
کی طرح اطاعت گذار بن گئے۔

۲۹ وطمعت كلّ دهقان فطاوعها جُلّ الدهاقين من رو من باد
۳۰ فنصرهم سلّط الانصار فانتصروا اذا انجد وهم باغوار وانجاد
۳۱ واخوا البلاد بتخريب ولم يذروا ماكان فيهنّ من رسم واَبلاد
۳۲ قد انجدوا واغاروا وقتّلوا نهبوا وافسدوا فى النواحى كل فساد
۳۳ هدّوا المعابد واجتاحوا المساجد ...
وَاِعتاوا اعتدوا اغلوا فى قتل عُبّاد
۳۴ من كان منحرفا عن طوعها قتلوا
لم يسمعوا امر حكّام وقوّاد
۳۵ اَعيتْ فريقا عن الهيجا رفاقتهم
واَقعدَ البعض جُبنٌ كلّ اِقعاد
۳۶ لمّا رأتْ انه لم يبقَ مختصم للحرب باغٍ ولا باغٍ ولا عادٍ
۳۷ عادتْ فعادتْ فامنّت بما وعدت منّت حبائل ميثاق وميعاد
۳۸ منّت بما وعدت ثم اعتدت وعدت
فكان موعدها كيداً لايُعاد
۳۹ رجعتُ اذ غرّنى ايمانُ كافرة نُذرا بعهد الى اهلى واولادى
۴۰ وآب من ندّ من اندادنا قبلا ... فى النصارى بحبس دون اند
۴۱ جرّوا الى السجن ضمّونى الى فئة كسرى واسرى باغلال واصفاد

۴۲ اسرى عناة يعانون الشدائد فى
۴۳ حرّ وحدّة وسجّان وحدّاد
۴۳ شق الغلاظ عليهم لم يذر جلدا
فيهم وشقّ جلودا جلدُ جلّاد
۴۴ جمعُ العدى جمعوا بينى وبينَ عدى وفرّقوا بين اَعضائى واَعضادى

۲۹ اس نے تمام دہقانیوں کو لالچ دیا۔ جس کی وجہ سے اکثر دیہاتی اور بادیہ نشیں اس کے مطیع ہو گئے

۳۰ ان سب کی مدد نے ان کو مسلط و غالب کر دیا جب کہ ہر پستی و بلندی پر ان کی مدد کی۔

۳۱ انھوں نے شہروں پر غارتگری کے ذریعہ قبضہ کر لیا! ور ان کے آثار و نشانات بھی باقی نہ چھوڑے

۳۲ وہ بلند اور پست مقامات پر پہنچے اور قتل، لوٹ مار، اور سارے علاقہ میں فتنہ و فساد پیدا کر دیا۔

۳۳ عبادت گاہوں کو منہدم اور مسجدوں کو مسمار کر دیا۔ خدا کے بندوں کو قتل کیا اور عابدوں کی ہلاکت میں حد سے تجاوز کر گئے۔

۳۴ جن لوگوں نے اس ملکہ کی اطاعت نہ کی تھی ان پر ایسی بزدلی چھائی تھی کہ نہ اپنے سردار کا حکم مانتے تھے اور نہ حاکم کی بات سنتے تھے۔

۳۵ ان میں سے ایک فریق کو فقر و فاقہ نے جنگ سے تھکا دیا تھا۔ اور دوسرے گروہ کو بزدلی نے پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔

۳۶ جب ملکہ نے دیکھا کہ کوئی جنگ کا خواستگار دشمن، باغی اور سرکش باقی نہیں رہا۔

۳۷ تو اپنے قول سے پھر گئی اور دشمنی پر اتر آئی۔ کوئی اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور عہد و میثاق کی رسیوں کو کاٹ دیا۔

۳۸ پہلے وعدہ کر کے لوگوں کا آرزو مند بنا دیا پھر عداوت و ظلم سے کام لیا۔ دراصل اس کا وعدہ، وعید کے لئے مکر تھا۔

۳۹ اس کافرہ کے جھوٹے وعدوں اور قسموں سے دھوکے میں پڑ کر میں بھی اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ آیا۔

۴۰ ہمارے ساتھیوں میں دوسرے روپوش لوگ بھی واپس آ گئے۔ مگر نصاریٰ نے صرف مجھی کو قید میں ڈال دیا۔

۴۱ وہ مجھے قید خانے کھینچ کر لے گئے اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے درماندہ و شکستہ دل قیدیوں میں شامل کر دیا۔

۴۲ وہ بڑے جفاکش قیدی تھے۔ قیدخانہ کے دربانوں اور نگہبانوں کی بے انتہا سختی اور ان کے مزاج کی تیزی برداشت کرتے تھے۔

۴۳ بدخو اور درشت مزاج نگہبانوں کی محنت و مشقت نے ان کے بدن پر کھال نہ چھوڑی تھی اور جلاد کے کوڑوں نے بدن کی کھال پھاڑ دی تھی۔

۴۴ دشمنوں کی جماعت نے دشمنوں کو اور مجھے جمع کر دیا اور میرے اعضا اور بازوؤں کو جدا کر دیا۔

۴۵ قد صدّعنی الرجالُ کنتُ آملهم   وصدّعنی اَخلّائی واَودادی
۴۶ وحالَ بینی وبینَ الاَقربینَ نوًی   وغنّی بینُ اَولادی واَحفادی
۴۷ حُبستُ فی السجن منجودا ولم یذروا   عندی رفیقا کخبّاز و نجّاد
۴۸ وقد کسونی کساءً بعد ما سلبوا . . .   الکساء وانتزعوا البُسی و اَزوادی
۴۹ اعطَوا وطاءً غلیظا شائکا خشنا   لنومِ لیّنٍ بلینِ الفرش معتادِ
۵۰ سقَوا اجاجا حمیما اِن شکوت صدًی
واَعتدوا لی غذاءً غیرَ معتاد
۵۱ لم یقنعوا باحتباسی بل اضیف الی
حبسی جلائی وتغریبی و ابعادی
۵۲ فارکبونی واَسریٰ آخرین علی   فُلکٍ یمورُ بموج البحر میّاد
۵۳ واَنزلونی مع الاسری علی جبل   قاصٍ تنی دونه اَقدام قُصّاد
۵۴ شطّ المزار بنا اذ شطّ حابسنا
بشطّ بحر له مدّ باِزباد
۵۵ ارواحٌ تنزعَ الارواحَ من خبث
کصرصرٍ اُرسلت قبلا علی عاد
۵۶ خاب المُنا والمُنا قدهم فیه وما   لبّثٍ فیه من دفن و اِلحاد
۵۷ یفیض فیه هموما جمّةً ابدا   غیمُ هموم فسارٍ رائحٌ غاد
۵۸ فلا یری فیه یوما ضوءُ شمس ضحی   ولا سنا نیّرٍ باللیل وقّاد
۵۹ یومی کلیلی ولیلی سرمدٌ تقفُ . . .   النجوم فیه کاَنْ شُدّتْ باوتاد
۶۰ کانت کاَیّامنا بیضا دیاجُرنا   وکان اَیّامنا ایامَ اَعیاد
۶۱ کیف احتیالی لاطلاقی وقد ضربت   علیّ ارضاً قلّتنی باَسداد
۶۲ کیف الخلاص وخصمی ظالم شکسٌ   ویلاه من کافرٍ بالله کنّاد
۶۳ اَغری النصاری بتعذیبی زنادقة   یلونهم وتوتّوهم لاِلحاد

۴۵ جن لوگوں سے مجھے امیدیں تھیں وہ اعراض کر گئے اور میرے دوستوں اور ساتھیوں کو مجھ سے علیحدہ رکھا گیا۔

۴۶ میرے اور اعزہ کے درمیان جدائی حائل ہوگئی۔ اور اولاد و احفاد کے فراق نے مجھے غم میں ڈال دیا۔

۴۷ میں غمگین و حزیں جیل میں پہنچا دیا گیا میرے پاس میرا کوئی رفیق، باورچی، یا خدمتگار بھی نہ چھوڑا گیا۔

۴۸ میرا عمدہ لباس اتار کر قیدیوں کے کپڑے پہنا دیئے۔ میرا توشہ اور کپڑے چھین لئے۔

۴۹ انھوں نے سخت، موٹا اور چبھنے والا بستر ایسے راحت پسند شخص کو سونے کے لئے دیا جو نرم بستر کا عادی تھا۔

۵۰ میں نے پیاس کی شدت کی شکایت کی تو گرم اور کھاری پانی پلایا۔ اور ایسی غذائیں مہیا کیں جن
کا میں کبھی عادی نہ تھا۔

۵۱ میرے قید کرنے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اس کے ساتھ جلاوطنی، مسافرت اور اہل وطن سے دوری کا بھی
اضافہ کر دیا۔

۵۲ مجھے اور دوسرے قیدیوں کو جہاز پر سوار کر کے لے چلے اور وہ جہاز سمندر کی موجوں سے ہچکولے کھاتا چلتا تھا۔

۵۳ اور مجھے ان قیدیوں کے ساتھ ایک دور دراز پہاڑی پر اتار دیا جہاں قصد کرنے والوں کا وہم و گمان بھی نہ پہنچتا تھا۔

۵۴ ہمارے قید کرنے والے نے ہم پر ظلم روا رکھ کر ہماری دید سے لوگوں کو محروم کر دیا۔ اور ہمارے درمیان ایسے
سمندر کا کنارہ حائل ہوگیا جس میں پانی کے جوش سے جھاگ پیدا ہوتے تھے۔

۵۵ وہاں کی ہوائیں اپنی خرابی کی وجہ سے جان نکال لیتی تھیں۔ وہ اس ہلاکت خیز آندھی کی طرح تھیں۔
جو قوم عاد پر اس سے قبل بھیجی جا چکی تھیں تھی۔

۵۶ اسمیں آرزوئیں پامال اور موت عام تھی اور کسی میت کے لئے دفن و قبر کا کوئی انتظام نہ تھا۔

۵۷ غموں کے بادل قسم قسم کے رنج و الم برساتے رہتے ہیں اور وہ بادل صبح و شام اور شب کو آتے جاتے رہتے ہیں۔

۵۸ وہاں کبھی دن میں سورج کی روشنی نظر آتی ہے نہ چمکنے والے چاند اور تاروں کی رات میں چمک۔

۵۹ میرا دن رات کی طرح ہے اور میری رات کو دوام ہے آسمان پر ستارے ایسے رکے ہوئے ہیں جیسے میخوں میں انھیں باندھ دیا گیا ہو۔

۶۰ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری تاریک راتیں، روشن دن کی طرح تھیں اور ہمارے دن عید کے دن تھے۔

۶۱ میری رہائی کیلئے کیا حیلہ ہو سکتا ہے۔ جو زمین میرا بار اٹھائے ہوئے ہے اس کے سارے راستے مسدود ہیں۔

۶۲ مجھے چھٹکارا کیسے نصیب ہو سکتا ہے میرا دشمن ظالم و بدخو ہے اس کافر کی خرابی ہو جو خدا کا بھی منکر ہے۔

۶۳ مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے نصاریٰ نے ایسے زندیقوں کو آمادہ کیا جو ان کے مقرب ہیں اور وہ بھی جن سے ان کے
الحاد کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔

۶۴ غاظوا وجدّوا ولجّوا فی معاتبتی   عادوا وبادوا باضغانٍ واحقاد

۶۵ ایست من املی اذ قُطعت حِیَلی   وحِرت کالطّیر فی احبول صیّاد
۶۶ کالظبی فی جُرّۃ امسی ینادِ مہنا   وقد یسالہا من خوف مصطاد
۶۷ رجوت ناسا رجامَن اَملوا سُمُبا
قد اقلعت بعد ابراق وارعاد
۶۸ قطعتُ عمّا سِوی اللہ الرجاءَ فما   ممن سواہ رَجارِفد وارفاد
۶۹ فلا اؤمّل الا رحمة الملک العـــــدل الّذی ذکرہ حرزی واَورادی
۷۰ حیٌّ حَیِیٌّ حفیٌّ بالدعاۃ فلا
یردّ دعوۃً ملہوفٍ ولاراد
۷۱ یُنجی اُساری ضِعافا من جبابرۃ   شُوسٍ اشدّاءَ جابوا الصخر بالوادی
۷۲ یسلّط الضعفا العاجزین علی   صِیدٍ شِدادٍ کفرعون وشدّاد
۷۳ من سواہ لعانٍ لا احتیال لہ
وما الاطلاقہ مَنّ ولا فادٍ
۷۴ یاربّ اَنقذہ من اَیدی عِدیً کفرٍ   بجاہ احمدَ محمودٍ وحمّادٍ
۷۵ ارسلتہ رحمۃ للعٰلمین الی الانا ...... م طرّاً لارفاد وارشاد
۷۶ غوث المنادی لکفّ الباس مفزعنا
یومَ التنادی ندِیٌّ الکف فی النادی
۷۷ ہادٍ وحامٍ وماحٍ مائحٍ لغوٍ
عمٍ ومستصرِخٍ مستشفعٍ جادی
۷۸ جارٌ لجارٍ شکا جورا ہمیم لمن   قدِ استماح وممتادٌ لممتادٍ
۷۹ ہادٍ بشیرٌ قد اَلقَتْ بشائرہ الرُّهبان فی رَحَبٍ الہود فی ہاد

۶۴ وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جد وجہد سے کام لیا۔ پوری پوری دشمنی برتی اور بغض وکینہ کا کھلا مظاہرہ کیا۔

۶۵ اپنی تدبیروں کے انقطاع پر میں ناامید و مایوس ہو گیا اور شکاری کے جال میں پھنسے ہوئے پرندہ کی طرح حیران و پریشان

۶۶ میری حالت اس ہرن سے مشابہ تھی جو شکاری کی لکڑی سے موقع شکار کے خوف سے مصالحت کر بیٹھا ہو

۶۷ میں نے چند لوگوں سے ان قحط زدہ اشخاص کی سی امید باندھی جو ایسے بادلوں سے جو گرج اور چمک کر چھٹ گئے ہوں۔ امیدیں باندھ لیتے ہیں۔

۶۸ میں نے خدا کے سوا سب سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کے سوا کسی دوسرے سے بخشش و امداد کی امید نہیں ہے۔

۶۹ اس بادشاہ عادل کی رحمت کا ہی میں امیدوار ہوں جس کا ذکر میرا حرز جاں اور میرا ورد ہے۔

۷۰ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا، حیا رکھنے والا اور پکارنے والوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے والا ہے، ہلاکت زدہ اور مظلوم و مضطر کی دعا رد نہیں کرتا ہے۔

۷۱ وہ کمزور قیدیوں کو ایسے جابر متکبر اور سخت انسانوں سے نجات دلاتا ہے جو وادی میں پتھروں کو کاٹنے والے ہیں

۷۲ وہ فرعون و شداد جیسے سخت و جابر بادشاہوں پر کمزور عاجزوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

۷۳ اس مصیبت زدہ کیلئے جس کا کوئی حیلہ وسیلہ نہ ہو اور جس کی رہائی کے لئے نہ کوئی فدیہ ہو اور نہ احسان خدا کے سوا کون چارہ ساز ہے۔

۷۴ اے پروردگار! اس عاجز وخستہ کو ستودہ صفات احمد مختار (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل میں کافر دشمنوں کے چنگل سے نکال

۷۵ تو نے انھیں تمام مخلوق کی طرف اس کی رہبری و ہدایت اور عطا و اعانت کیلئے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے۔

۷۶ وہ مصیبت و عذاب روکنے کیلئے پکارنے والوں کے فریاد رس، روز قیامت میں ہماری پناہ گاہ اور مجلس میں بڑے سخی و جواد ہیں۔

۷۷ وہ گمراہ کے لئے ہادی، نابینا کے حامی، فریادی کے مددگار، سفارش چاہنے والے کے شفیع، اور سائل کو عطیات سے نوازنے والے ہیں۔

۷۸ ظلم سے شاکی پڑوسی کے محافظ ہیں، امداد چاہنے والے کے معاون اور طالب عطا کیلئے سخی ہیں۔

۷۹ وہ خوشخبری سنانے والے ہادی ہیں۔ راہبوں نے ان کی آمد کی اطلاع حالت خوف میں پہنچائی، اور اسی طرح یہود نے۔

٨٠ هدى سبيلا سويّا كل منحرف   عن السبيل وسوّى كلّ مُتاد

٨١ غوث وغيث للهوف ومنتجع
بحر وبرّ لورّاد ورُوّاد

٨٢ بحرٌ شريعتُه بيضاءُ صافيةٌ   مشروعها مَشْرَعٌ عذبٌ لورّاد

٨٣ بَرٌّ نَدٍ يُتبع الغرثى اَصابعه
جادتْ فجادتْ جُوادُ اللابِ الصادي

٨٤ ان زاد آدم جدّا من لدنه فكم
بابنٍ علا جدّا بارو اجداد

٨٥ ختمُ النبيين اَولاهم واوّلهم
بَدءُ البدِیِ سَناہ بدءُ ایجاد

٨٦ فدينه ناسخ الاديان قاطبة   باق على مرِّ اَحقاب وآباد

٨٧ تلا كتابا حكيما محكما حكَما
يقضي على كل مرتابٍ لمرتاد

٨٨ دعا ليدخل فى افراد امّته   رُسْلٌ على ما رَوى اَصحاب اسناد

٨٩ دعوا لكي يحُسبوا من امة وَسَط
عدل على الامم الماضين اَشهاد

٩٠ فمِنْ اُولئك من لم يُعطَ ما اَمَلوا   والبعض فازوا بماموُل ومرتاد

٩١ اَكرِم بعترته الغرِّ الكرام فهم   خير النبّال وهم ساداتُ امجاد

٩٢ اصحابه جاهدوا والدين اجتهدوا   لنصره واجدّوا كل احداد

٩٣ ياسيد الخلق ياخير الورى خُلُقاً
ياخير مَن يرتجى ياخير اجواد

٩٤ افديك مُحنى ومحنى واكفف محنى
بالميم ياخير ممتاح وممتاد

۸۰ انھوں نے ہر گم کردہ راہ کو سیدھا راستہ بتایا۔ اور ہر ٹیڑھے کو سیدھا کر دیا۔

۸۱ غمگین کے فریادرس اور طالب بارش کے لئے بادل، گھاٹ پر آنے والوں کے لئے دریا، چارہ اور پانی کے متلاشی کے لئے (سرسبز) میدان ہیں۔

۸۲ وہ دریا ہیں ان کی شریعت روشن اور صاف ہے جس کے احکام پیاسوں کیلئے شیریں چشمہ ہیں۔

۸۳ وہ بڑے نیک اور سخی ہیں بھوکوں کا ان کی انگلیاں پیٹ بھرتی ہیں۔ جب انگلیاں سخاوت پر آتی ہیں تو تشنہ لبوں کی پیاس پر غالب آجاتی ہیں۔

۸۴ آدم علیہ السلام کی بزرگی میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا تو تعجب کیوں ہے۔ بہت سے آباو اجداد نے اپنی اولاد کے مجد و شرف کے باعث بلند مرتبہ پالیا ہے۔

۸۵ وہ خاتم النبیین ہیں۔ نبیوں میں سب سے اول و افضل ہیں مخلوق میں اولیت کا شرف انھیں کو حاصل، اور انھیں کی روشنی سب سے پہلی ایجاد ہے۔

۸۶ ان کا دین تمام دینوں کا ناسخ اور رہتی دنیا تک رہنے والا ہے۔

۸۷ انھوں نے حکمت والی مضبوط، اور فیصلہ کن کتاب کی تلاوت کی، وہ کتاب متلاشی حق کے حق میں اور شکی کے خلاف فیصلہ صادر کرتی ہے۔

۸۸ رسولوں نے ان کے امتی بننے کی خدا کی بارگاہ میں دعا کی روایات میں اسناد کے ساتھ اس کا تذکرہ موجود ہے

۸۹ انھوں نے امت وسط، شاہد عادل (امت محمدیہ) میں شمار ہونے کی دعا کی جو کہ تمام سابقہ امتوں پر قیامت کے دن گواہ بنے گی۔

۹۰ ان میں سے بہت کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ اور بعض اپنی مراد کو پہنچے۔

۹۱ کس قدر قابل عظمت ہے۔ ان کی شریف، بزرگ، نجیب اور بلند رتبہ اولاد۔

۹۲ ان کے صحابہ نے دین کے لئے جہاد کیا، معاونت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس سلسلہ میں طرح طرح کی کوششیں کیں۔

۹۳ اے مخلوق کے سردار اور اخلاق میں سب سے بلند و بہتر، امیدوں کے بہترین سہارے، اور تمام اہل سخاوت سے بلند مرتبہ رکھنے والے۔

۹۴ میں آپ پر قربان! مجھ پر رحم فرمائیے اور مجھے بخشش سے نوازئیے! اپنی عطا سے میری مشقتوں اور غموں کی تلافی کیجئے۔ اے جود و عطا کے مالک۔

۹۵ فاشفع ومحنی وسَلْ ربی لینجیَنی   ممّن بلانی بتغریبی و إفرادی
۹۶ وأَن ینفّسَ عنّی عاجلا کُرَبی   اللائی تجاوزن عن حصرٍ وتعداد
۹۷ وأَن یعافینی فوراً ویُبدلنی   وجدی بوجد واشقائی باسعاد
۹۸ وان یتیح حمامی بالشهادة فی
جوار مثواک یا جاری ویا هادی
۹۹ ناشدتک الله فاقبل مدحتی کرما
حتی افوز بمنشودی بانشادی
۱۰۰ علیک ازکی صلوٰة الله ما صدحت
ورقاء ایک وریق او شدا شادی

⁂

قال رحمه الله!

تمت القصیدتان فی شهر رجب سنة ۱۲۷۶ھ یعنی الف و مائتین وستا وسبعین من الهجرة المقدسة النبویه علی صاحبها ازکی الصلوٰة والتحیة، وانا محبوس فی الجزیرة الوبیّه، نجانی الله سبحانه منها برحمته الوسیعة، وقدرته البدیعة، بجاه حبیبه وآله وعترته علیه وعلیهم ازکی الصلوات واَسنی التسلیمات ۵

۹۵ مجھ پر رحم کرتے ہوئے خدا سے میری سفارش کیجیے کہ مجھے جلاوطنی اور قید تنہائی کی مصیبت و آزمائش سے نجات دے۔

۹۶ اور جلد سے جلد میری ان پریشانیوں اور اذیتوں کو دور کرے جو حد و شمار سے متجاوز ہو چکی ہیں

۹۷ اور مجھے عجلت کے ساتھ اپنی عافیت میں لے اور میرے غم کو سرور اور شقاوت کو سعادت سے بدل دے

۹۸ اے میرے محافظ و رہنما! اس بات کی بھی دعا کیجیے کہ خدا میری موت آپ کی اقامت گاہ کے جوار میں شہادت کی موت مقدر کر دے۔

۹۹ میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں، اپنے کرم سے میری مدح و ستائش قبول فرمائیے۔ تاکہ اشعار خوانی کی بدولت میں اپنی مراد کو پہنچوں۔

۱۰۰ آپ پر اللہ کی پاکیزہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں جب تک سرسبز و شاداب مرغزاروں میں قمریوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور گانے والے گاتے رہیں۔

مصنف علیہ الرحمہ نے آخر میں تحریر فرمایا:۔

"یہ دونوں قصیدے رجب سنہ ۱۲۷۶ھ میں، بحالت اسیری جزیرۂ وبائی، تمام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وسیعہ اور قدرت بدیعہ سے اپنے حبیب اور اس کی آل اطہار اور اولاد امجاد کے طفیل اس وبائی جزیرہ سے نجات دے۔ ان سب پر اللہ کی روشن نعمتیں اور پاکیزہ رحمتیں نازل ہوں۔

الثورۃ الہندیہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بارے میں مستند ترین تاریخی دستاویز ہے جسکی توثیق معاصر روزنامچوں اور کتب تاریخ کے علاوہ بعد کے مؤرخین کے رشحات قلم نے بھی کی ہے۔

برصغیر ہند و پاک کی آزادی کے بعد مؤرخین و محققین نے سرکاری وغیر سرکاری ریکارڈ سے جو مواد فراہم کیا ہے اس نے "الثورۃ الہندیہ" کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔ ہم "الثورۃ الہندیہ" کے مندرجات کے تصدیقی شواہد کی نشاندہی پر اکتفا کرتے ہیں ارباب نظر ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ غالب کا روزنامچہ ص ۱۲

۲۔ نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۴۹

۳۔ نوبت پنج روزہ۔ از راشد الخیری ص ۱۱۶

۴۔ دلی کی آخری بہار " ص ۱۱

۵۔ داستان غدر۔ از ظہیر احمد دہلوی ص ۱۴۰، ۱۱۸

۶۔ تصویر کا دوسرا رخ (اردو ترجمہ) از حسام الدین ص ۲۶۔

۷۔ تاریخ جرم و سزا۔ جلد اول از امداد صابری ص ۲۰۳، ۲۰۹

۸۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۲۰۔

۹۔ سن ستاون (انگریزی) از پنڈت سندر لال ص ۱۲۴، ۱۳۴، ۱۵۰، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۶

۱۰۔ قیصر التواریخ ص ۲۳۳

۱۱۔ تاریخ اودھ ص ۲۴۹، ۲۵۰

۱۲۔ سیر گلشن از بابو رام ص ۲۲۵، ۲۳۰ (۱۳) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء-۱۹۵۷ء از ڈاکٹر سید معین الحق (انگریزی) ص ۱۹، ۳۸، ۴۰، ۴۱، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۰ (۱۴) دی گریٹ ریوولیوشن آف دی 1857ء (انگریزی) - از ڈاکٹر سید معین الحق ص ۲۳، ۲۶، ۲۸، ۳۰، ۸۵، ۹۶، ۱۹۰، ۲۲۴، ۱۷۸، ۱۱۷، ۱۹، ۳۴، ۴۵، ۲۰۰، ۲۱۸، ۱۵۳ (۱۵) تاریخ عروج عہد انگلشیہ از مولوی ذکاء اللہ ص ۳۰، ۱۲۰، ۱۹۳، ۶۹، ۲۶۹، ۱۹۰، ۱۰۰۱، ۵۰۰، ۴۹۲، ۷۸۶، ۷۲۶، ۴۹۱، ۷۱۹، ۷۱۷، ۷۱۱، ۷۲۱، ۴۹۰

۱۶۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد از رئیس احمد جعفری ص ۵۹، ۸۰، ۱۴، ۶۰۷، ۸، ۱۱۱، ۲۱، ۲۵۰، ۲۹۶، ۸۳، ۸۸، ۴۸، ۸۸، ۳۱، ۴۳، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۷۰، ۸۰۳، ۸۱۳، ۸۲۴، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۲۸، ۹۳۶، ۹۳۸، ۹۴۸، ۸۴۸، ۸۷۸ - ۷۵۷، ۹۳۱، ۹۴۰، ۱۲۵، ۱۲۵۸، ۹۳۸، ۹۲۸، ۱۲۸، ۹۸۹، ۹۶، ۱۳۰۶، ۹۶۶، ۸۷، ۹۷ - ۱۰۷۹، ۹۶۱ - ۱۰۶۵ -

سوانح علامہ فضل حق خیرآبادی

مع ضمیمہ سلسلۂ تلامذہ

از

مولانا محمد عبدالشاہد خان شروانی

وہ امامِ فلسفہ وہ نازشِ علم و سخن

از جناب امیر البیان سہروردی

وہ امامِ فلسفہ وہ نازشِ علم و سخن	جس نے زندہ کر دیا تھا قصۂ دار و رسن
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنستا رہا	اللہ اللہ جنگِ آزادی کے حُر کا بانکپن
زندگی اس کی سراپا سوز و سازِ عشق تھی	دانش و حکمت میں حاصل تھا اسے معراجِ فن
دیوِ استبداد اس سے لرزہ براندام تھا	اس کی شمشیرِ قلم سے کانپتا تھا اہرمن
ساحروں کی طاقتوں کا توڑ کر زورِ جنوں	اس نے پیدا کی تھی آزادی کی ہر دل میں لگن
اس نے سمجھایا "نہیں ممکن نظیرِ مصطفٰے"	گونجتا ہے آج تک یہ نعرۂ باطل شکن
کانپ اٹھا اس کے فتووں سے فرنگی سامراج	اس کے نعروں سے ہوئے بیدار شیرانِ وطن
وہ خطیبِ حریت، شعلہ نوا، جوش آفریں	جامعِ دہلی کو گرماتا رہا جس کا سخن
جس کا وہ فرزندِ فاضل، اس کی بھی یادگار،	عاشقِ محبوبِ رب، عبدِ خدائے ذوالمنن
ہند میں روشن کیا جس نے چراغِ فلسفہ	پیکرِ علم و ہنر، ظلمت میں شمعِ انجمن
آسمانِ اہلِ سنت کا درخشاں آفتاب	ہند کے ظلمت کدوں پر جو رہا جلوہ فگن

مردِ حر، غازی، مجاہد، حق پرست و فضلِ حق
تھا کتابِ حریت کا بے گماں پہلا ورق

(اضافہ از ناشر)	(رضائے مصطفٰے، صفر ۱۳۸۰ھ)

علامہ محمد عبد الحق خیرآبادی۔

تمہید

حامداً و مصلیاً و مسلماً

اہل اسلام کی ترویجِ علمی اور زمینِ ہند کی شادابی

ہندوستان جنت نشان، جہاں اپنی زرخیزی، صنعت و حرفت، اور ام پیداوار کی وجہ سے ہمیشہ سے ایک خاص شہرت کا مالک رہا ہے۔ وہیں اہلِ فضل و کمال کا گہوارہ بھی بنا رہا ہے۔ فلاسفہ و حکماءِ ہند کی خدمت میں استفادہ کے لئے دوسرے ملکوں سے محقق آتے رہے ہیں۔ سکندر ذوالقرنین کے حملۂ ہندوستان اور رائے فور بادشاہِ ہند پر فتح پانے کے بعد ہندوستانیوں نے سکندر کے مقرر کردہ حاکم کو قتل کر کے رائے دابشلیم کو اپنا بادشاہ بنالیا تھا۔ اس بادشاہ نے اس احسان کا بدلہ رعایا پر ظلم و ستم سے دیا۔ کسی کی اتنی جال نہ تھی کہ بادشاہ کو نصیحت کر سکے۔ یا کوئی صحیح مشورہ دے سکے۔ پنڈت حکیم، بیدپا فلسفی نے اپنے شاگردوں کو جمع کر کے اس اہم مسئلہ پر رائے طلب کی۔ بالآخر تجویز کے ماتحت ایک کتاب لکھی گئی جس میں جانوروں کی زبان سے عدل و انصاف کے قصّے تحریر کئے گئے۔ اور اس حیلہ سے ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کتاب کی نقل کے لئے نوشیرواں شاہِ فارس نے پنے مشیرِ خاص حکیم برزدیہ کو ہندوستان بھیجا۔ اور اس کی نقل کرا کے فارسی یں ترجمہ کرایا۔

یہ کتاب اب کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی، یونانی، عبرانی، ترکی، عربی، اردو اور دوسری مشہور زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ربی زبان میں فارسی سے عبداللہ بن المقفع الخطیب الفارسی مصاحبِ ابوجعفر المنصور لعباسی خلیفۂ ثانی نے سب سے پہلے ترجمہ کیا[1]

---

[1] طبقات الامم ص ۱۲

قدیم زمانے میں جب کہ شاہان چین و ترک و فارس و روم کو علی الترتیب ملک الناس، ملک السباع، ملک الملوک اور ملک الرجال کہا جاتا تھا۔ ہندوستان کو معدن الحکمۃ اور اس کے بادشاہ کو ملک الحکمۃ کے باوقعت لقب سے یاد کیا جاتا تھا[1]۔

فلسفہ و حکمت میں اہل ہند اپنی مستقل رائے رکھتے تھے[2]۔ ہندوستان کی قدیم ہندو منطق کی بنیاد گوتم رشی نے علاقہ ترہت (دربھنگہ) بہار میں ڈالی تھی جو نیائے شاستر کے نام سے مشہور رہے۔

راجگان و امرائے ہند کی صاحبان علم و فضل کی قدر دانیاں، تاریخی کتب کی ورق گردانی اور جے پور وغیرہ کی عالیشان رصد گاہوں سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی اور پہلی صدی ہجری سے ہی مسلمانوں کے قدم اس ملک میں جمنا شروع ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے متداول علوم نے بھی اپنی جگہ بنانا شروع کی۔

اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دور خلافت ۹۲ھ مطابق ۷۱۲ء محمد قاسم ثقفی اٹھارہ سالہ نوجوان نے سندھ پر قبضہ کیا۔ ۹۵ھ میں قنوج تک رسائی ہوئی۔ اس طرح خلفاء امویہ و عباسیہ کی فتوحات پانچویں صدی ہجری تک دیبالپور تک پہنچ چکی تھیں۔ چوتھی صدی کے آخر میں سلطان محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے۔ ۴۱۷ھ میں خلیفہ القادر باللہ عباسی کے حکام سے سندھ چھین لیا۔ ۵۸۲ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے خسرو پرویز کو گرفتار کر کے دہلی کو دار السلطنت قرار دیا۔ اور سارے ملک ہند پر قبضہ جما لیا۔

۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی ۶۹۰ برس مسلسل حکومت رہی۔ باضابطہ اور بے ضابطہ ۷۶ بادشاہ ہوئے۔ آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر تھے[3]۔ ہر دور میں علماء و اولیاء آتے رہے۔ ظاہری سلطنت کی طرح باطنی حکومت

---

[1] طبقات الامم ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۱۳ [3] ارمغان ہندوستان۔

بھی اپنا کام کرتی رہی۔

ابوحفص ربیع بن صبیح السعدی البصری المتوفی سنہ ۱۶۰ھ شاگرد امام الاولیاء حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سندھ ہی میں وفات کے بعد دفن ہوئے۔ یہ بزرگ سفیان ثوری اور وکیع (استاد امام شافعی) کے استاد تھے۔ ان کے علاوہ علی بن عثمان الہجویری المتوفی سنہ ۴۶۵ھ شاہ یوسف گردیزی، شیخ فخر الدین زنجانی، خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیری المتوفی سنہ ۶۳۳ھ شیخ ابوزکریا ابو محمد بہاء الدین بغدادی ملتانی المتوفی سنہ ۶۶۱ھ وغیرہم اپنے علوم و معارف سے اہل ہند کو مستفیض فرماتے رہے۔

مذہبی علوم اسلام کی طرح صیقل شدہ فنون یونانی بھی مسلمانوں ہی کے ذریعہ پہنچے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منطق و فلسفہ کو اس بلند مقام تک مسلمان علماء ہی نے پہنچایا۔

یوں تو منطق ایک فطری علم ہے۔ کسی مقصد پر دلیل و برہان پیش کرنا، قیاس کرکے نتیجہ نکالنا، افکارِ ذہنیہ کو خطا سے بچانا، اسی کا نام منطق ہے۔ اور معمولی سمجھ کا آدمی بھی اسی کی کوشش کرتا ہے۔

اس علم کا باضابطہ اظہار سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوا مخالفین کو عاجز و ساکت کرنے کے لئے بطور معجزہ اس کا استعمال کیا گیا[1] پھر ان علوم کو یونانیوں نے اپنایا۔ یونان میں بڑے رتبے کے یہ پانچ مشہور فلسفی گذرے ہیں۔

① بندقلیس سنہ ھ قبل مسیح زمانہ داؤد علیہ السلام میں گذرا ہے۔ حضرت لقمان سے علمِ حکمت حاصل کرنے کے بعد یونان واپس آگیا۔

② فیثاغورس۔ اصحاب سلیمان علیہ السلام کا شاگرد ہے۔

③ سقراط۔ فیثاغورس کا شاگرد ہے۔ بتوں کی پرستش سے مخلوق کو روکنے اور دلائل کے ساتھ خالقِ واحد کی طرف توجہ دلانے پر بادشاہِ وقت نے قید کرکے زہر دلا دیا۔

④ افلاطون۔ یہ بھی فیثاغورس کا شاگرد اور خاندانِ اہل علم سے ہے۔ سقراط کی موجودگی میں گمنام رہا۔ اس کے بعد چمکا۔ اور خوب چمکا۔

---

[1] اخبار الحکماء قفطی صفحہ ۲

⑤ ارسطاطالیس نیقوماخوس کا بیٹا ہے اور صاحب المنطق کے لقب سے مشہور ہے خاتم حکماء یونان کہا جاتا ہے۔ بعد کے سارے فلاسفہ اسی کے رہین منت اور خوشہ چین ہیں۔

ان پانچ کے بعد دوسرے درجہ پر تالیس الملطی صاحب فیثاغورس ذیمقراطیس اور انکساغوراس ہیں۔

ارسطو کی کتابوں کے شارح ہونے کی حیثیت سے ۹ فلسفی مشہور رہیں۔ یہ سب مقلد تھے مجتہد نہ تھے۔

ثاؤفرسطس، اصطفن، لیس یحیی بطریق اسکندریہ، انطونیوس، سبلیقوس، ثمباد فرفوریوس، ثماسطیوس، افرودیسی (اسکندر) ان میں آخر الذکر تینوں شراح اونچے درجہ کے مالک ہیں۔

یونان میں مخصوص فنون کے کامل بھی بڑے بڑے نامور گذرے ہیں۔ بقراط و جالینوس علم طبعیات وطب میں، اقلیدس علم ہندسہ میں، ارشمیدس علم الدوائر میں، بطلیموس اور دیوجانس کلبی علم المناظر والنجوم میں اپنی نظیر آپ تھے[1] ہر ایک فن میں یگانۂ روزگار تھا۔ آج بھی ان سب کے نام زبان زد خواص اہل علم ہیں۔

مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلے عباسیہ خاندان کے خلیفۂ ثانی ابوجعفر المنصور عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے علم فقہ کے ساتھ علم فلسفہ و منطق و ہیئت کو بھی حاصل کیا۔ اس کے کاتب عبداللہ بن المقفع الخطیب الفارسی مترجم کلیلہ و دمنہ نے ارسطو کی تین کتابوں قاطیغوریاس، باری ارمیناس، اور انالوطیقا کا عربی میں ترجمہ کرکے منطقی کے لقب سے شہرت حاصل کی[2]۔

ارسطو سے لے کر خلافت عباسیہ تک گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں۔ علوم فلسفہ کی کوئی ترقی نہ ہو سکی گویا بازار سرد پڑ چکا تھا۔ ساتواں خلیفۂ عباسی مامون الرشید جب ۱۹۸ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا تو اپنے ذوق کی بنا پر ان فنون کی طرف متوجہ ہوا قیصر روم کو لکھا وہاں سے ارسطو کی کتابوں کا ڈھیر آگیا۔ وزیر جمال الدین قفطی اخبار الحکماء میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] طبقات الامم اندلسی صفحہ ۱۹-۳۲ [2] ایضاً صفحہ ۴۸، ۴۹۔

ولما سیرت الکتاب الی المامون جاء بعضها تاما وبعضها ناقصا فالناقص منها ناقص الی الاٰن۔	ترجمہ:۔ ارسطو کی کتابیں (روم کے کتب خانہ سے) جو مامون کے پاس پہنچیں۔ ان میں بعض مکمل اور بعض ناقص تھیں جو ناقص تھیں وہ اب تک ناقص ہیں۔

مامون الرشید نے حنین بن اسحاق الکندی اور ثابت بن قرہ وغیرہما کو عربی ترجمہ کا حکم دیا۔ اس طرح شروع تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن این وجدھا فھو احق بھا پر عمل پیرا ہو کر اپنی وراثت سمجھتے ہوئے آب و تاب کے ساتھ ان علوم کو چمکایا۔ چوتھی صدی ہجری میں شاہ منصور بن نوح سامانی کی درخواست پر حکیم ابو النصر فارابی نے ان کی ترجیح و تذہیب کر کے معلم ثانی کا لقب پایا۔ اور فلسفۂ ارسطو میں مہارت پیدا کر کے تقریباً دو درجن تصانیف کیں جو سلطان مسعود کے زمانہ تک اصفہان کے کتبخانہ صوان الحکمۃ کی زینت بنی رہیں۔ سلطان مسعود نے شیخ الرئیس ابو علی بن سینا (المتوفی سنہ ۴۲۸ھ ۱۰۳۷ء) کو اپنا وزیر بنا کر تصانیف فارابی سے اقتباس کرا کے کتابیں لکھوائیں۔ اتفاق سے کتبخانہ نذرِ آتش ہو گیا تو ابن سینا محافظ علوم بن گیا۔ اب جو کچھ ہے اسی کی محنت کا ثمر ہے۔

ابو محمد بن احمد اندلسی وزیر عبد الرحمٰن مستظہر باللہ محمد زکریا رازی صاحب صد تصانیف المتوفی سنہ ۳۲۰ھ ۹۳۲ء (عہد منصور بن اسمٰعیل سامانی) نے بھی چوتھی صدی ہجری میں اس پودے کو پروان چڑھانے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ آخر الذکر نے فلسفۂ ارسطو کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیریں۔ اور اعتراضات و شبہات کا بے پناہ ذخیرہ کتابوں میں چھوڑا۔

پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد امام ابو حامد محمد الغزالی المتوفی سنہ ۵۰۵ھ علامہ ابن رشد المتوفی سنہ ۵۹۵ھ ۱۱۹۸ء امام فخر الدین رازی المتوفی سنہ ۶۰۶ھ ابن تیمیہ الحرانی المتوفی سنہ ۷۲۸ھ ۱۳۲۷ء نجم الدین نخجوانی، ابن سہلان اور افضل الدین خونجی وغیرہم نے ان فنون میں نئی نئی باریکیاں پیدا کیں۔ اجتہادات کئے۔ آخر الذکر کی کتابیں دو سو سال تک داخل نصاب رہیں۔ مؤرخ ابن خلدون نے

وعلی کتبہ معتمد المشارقۃ لہذا العہد۔ اس کی کتابوں کو اس عہد کے علماء مشرق کا اعتماد حاصل ہے۔

لکھ کر سند اہمیت عطا کر دی ہے۔

شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی نے مشائیہ (متبعین ارسطالیس) کے معتقدات پر ضرب کاری لگا کر نئے باب کا اضافہ کر دیا۔

نصیر الدین طوسی، قطب الدین رازی، صدر الدین شیرازی، ملا جلال محقق دوانی ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ و فرائد وغیرہم نے اس فن کو چار چاند لگائے۔ یوں تو شاہان اسلام کی قدر افزائیوں نے اطراف و اکناف عالم کے مشاہیر و فضلا، کو ہندوستان کی طرف متوجہ کر دیا تھا لیکن سلاطین مغلیہ کے عہد میں عرب و عجم کے اہل فضل و کمال کا یہ ملک مسکن بن گیا تھا۔

حضرت امیر خسرو کو یکے بعد دیگرے سات بادشاہوں کے دربار میں اعزاز حاصل ہوا مختلف انقلابات دیکھے لیکن ہندوستان سے منہ نہ موڑا۔

شعراء میں نظیری نیشاپوری، ملک قمی، عرفی شیرازی، ظہوری، غزالی، مشہدی عالی شیرازی، کلیم ہمدانی، غنی کشمیری۔

اطباء میں۔ حکیم بینا، حکیم علی، حکیم الملک گیلانی، حکیم عین الملک شیرازی، حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم ہمام گیلانی، مسیح الملک شیرازی۔

کتّاب میں: شیریں قلم، زرّیں قلم، ہفت قلم۔

علماء میں: شیخ حسین موصلی، امیر فتح اللہ شیرازی المتوفی سنہ ۹۹۷ھ مولانا میرزا سمرقندی، میر اسلم ہروی المتوفی سنہ ۱۰۶۱ھ میر زاہد ہروی. المتوفی سنہ ۱۱۰۱ھ مولانا میر کلاں معلّم جہانگیر المتوفی سنہ ۹۸۱ھ مولانا صدر جہاں، مولانا غازی خاں بدخشی وغیرہم۔

ان کے علاوہ دوسرے فنون کے ماہرین نے شاہی درباروں کو رونق بخشی تھی۔

ہندوستان درحقیقت جنت نشان بن گیا تھا۔ علوم و معارف کے دریا بہ رہے تھے۔ روحانیت کے چشمے ابل رہے تھے۔

مسلمان بادشاہوں کی قدر دانی کے صرف دو واقعات شہادت کے لئے کافی ہیں سلطان محمد تغلق تغلق شاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو قاضی عضد الدین صاحب مواقف کی خدمت میں شیراز بھیج کر درخواست کی کہ ہر قیمت پر ہندستان تشریف لا کر

متن مواقف کو میرے نام پر معنون کر دیجئے۔ سلطان ابو اسحاق والی شیراز کو پتہ چلا تو دوڑا ہوا علامہ قاضی کی خدمت میں پہنچ کر عرض پرداز ہوا کہ ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں، تخت سلطنت کی خواہش ہو تو دستبردار ہونے کو تیار ہوں خدا کے لئے شیراز کو یتیم نہ بنائیے۔ قاضی صاحب نے سلطان کی تواضع کی قدردانی سے متأثر ہو کر ارادہ بدل دیا اور سلطان ہی کے نام پر کتاب معنون کر کے ہمیشہ کیلئے زندۂ جاوید بنا دیا[لہ]

دوسرا واقعہ امیر فتح اللہ شیرازی سے متعلق ہے۔ عادل شاہ بیجاپوری نے ہزار دل خواہشوں کے ساتھ دکن بلا کر اپنا وکیل مطلق بنایا۔ ۹۹۱؁ھ میں اکبر بادشاہ نے صدرِ کل بنا کر ۹۹۳؁ھ میں امین الملک اور عضد الدولہ کے خطاب سے نوازا۔ ہندوستان کے مشاہیر علماء ان کے حلقۂ درس میں شریک رہے۔ محقق دوانی، صدر شیرازی، میر غیاث الدین منصور اور میرزا جان کی تصانیف ہندوستان لا کر داخل نصاب کیں۔ انھیں کے زمانے سے علوم عقلیہ کو شاندار فروغ حاصل ہوا۔ ۹۹۷؁ھ میں ان کے انتقال پر اکبر بادشاہ کے الفاظ نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

مآثر الکرام میں ہے:۔

پادشاہ از فوت میر بسیار متاسف شد و بر زبان گذرانید کہ میر وکیل و طبیب و منجم ما بود، اندازۂ سوگواری کہ تواند شناخت۔ اگر بدست فرنگ افتادے و ہمگی خزائن در برابر خواستے، دریں سودا فراوان سود کردے، و آن گرامی جنس ارزاں خریدے۔

فیضی گوید:۔
شہنشاہ جہاں را در وفاتش سینہ پر نم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کافلاطوں ز عالم شد

یہی وہ قدردانی اور عزت افزائی تھی جس کی وجہ سے سارے عالم سے مشاہیر وقت کھنچے چلے آ رہے تھے۔ علوم کی بارش ہو رہی تھی۔

[لہ] مآثر الکرام دفتر اول ص ۱۸۵

علامہ فضلِ حق خیر آبادی

علامہ فضلِ حق خیر آبادی کے مورثانِ اعلیٰ شمس الدین اور بہار الدین دونوں بھائیوں نے بھی ہندوستان کو رونق بخش کر عہدے سنبھالے۔

ولادت و نسب:۔ علامہ فضلِ حق خیر آبادی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیر آباد میں پیدا ہوئے[1] آپ کے والد ماجد مولانا فضلِ امام خیر آبادی علماء عصر میں ممتاز اور علوم عقلیہ کے اعلیٰ درجہ پر سرفراز تھے۔ دار السلطنت دہلی میں صدر الصدور کے عہدہ جلیلہ پر فائز اور دینی و دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھے۔ مولانا کے والد مولانا محمد ارشد ہرگام سے خیر آباد آکر سکونت پذیر ہوئے۔

شجرۂ نسب یہ ہے:۔

فضل حق بن مولانا فضل امام بن شیخ محمد ارشد بن حافظ محمد صالح بن ملا عبد الواجد بن عبد الماجد بن قاضی صدر الدین بن قاضی اسمٰعیل ہرگامی بن قاضی عماد بدایونی بن شیخ ارزانی البدایونی بن شیخ منور بن شیخ خطیر الملک بن شیخ سالار شام بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاء الدین بن شیر الملک شاہ ایرانی بن شاہ عطاء الملک بن ملک بادشاہ بن حاکم بن عادل بن تاروں بن جرجیس بن احمد نامدار بن محمد شہریار بن محمد عثمان بن دامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبد اللہ بن محمد بن عبید اللہ بن امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ۔

اس طرح ۳۲ واسطوں سے خلیفۂ ثانی تک نسب گرامی پہنچتا ہے۔ علامہ کے مورثِ اعلیٰ شیر الملک بن شاہ عطاء الملک ایرانی کے مورثان ایک قطعہ ملک ایران پر قابض و حکمران تھے۔ زوالِ ریاست پر دولت علم کمائی، شیر الملک کے دو صاحبزادے بہار الدین اور شمس الدین ذی علم بزرگ تھے۔ اس وقت ہندوستان قدر دانیٔ علماء و مشاہیر میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ اہل کمال ادھر کھنچ رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی کے

---

[1] دیباچہ ہدیہ سعیدیہ۔

ایران سے وارد ہندوستان ہوئے۔ شمس الدین نے مسندِ افتاءِ رہتک سنبھالی۔ شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم محدث دہلوی انھیں کی اولاد سے تھے[1]۔ بہار الدین قبۃ الاسلام بدایوں کے مفتی ہوئے۔ ان کی اولاد میں شیخ ارزانی بدایونی نامور بزرگ اور اعلیٰ درجہ کے مفتی ہوئے ہیں۔ شیخ عماد الدین بن شیخ ارزانی تحصیل علم کی خاطر قاضی ہرگام (ضلع سیتاپور اودھ) کی خدمت بابرکت میں پہنچے۔ قاضی صاحب نے تحقیق شرافت و نجابت کے بعد اپنا داماد بنالیا۔ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد قاضی ہرگام بن گئے۔[2] وہیں شیخ اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ جو اپنے نانا اور والد کے بعد قاضی بنے۔ شیخ سعدی[3] کاکوروی کی دختر سے شادی ہوئی جن سے قاضی صدر الدین پیدا ہوئے جن کا شمار مشاہیر وقت میں تھا۔

قاضی صاحب کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ ایک صاحبزادے ملا ابو الواعظ اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے اتالیق رہے اور فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین میں سے ہیں۔ ہدایہ و مطول و ملا جلال پر حواشی لکھے۔ ان کی شخصیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی (والد استاذ الکل ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی فرنگی محلی) ان سے ملاقات کے لئے ہرگام پہنچے تھے۔ علامہ محب اللہ بہاری صاحب سلّم و مسلّم آپ کے درس میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ آپ کے پاس وقت نہ تھا اس لئے سہالی جاکر ملا قطب الدین شہید کے شاگرد ہو گئے۔[5]

دوسرے صاحبزادے ملا عبد الماجد کے خلف الصدق ملا عبد الواجد فاضل جلیل تھے۔ کافیہ کی مبسوط شرح اور حاشیۂ اقلیدس لکھا۔ ملا سید عبد الواجد کرمانی خیرآبادی (استاذ مولانا فضل امام خیرآبادی) نے کتاب خانۂ ملا قطب الدین بن قاضی شہاب الدین گوپاموی المتوفی سنہ ۱۱۶۰ھ میں یہ حاشیۂ اقلیدس دیکھ کر فرمایا:۔

"کہ من حواشی ملا کہ بر تحریر اقلیدس نوشتہ دیدہ ام بغایت خوب نوشتہ"۔

دخترِ قاضی صدر الدین سے نسلِ مفتیان گوپامؤ ہے[6] اسی خاندان کے ایک،

---

[1] حیات شاہ ولی اللہ [2] قاضی ہرگام دختر خود را قاضی عماد الدین معروف عماد کتخدا کردند بعد قاضی ہرگام قاضی عماد بر مسند قضاے ہرگام مامور شدند ہماں جا وفات یافت و مدفون گردید تذکرۃ الانساب مولوی مصطفےٰ علی خاں گوپاموی [3] منتخب التواریخ [4] سیر العلماء [5] آمد نامہ مولانا فضل امام خیرآبادی [6] تذکرۃ الانساب۔

علمی فرد مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی مفتی محکمۂ قضاۃ دہلی و معاصر علامہ تھے۔ یہ خاتون مفتی عبید اللہ شہابی برادر کلاں ملا وجیہ الدین گوپاموی مؤلف ربع فتاویٰ عالمگیری کو بیاہی گئی تھیں۔

دوسری صاحبزادی خاندان صدیقیاں قصبہ لاہرپور (ضلع سیتاپور) میں منسوب ہوئیں۔ اس خاندان کے ایک بزرگ روم سے واردِ ہند ہو کر اقامت گزینِ اودھ ہوئے۔ جن صدیقی صاحب کو یہ صاحبزادی منسوب ہوئیں جب ان کا پیغام آیا تو قاضی صاحب نے حسب و نسب دریافت کیا:۔

> آں بزرگ گفت کہ من صحیح النسب صدیقی ہستم۔ زہر اژدہا بمن اثر نمی کند اگر شما بخواہند تجربہ نمایند قاضی گفت کہ ایں در مار گیراں می باشد ایں را اعتبار نیست۔ بہ روم رفتہ نسب نامۂ خود بخط کوفی بمواہیر سلطان و قاضی و مفتی و دیگر اکابران روم آورد۔ آں قاضی مسطور دختر خود را باآں بزرگ کتخدا کرد۔ حالا در فرزندانِ بزرگ نسب نامہ مذکور موجود است۔ [1]

ملا عبد الواجد بن قاضی عبد الماجد بن قاضی صدر الدین ہرگامی کے متعلق مولانا فضل امام خیرآبادی آمد نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> „ملا عبد الواجد ہرگامی جدّ اعلیٰ محررِ اوراق فاضلے بود متبحر بر کافیہ شرح بسوط و بر تحریر اقلیدس حاشیہ و تعلیقات متفرقہ بر ہدایہ نوشتہ بود چوں در عہد بہادر شاہ اول تمام اسباب آبائی قصبہ ہرگام بتاراج رفت۔ و دیگر مردم اشرار کتب   آتش دادند ہمہ کتب خانہ سوخت و برباد شد......   در ہرگام وفات یافت ہمانجا مدفون شد۔“

ملا عبد الواحد کے صاحبزادے اور علامہ کے پردادا حافظ محمد صالح تھے۔ عہدِ محمد شاہ بادشاہ میں منصب پر فائز تھے۔ جاگیر شاہی ملی ہوئی تھی۔ قاضی مبارک گوپاموی شارح سلم کے معاصر و دوست اور مؤلف تذکرۃ الاولیاء تھے۔

حافظ محمد صالح کے دو صاحبزادے شیخ جعفر ہرگامی اور شیخ محمد ارشد ہرگامی،

---

[1] آمد نامہ۔

خیرآبادی اور دو صاحبزادیاں متولد ہوئیں۔ ایک صاحبزادی ملا معزالدین گوپاموی اور دوسری شیخ خیرالدین فاروقی بن شیخ خیراللہ العمری گوپاموی (از اقربائے نواب والاجاہ محمد علی) کو منسوب ہوئیں

علامہ کے دادا شیخ محمد راشد نے ہرگام کو خیرباد کہہ کر خیرآباد (ضلع سیتاپور اودھ) آباد کیا۔ موصوف کی زوجۂ ثانیہ سے علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی تھے۔[1]

---

[1] مولانا محمد ارشد نے دو شادیاں کیں۔ زوجۂ اولیٰ خاندان مفتیان لکھنؤ سے تھیں۔ ان سے احمد حسین میاں عرف فقیرا میاں صاحبزادے اور رحم النساء صاحبزادی ہوئیں۔ احمد حسین میاں کے صاحبزادے مولوی فضل احمد کے تین صاحبزادے تھے۔ (۱) منشی کرم احمد آپ امجد علی شاہ فرمانروائے اودھ کے وزیر اعظم نواب شرف الدولہ بہادر کے میر منشی تھے (۲) منشی حسن احمد آپ مولوی عنایت احمد وکیل دہلی کے والد تھے (۳) منشی حسین احمد آپ نواب بشیر احمد مرحوم داماد ہز ہائنس نواب عظیم جاہ انتظام الملک بہادر سوم پرنس آف ارکاٹ (مدراس) کے والد تھے۔ جن کے خلف الصدق مولوی ظہیر احمد فاروقی، رئیس و متولی مدرسہ عربیہ نیازیہ خیرآباد و لائف مجسٹریٹ، راقم السطور کے قدیمی کرم فرما اور بلند کردار بزرگ ہیں اس خاندانی شجرہ اور دوسرے معلومات میں موصوف نے بڑا ہاتھ بٹایا ہے۔

دو صاحبزادیاں تھیں ایک علامہ کی شریک حیات اور مولانا محمد عبدالحق کی والدہ ماجدہ تھیں اور دوسری خان بہادر نواب مظہر علی داماد ہز ہائنس آف ارکاٹ کی والدہ تھیں۔ دوسری زوجہ سید محمد شکر اللہ کی دختر تھیں جو فرزندان قطب وقت مخدوم اللہ دیا خیرآبادی سے تھے ان سے حسب ذیل اولاد ہوئی:۔

مولانا فضل امام، مولوی محمد صالح، بی بی عائشہ، ان بی بی صاحبہ کی صاحبزادی علیمہ حضرت شیخ وقت معشوق علی شاہ خیرآبادی کی زوجہ تھیں۔ دو صاحبزادے منشی برکت علی خاں، مولانا قادر بخش برادر مولانا نبی بخش خیرآبادی کے خسر اور جنرل ایکٹرلونی کے میر منشی تھے۔ مولوی محمد صالح کی صاحبزادی بی بی نعمت اور صاحبزادے مولوی الٰہی بخش نازش خیرآبادی تھے۔

مولانا فضل امام نے تین شادیاں کیں، پہلی بی بی صدرپور کی تھیں۔ ان سے علامہ فضل حق مولانا فضل عظیم اور مولوی فضل رحمٰن پیدا ہوئے۔ مولانا فضل عظیم کی ایک صاحبزادی بی بی امتل تھیں

مولانا فضل امام

موصوف بڑے طبّاع و ذہین تھے۔ سید عبد الواجد کرمانی خیرآبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ علوم نقلیہ و عقلیہ انھیں سے حاصل کئے۔ اس کے بعد صدر الصدوری کے عہدۂ جلیلہ پر دہلی جاکر فائز ہوئے تذکرہ علمائے ہند میں ہے :-

(آگے ص ۱۳۷ پر)

(بقیہ ص ۱۳۲ کا) جن کے صاحبزادے سید نیاز علی تھے۔ (از خاندان مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ) سید نیاز کی شادی نور الحسن خاں ابن مولوی قادر بخش کی دختر سے ہوئی۔ مولوی فضل رحمٰن نے دو شادیاں کیں پہلی بی بی سے دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ بی بی مریم زوجہ نور الحسن خاں۔ بی بی ہاجرہ بیگم زوجہ شمس العلماء مولانا محمد عبد الحق خیرآبادی۔ بی بی ہاجرہ سے بی بی عائشہ پیدا ہوئیں جو صوفی محمد حسین بسمل برادر مضطر خیرآبادی کی زوجہ تھیں۔ مولوی فضل رحمٰن کی دوسری زوجہ سے جو دہلی کی تھیں دو صاحبزادے مولوی فضل حکیم اور مولوی فضل علیم پیدا ہوئے۔ اول الذکر کے صاحبزادے خان بہادر فضل متین سشن جج ریاست پٹیالہ تھے۔ آخر الذکر کی دو صاحبزادیاں تھیں ایک کا عقد سید اعجاز الحسن رئیس خیرآباد سے ہوا جن کے صاحبزادے خان بہادر سید احراز الحسن خاں چیرمین میونسپل بورڈ خیرآباد ہیں۔ (موصوف تقریباً تیس سال سے مسلسل چیرمین ہوتے ہیں جو ایک ریکارڈ ہے) دوسری صاحبزادی دہلی میں منسوب تھیں انھیں صدر پور کی بی بی صاحبہ سے تین صاحبزادیاں بھی ہوئیں۔ نور النساء اہلیہ غلام مخدوم سندیلوی۔ مہر النساء اہلیہ یکے از خاندان نوابان گوپامؤ۔ ظہور النساء اہلیہ قاضی غلام حسین بن غلام محمد۔ دوسری زوجہ مولوی نور محمد لاہرپوری کے خاندان سے تھیں ان کے بطن سے حرمت بی بی اہلیہ حسن احمد لحاظؔ ناکتخدا۔ خدیجہ اہلیہ سید محمد بخش بن امانت اللہ بلیاپوری۔ سرفراز بیگم اہلیہ مولوی ارشاد حسین خیرآبادی وکیل ٹونک۔ اور امتیاز النساء اہلیہ حکیم ابو علی سندیلوی و خوشدامن مولانا عبد الحق خیرآبادی پیدا ہوئیں۔ تیسری دختر خدیجہ کے صاحبزادے حاجی لطف احمد تھے جنکی دختر کلثوم النساء مفتی حاجی سید فخر الحسن رئیس خیرآباد کو منسوب ہوئیں۔ مفتی صاحب موصوف نے دوسری شادی دختر یعقوب علی سندیلوی سے کی جن سے دو صاحبزادے مولوی سید نجم الحسن اور سید ضیاء الحسن اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی صالح نوجوان، پاک سیرت، پاکباز ہیں۔ راقم السطور کے ساتھ خیرآباد و اجمیر میں گیارہ سال تک شریک درس رہے ہیں۔ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری سے آخر وقت تک استفادہ کیا ہے۔ اپنے مکان سے متصل جدّ اعلیٰ مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں صبح کو درس قرآن پاک اور اس کے بعد مختلف فنون کی کتابیں پڑھا کر اجر عظیم حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت خیرآبادی حضرات میں مولوی حافظ حکیم احمد علی کے بعد دوسرے عالم ہیں۔ لیکن مشغلۂ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ صرف انھیں سے جاری ہے۔ مولانا فضل امام کے پردادا استاذ مولانا حاجی صفت اللہ صاحب محدث خیرآبادی کی اولاد امجاد سے ہیں۔

خاندان علامہ فضل حق خیر آبادی [۱]

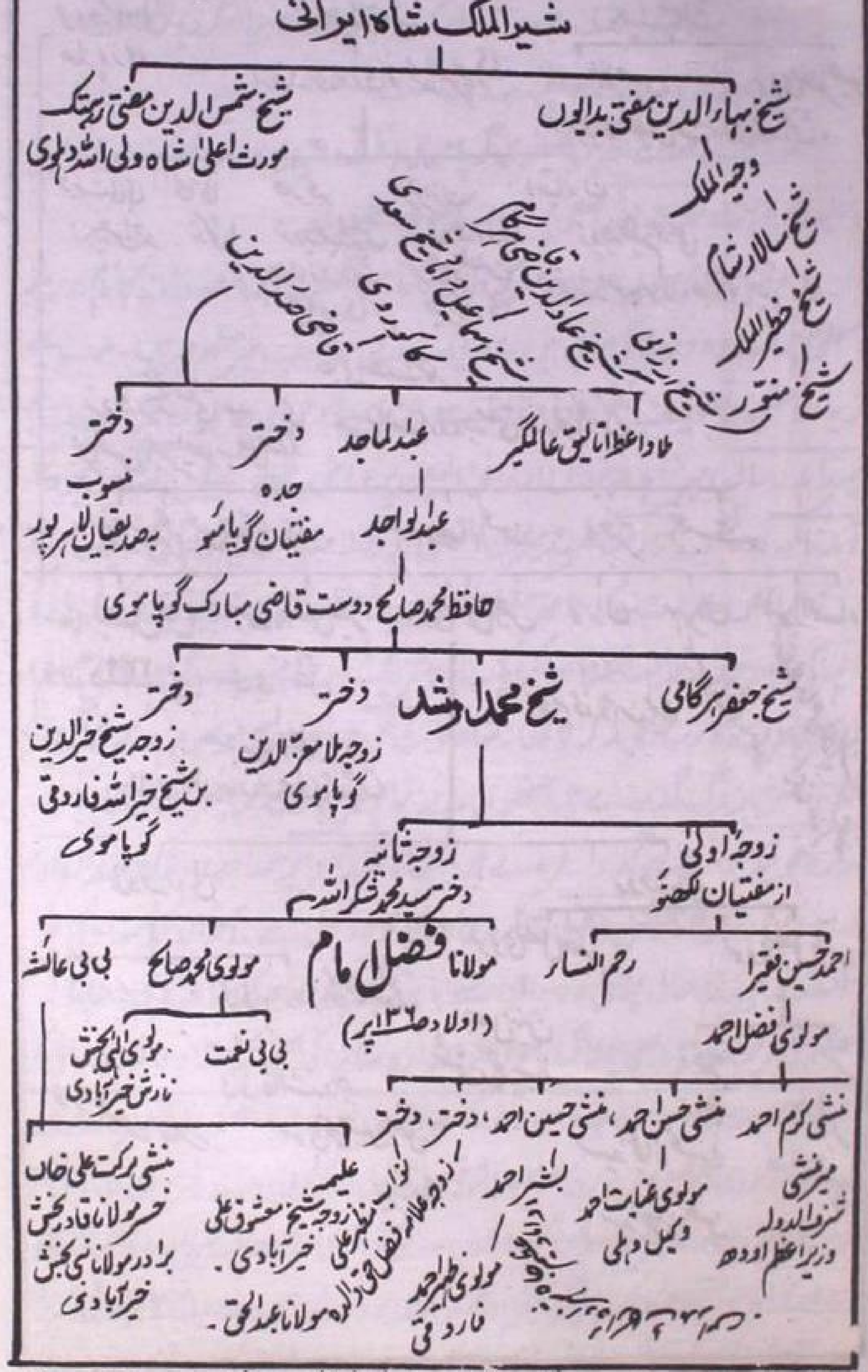
شیر الملک شاہ ایرانی
شیخ بہاء الدین مفتی بدایوں
شیخ شمس الدین مفتی رہتک
مورث اعلیٰ شاہ ولی اللہ دہلوی
وجیہ الملک
شیخ سالار شام
شیخ خیر الملک
شیخ منور
شیخ ارزانی
شیخ عماد الدین قاضی ...
شیخ اسماعیل
شیخ سعدی
محمد سعدی
قاضی صدر الدین
ملا واعظ اتالیق عالمگیر
عبد الماجد
دختر
جدہ مفتیان گوپامو
دختر
منسوب بصد یقیان لاہرپور
عبد الواجد
حافظ محمد صالح دوست قاضی مبارک گوپاموی
شیخ جعفر برگامی
شیخ محمد ارشد
دختر
زوجہ ملا معز الدین گوپاموی
دختر
زوجہ شیخ خیر الدین بن شیخ خیر اللہ فاروقی گوپاموی
زوجہ اولیٰ
از مفتیان لکھنؤ
زوجہ ثانیہ
دختر سید محمد شکر اللہ
احمد حسین فقیرا
رحم النساء
مولانا فضل امام
(اولاد ص۱۳۶ پر)
مولوی محمد صالح
بی بی عائشہ
مولوی فضل احمد
بی بی نعمت
مولوی الٰہی بخش
نازش خیر آبادی
منشی کرم احمد
منشی حسن احمد
منشی حسین احمد
دختر
دختر
میر منشی
شرف الدولہ
وزیر اعظم اودھ
مولوی عنایت احمد
وکیل دہلی
بشیر احمد
زوجہ علامہ فضل حق والدہ مولانا عبد الحق۔
زوجہ نواب نظر علی
مولوی ظہیر احمد
فاروقی
منشی برکت علی خاں
خسر مولانا قادر بخش
برادر مولانا نبی بخش
خیر آبادی
علیمہ
زوجہ شیخ معشوق علی
خیر آبادی۔

---

[۱] کتاب در حاشیہ میں یہ نسب نامہ مرقوم ہے جسے یہاں اسی کو نقشہ کی شکل میں پیش کر دیا ہے ۱۲ محمد احمد مصباحی۔

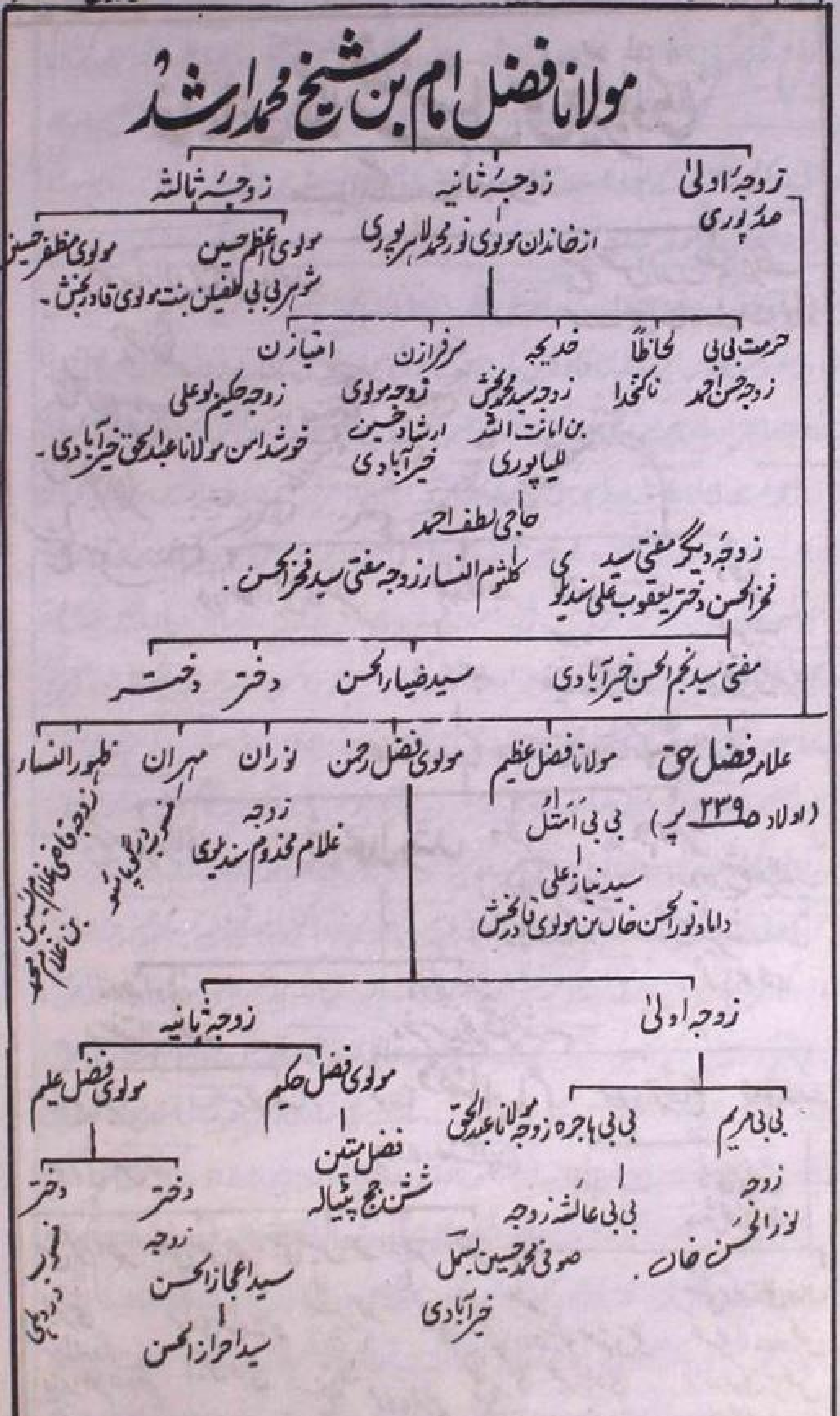
مولانا فضل امام بن شیخ محمد ارشد
زوجۂ اولیٰ
ھدرپوری
زوجۂ ثانیہ
از خاندان مولوی نور محمد لاہرپوری
زوجۂ ثالثہ
مولوی اعظم حسین
شوہر بی بی لطفین بنت مولوی قادر بخش۔
مولوی مظفر حسین
حرمت بی بی
زوجہ حسن احمد
لحاظاً
ناکتخدا
خدیجہ
زوجہ سید محمد بخش
بن امانت اللہ
للیاپوری
سرفرازن
زوجہ مولوی
ارشاد حسین
خیرآبادی
امتیازن
زوجہ حکیم نور علی
خورشد ابن مولانا عبدالحق خیرآبادی۔
حاجی لطف احمد
زوجۂ دیگر مفتی سید
فخرالحسن دختر یعقوب علی سندیلوی
بی بی
کلثوم النساء زوجہ مفتی سید فخرالحسن۔
مفتی سید نجم الحسن خیرآبادی
سید ضیاء الحسن
دختر
دختر
علامہ فضل حق
(اولاد ص ۲۳۹ پر)
مولانا فضل عظیم
بی بی امۃ الرسول
سید نیاز علی
داماد نورالحسن خاں بن مولوی قادر بخش
مولوی فضل رحمٰن
نوران
زوجہ
غلام مخدوم سندیلوی
مہران
مجذوب در [illegible]
ظہورالنساء
زوجہ قاضی غلام الحسنین بن غلام احمد
زوجہ اولیٰ
بی بی مریم
زوجہ
نورالحسن خاں۔
بی بی ہاجرہ زوجہ مولانا عبدالحق
بی بی عائشہ زوجہ
صوفی محمد حسین بسملؔ
خیرآبادی
زوجہ ثانیہ
مولوی فضل حکیم
فضل متین
سشن جج پٹیالہ
مولوی فضل علیم
دختر
زوجہ
سید اعجاز الحسن
سید احراز الحسن
دختر
مجذوب
در دہلی

وشاگرد رشید مولوی سید عبد الواجد خیرآبادی بمنصب صدر الصدوری شاہجہان آباد از سرکار انگریزی عزت و امتیاز داشت۔ بر میر زاہد رسالہ و میر زاہد ملا جلال حواشی نوشتہ در علوم عقلیہ گوئے سبقت ربودہ، آمدنامہ کہ درآں قواعد فارسی بیان کردہ ترجمہ علمائے جوار لکھنؤ تحریر فرمودہ۔ بس مفید بمبتدیان است۔

مولانا شاہ صلاح الدین صفوی گوپاموی (تلمیذ رشید مولانا محمد اعظم سندیلوی و مرید وخلیفۂ مولانا شاہ قدرت اللہ صفی پوری) کے مرید تھے۔ [1]

مولانا نے بیسیوں مفید و معرکۃ الآرا، کتابیں لکھیں۔ جن مصنفات کا نام اور پتہ معلوم ہو سکا وہ درج کی جاتی ہیں۔ دو ایک کے سوا سب غیر مطبوعہ ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور تصنیف منطق میں مرقاۃ ہے۔ جو تمام مدارس عربیہ میں داخل نصاب ہے میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال اور افق المبین پر حواشی لکھے۔ تلخیص الشفاء، بخنۃ الاسر آمدنامہ اور تشحیذ الاذہان شرح میزان المنطق اور خلاصۃ التواریخ فارسی تصنیف کیا [2]

فرائض ملازمت کے ساتھ مشغلۂ تدریس و تصنیف ہمیشہ جاری رکھا۔ مادۂ افہام و تفہیم خدا نے ایسا بخشا تھا کہ ایک بار شریک درس ہونے کے بعد طالب علم دوسری طرف کا رخ بھی نہ کرتا تھا۔ شاہ غوث علی صاحب جو موصوف کے شاگرد اور صوفی منش بزرگ گذرے ہیں جنھوں نے تمام عمر سیاحت میں بسر کی۔ ان کا بیان، تذکرۂ غوثیہ میں نظر سے گذرا۔ فرماتے ہیں۔ شاہ عبد العزیز صاحب، شاہ عبد القادر صاحب اور مولانا فضل امام کی شاگردی کا مجھے فخر حاصل ہے۔ آخر الذکر استاد کی جو شفقت میرے حال پر تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا کے ساتھ دہلی سے پٹیالہ تعلیم کی غرض سے میں بھی چلا گیا۔ میری عمر اٹھارہ سال کی تھی کہ استاد عالم جاودانی کو

(بقیہ ص۱۳۶ کا) علامہ کی اس سوانح حیات میں موصوف سے بڑی مدد ملی ہے۔ مولانا فضل امام کی تیسری زوجہ سے دو صاحبزادے مولوی اعظم حسین اور مولوی مظفر حسین شوخی ہوئے اول الذکر کو بی بی طفیلا دختر مولوی قادر بخش خسو ہوئیں۔ ۱۲ شاہد شروانی۔

[1] سیر العلماء صفحہ ۲۔ حکیم بہاء الدین صدیقی گوپاموی۔

[2] حاشیہ میر زاہد رسالہ امانت علی خورجوی کے ہاتھ کا ۱۲۳۲ھ کا لکھا ہوا بخنۃ الاسر اور تلخیص الشفاء خود مصنف کے دست مبارک کا حبیب گنج لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نوادر قلمی میں محفوظ ہے۔ بخنۃ الاسر کتابخانۂ صاحبزادہ عبید اللہ خاں رئیس ٹونک میں، حاشیہ بھی

رخصت ہو گئے۔ میں نے بھی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا کہ نہ ایسا شفیق و قابل ملے گا نہ پڑھوں گا[1]

ایک بار جب یہی شاہ صاحب علامہ فضل حق کو ملے اور موصوف نے تعلیم کے نامکمل رہ جانے پر اظہار افسوس کیا تو کہنے لگے :۔

"کہ پورے عالم ہو جاتے تو کیا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ جیسے ہوتے۔"

علمی قابلیت کا اندازہ تو اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک جانب شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کا ڈنکا منقولات میں بج رہا تھا! اور دوسری طرف اسی دہلی میں مولانا فضل امام کے معقولات کا سکہ چل رہا تھا طلباء دونوں دریاؤں سے سیراب ہو رہے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ، علامہ فضل حق وغیرہما بھی دوسرے طلباء کی طرح حدیث ایک جگہ پڑھتے تھے اور منطق و فلسفہ دوسری جگہ، خود علامہ کی ذات گرامی مولانا کی مسلم الثبوت قابلیت کی شاہد عادل ہے۔

سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں مولانا کا ذکر جس عقیدتمندی سے کیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ابتدا ان صفات والقاب سے کی ہے :۔

"اکمل افراد نوع انسی، مہبط انوار فیوض قدسی، سراب سرچشمۂ عین الیقین، مؤسس اساس ملت و دین، ماحی آثار جہل، ہادم بنائے اعتساف، محی مراسم علم، بانی مبانی انصاف، قدوۂ علمائے فحول، حاوی معقول و منقول، سند اکابر روزگار، مرجع اعالی و ادانی ہر دیار، مزاجدانِ شخص کمال، جامع صفات جلال و جمال، مورد فیض ازل و ابد، مطرح انظار سعادت سرمد، مصداق مفہوم تمام اجزائی واسطۃ العقد، سلسلۂ حکمت اشراقی و مشائی، زبدۂ کرام، اسوۂ عظام، مقتدائے انام، مولانا مخدومنا مولوی فضل امام، ادخلہ اللہ المقام فی جنۃ النعیم بلطفہ العمیم۔"

مولانا روحانیت میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے آپ کے والد شیخ محمد ارشد فرشتہ سیرت انسان تھے۔

(بقیہ ص۱۳۷ کا) افق المبین کتبخانہ مولوی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی میں اور آمد نامہ کتبخانہ سید ولایت احمد سجادہ نشین آستانہ قلندریہ لاہر پور میں موجود ہیں تشحیذ الاذہان مطبوعہ ہے خلاصۃ التواریخ غیر مطبوعہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ ۱۲۔

[1] تذکرہ غوثیہ ص۱۷۱۔

مولانا احمد اللہ[1] بن حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی سے بیعت تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادے عالم جوانی میں فوت ہو گئے۔ بہ حالت نو عمری احکام شرعیہ کے پابند نہ تھے۔ اس لئے مولوی ارشد صاحب کو تشویش رہتی تھی۔ پیر مرشد کی خدمت میں قلبی بے چینی ظاہر کی۔ پیر نے دعا کی، شب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی کہ سرور رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام پکے باغ میں (جہاں مرحوم کی قبر تھی) تشریف لائے اور بیل کے درخت کے نیچے وضو فرمایا۔ بعد نماز فجر پیر و مرید دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دینے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دونوں ملاقی ہوئے تو ایک دوسرے کو بشارت کا حال بتایا۔ وہیں سے دونوں پکے باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ مقام معہود پر وضو کا اثر یعنی پانی کی تری موجود تھی۔ ایک عرصہ تک لوگ اس جگہ کی زیارت کرتے رہے۔ مولانا عبد القادر بدایونی، اور مولانا احمد رضا خاں سنہ ۱۳۰۹ھ میں اس مقام کی زیارت کے لئے بریلی سے خیرآباد پہنچے۔ اور مولانا حسن بخش کے مہمان ہوئے۔ مفتی فخر الحسن خیرآبادی جو ان معزز مہمانوں کی زیارت میں شریک رہے تھے۔ حظیرہ کے اندر اس بیل کے درخت کی جگہ بتاتے تھے[2]۔ ظاہر ہے کہ ایسے شفیق باپ نے فضل امام کی تربیت میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی۔

مولانا نے دہلی میں خواب دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکان میں فروکش ہوئے ہیں۔ اور فلاں کمرے میں اقامت گزیں ہیں۔ تعبیر دریافت کرنے کے لئے علامہ

---

[1] موصوف علم ظاہری و باطنی دونوں میں باکمال تھے۔ اپنے والد ماجد اور ملا کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے۔ والد سے ہی بیعت تھے۔ صاحب کرامات اور عالم علم کشف قبور تھے۔ ایک بار وبائی بخار پھیلا بہت لوگ ہلاک ہوئے۔ قاضی غلام امام بھی اسی میں مبتلا ہوئے۔ ان کے والد قاضی حفظ الملک اپنے اکلوتے بیٹے کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ کپڑے پھاڑ کر ننگے ہوئے جا رہے تھے کہ فرشتۂ رحمت بن کر مولانا احمد اللہ اچانک عیادت کو پہنچ گئے۔ یہ حال دیکھ کر رقت طاری ہو گئی۔ اس بخار کو اپنی طرف منتقل کر لیا۔ اور قاضی صاحب کو تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں یہ بلا میں نے اپنے سر لے لی۔ مولانا کو گھر پہنچتے پہنچتے بخار نے آدبایا اور شدت بڑھتی گئی۔ تیسرے چوتھے روز شب جمعہ میں رحلت فرمائی۔ والد ماجد کے پاس مدفون ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ (آمد نامہ)

[2] یہ مقام وضو بیل کے درخت کے تھالے میں تھا۔ جب تک یہ درخت قائم رہا لوگ تبرکاً بھی اس کا

کو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جا کر فوراً سامان کمرے سے نکال لو اور اس کو بالکل خالی کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ خالی ہوتے ہی وہ کمرہ فوراً گر گیا۔

یہ چیز سمجھ میں نہ آئی۔ شاہ صاحب سے دریافت کیا گیا کہ یہ تعبیر کیونکر ہوئی۔ فرمایا کہ اس وقت بے اختیار یہ آیت ذہن میں آگئی تھی ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا۔

ہزاروں تلامذہ میں سب سے زیادہ نمایاں علامہ فضل حق اور مفتی صدر الدین خاں[1] آزردہ صدر الصدور دہلی ہوئے۔ ۵ رذی قعدہ ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء کو مولانا نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ مرزا غالب نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی:-

اے دریغا قدوۂ اربابِ فضل کرد سوئے جنت الماویٰ خرام
چوں ارادت از پے کسبِ شرف جُست سالِ فوت آں عالی مقام
چہرہ ہستی خراشیدم نخست تا بنائے تخرجہ گردد تمام
گفتم اندر سایۂ لطفِ نبی باد آرامشگہ فضل امام[2]
۷ ۵ ۲ ۴ ۴ ۱۲ ھ

(بقیہ ۱۳۹ کا) پھل استعمال کرتے تھے۔ جب درخت ختم ہو گیا تو اس جگہ کو چار دیواری سے گھیر دیا گیا جو اب بھی موجود ہے۔ اب اس کی زیارت کی جاتی ہے۔

[1] مفتی صاحب دہلی میں ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت "چراغ" ہے۔ باپ دادا کشمیری تھے۔ شاہ عبد العزیزؒ، شاہ عبد القادر اور مولانا فضل امام خیر آبادی کے شاگرد رشید علامہ فضل حق کے ہم درس، عمر میں علامہ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شاہ نصیر اور میر ممنون دہلوی سے تلمذ تھا۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی اور سر سید احمد خاں مخصوص تلامذہ سے ہیں۔ "منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال"، "در المنضود فی حکم امرأۃ المفقود" اور بوجہ کثیرہ مستفتیاں یادگار ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بغاوت کے الزام میں دھر لئے گئے۔ جائداد ضبط ہوئی۔ بعد میں کچھ جائداد واپس ملی اور گوشہ نشین ہو گئے۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء بروز پنجشنبہ وفات پائی۔ "چراغ دو جہاں بود" مادہ تاریخ ہے۔ مرزا غالب بھی جو مفتی صاحب کے جلیس و ہم نشین تھے۔ اسی سال راہی ملک عدم ہوئے۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔

[2] سبد چین غالب۔

احاطہ درگاہ مخدوم شیخ سعد الدین خیر آبادی میں اپنے استاد ملا عبد الواجد کرمانی سے کچھ فاصلہ پر شمالی حصے کی جانب آخر میں مدفون ہوئے۔ اس حصے کے آغاز میں مولانا عبد الحق کی قبر ہے۔

اب یہ قبریں شکستہ ہیں۔ ممکن ہے کچھ دن بعد آثار بھی باقی نہ رہیں۔ اس وقت بھی ان کے جاننے والے خال خال ہیں۔ کاش کوئی قدر دانِ علم بزرگ ان کے نام کے پتھر لگا کر ان فضلاء کے آثار قبور کو مٹنے سے بچا لیتے۔

تعلیم و تربیت

علامہ نے آنکھ کھولی تو گرد و پیش، علم و فضل اور امارت و ریاست کو جلوہ گر دیکھا۔ خاندانی حالات سے پتہ چل گیا ہو گا کہ نسلاً بعد نسل اَباً عن جدٍ علم و امارت، دونوں ساتھ ساتھ وراثت بنے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ کے اخلاف ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مادّی ریاست سے محروم ہو کر بھی مستغنی اور کوہ وقار رہے خلف الصدق شمس العلماء مولانا محمد عبد الحق خیر آبادی کی نازک مزاجی، سیر چشمی اور اولوالعزمی کے واقعات اب بھی چشم دید بیان کرنے والے ملتے ہیں۔

ہندوستان کے مشہور مردم خیز قصبات میں خیر آباد ضلع سیتاپور (اودھ) کا نام بھی صفِ اول میں صدیوں سے رہا ہے۔ شاہی زمانے میں کشتری کا پایۂ تخت بھی رہ چکا ہے۔ محلہ میاں سرائے میں اب تک گڑھی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ محلہ توپخانہ اور فراشخانہ بھی اب تک موجود ہے۔ اولیاء کرام، علماء عظام، بڑے بڑے نامور گذرے ہیں۔ مخدوم شیخ سعد الدین[1]، مخدوم نظام الدین، اللہ دیہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے مزارات آج

---

[1] شیخ سعد علیہ الرحمہ کے والد ماجد مولوی بڈھن قصبہ اناؤ کے قاضی تھے۔ فرزند کو عالم طفلی میں ہی چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کر گئے۔ مکتب میں پہنچنے کے بعد اپنا سبق روزانہ یاد کرتے اور شب میں ہر سبق ایک ہزار بار دہراتے قرآن پاک بھی اسی طریقہ پر حفظ کیا۔ بچپن ہی سے آثارِ رشد پیشانی سے ہویدا تھے۔ سن تمیز کو پہنچے تو مولانا اعظم لکھنوی سے کسب علوم کر کے سر آمد علماء عصر بنے۔ حضرت شاہ مینا نور اللہ مرقدہٗ کے مرید ہوئے۔ ۲۴ صفر ۸۷۰ھ کو شاہ مینا عالم جاودانی کو روانہ ہوئے۔ بموجب مرید خاص کو کچھ دن اقامتِ لکھنؤ کے بعد خیر آباد جانے کی بشارت ہوئی۔ آپ نے خیر آباد پہنچ کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ایک عالم فیضیاب ہوا۔ اکثر آپ سے خوارق و کرامات کا ظہور ہوتا رہا۔ جسقدر نذرانے آتے مسافرین و وارد و صادر پر صرف فرما دیتے۔ گیہوں کی روٹیاں مستحقین کو تقسیم ہوتیں۔ متعلقین کو اناؤ سے بلا کر یہیں آباد کیا جب

بھی زیارت گاہ خلائق ہیں۔ مولوی شاہ محمد صالح عرف ملا میاں شیخ موسیٰ اور شاہ غلام یحییٰ[۱] گیارھویں اور بارھویں صدی کے باکمال بزرگ اور وحید عالم گذرے ہیں۔ آخری دور میں حضرت معشوق علی شاہ، حافظ محمد علی شاہ[لہ] اور حافظ محمد اسلم رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت کے صاحبِ کشف وکرامات بزرگ ہوئے ہیں۔ یہ بزرگان کرام شاعر بھی تھے تصوف و معرفت میں ان کا ڈوبا ہوا کلام اب بھی اودھ کے قوالوں کو یاد ہے جو عرس کے موقع پر زینت محافل بنتا ہے۔ اس وقت بھی حضرت شاہ مقبول میاں صاحب قلندر کی بدولت خیرآباد مرجع خلق بنا ہوا ہے[عہ]

علما میں پچھلے دور میں سب سے بڑی شخصیت مولانا حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی شاگرد ملا قطب الدین شمس آبادی کی گذری ہے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا احمد اللہ، ان کے شاگرد ملا عبدالواحد کرمانی[۲] خیرآبادی صاحب فضل وکمال اور درد و

(بقیہ) ۱۲۱۱ھ کا وصال ہوا ہے تو جنازہ کفن بھی گھر میں نہ نکل سکا۔ سالہا مسند تدریس اور ارشاد کو رونق بخشی، اور اپنے شیخ طریقت کی طرح آخر تک حصور یعنی غیر شادی شدہ رہے۔ تصانیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شروح بزدوی، حسامی، کافیہ، مصباح وغیرہا لکھیں۔ مجمع السلوک، رسالہ مکیہ کی شرح لکھی اور اس میں ملفوظات وحالات شاہ مینا بھی کافی درج کر دئے ہیں۔ (مآثر الکرام)

[لہ] موصوف ۱۱۹۲ھ میں قصبہ کھیری (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ دہلی اور اجمیر میں ریاضات شاقہ کیں، تونسہ جا کر حضرت شاہ سلیمان صاحب رحمۃ اللہ کے مرید و خلیفہ ہوئے۔ مولانا عبدالوالی عرف پیر بخش، نبیرہ حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ حدیث مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے پڑھی۔ علامہ کے استاد بھائی اور ہم عمر تھے ۴۷، سال کی عمر میں ۱۹ ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۶ھ کو وصال ہوا۔ حافظ محمد اسلم رحمۃ اللہ آپ کے بھتیجے اور شاگرد و مرید تھے۔ اپنے عہد کے باکمال بزرگ تھے۔ ۲۱ ذیقعدہ سنہ ۱۳۲۰ھ کو وصال ہوا۔ پیر و مرشد کے برابر علیحدہ مزار میں مدفون ہیں ۱۲

[۲] موصوف خوش تقریر فاضل تھے۔ آپ کا ہر شاگرد درجۂ کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ تقریر ایسی فرماتے کہ عامی اور بازاری انسان بھی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ مولانا محمد اعلم سندیلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ استاد، شاگرد پر بے انتہا شفقت کرتے تھے۔ بعض کتابیں ملا وہاج الدین مولوی قطب الدین گوپاموی سے پڑھیں۔ صدرا کے کچھ اسباق، مولوی غلام طیب کی معیت میں مولانا احمد اللہ خیرآبادی بن حاجی صفت اللہ محدث سے بھی پڑھے سنہ ۱۲۱۸ھ میں رحلت ہوئی۔ ایک عزیز نے تاریخ وفات لکھی:۔

روز جمعہ کو بود چارم عید ازجہاں سوئے جنت الماوی
رفت آمد نوید از رضواں رضی اللہ عنک، از دبیا (آمدنام)

۱۸ ۱۲ ھ

[عہ] سنہ ۱۳۷۹ھ کو وصال ہو گیا۔
۱۹۶۰ء

نزدیک مشہور تھے۔

علامہ خیرآباد سے دہلی پہنچے تو ایک سے بڑھ کر ایک باکمال نظر آیا۔ مفسرین، محدثین فقہاؑ، فلاسفہ، اولیاء، شعراء جس طبقہ پر نگاہ ڈالئے

ز کدام باغے اے گل کہ چنیں خوش است بویت

زبان پر بے ساختہ آجاتا تھا۔

والد ماجد مولانا فضل امام صدر الصدور نے مکان کے علاوہ ہاتھی اور پالکی پر بھی دربار آتے جاتے وقت ساتھ بٹھا کر درس دینا شروع کیا۔ علوم آلیہ میں صغر سنی ہی میں اپنا جیسا یگانۂ روزگار بنا دیا۔ منقولات کی تحصیل کے لئے دربارِ حضرت شاہ عبد القادر محدث اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی میں پہنچایا۔

علامہ فضل حق وہاں بھی ہاتھی ہی پر جاتے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ بھی ساتھ ہوتے تھے۔ رئیس زادہ ہونے کی وجہ سے کبھی خدمتگار کتاب ساتھ لے کر پہنچتا تو شاہ صاحب کشف سے مطلع ہو کر روز سبق نہ پڑھاتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ اس دربار میں تربیت کا بھی پورا لحاظ رہتا تھا۔ علم کی عظمت سکھائی جاتی تھی۔ استاد کی وقعت کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ مولوی اکرام اللہ بہ روایت مفتی انعام اللہ گوپاموی پدر بزرگوار خود، مولانا احمد علی خیرآبادی[1] بہ روایت مولانا ماجد علی شاگرد مولانا عبد الحق خیرآبادی اور مولانا بدر الدین علوی بہ روایت استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھی[2] اس کے راوی ہیں کہ ایک روز علامہ اور مفتی صدر الدین

---

[1] ابن مولوی حکیم عابد علی کوثر (از نسل حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی) جید حافظ و عالم تھے۔ معقولات، مشہور اساتذۂ وقت سے، حدیث مولانا ماجد علی محدث سے، اور طب حکیم کمال الدین لکھنوی سے پڑھی۔ مولانا عبد الحق خیرآبادی سے مرقات پڑھنے کا فخر بھی حاصل تھا۔ عرصے تک درس بھی دیتے رہے۔ آخر میں طبابت ذریعۂ معاش رہی۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء کو انتقال ہوا۔ [2] ضلع علی گڑھ کے قصبہ بلکھنہ میں ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے "چراغ غم" مادۂ تاریخ پیدائش ہے۔ علیگڑھ کے مشہور ولی باخدا حضرت شمس العارفین شاہ جمال کی اولاد سے ہیں۔ ممدوح کا نسب حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں حضرت شمس العارفین کا ذکر کیا ہے۔ ابتدائی استاد سید ولی علی میاں جی، موہن لال، مولوی محمد عظیم اللہ اور مولوی حفیظ اللہ تھے۔ درسیات مولانا عنایت احمد کاکوروی مفتی و منصف

خاں یہ باتیں کرتے آرہے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علوم دینیہ حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہا خوب جانتے ہیں مگر معقولات نہیں جانتے۔ یہ دونوں ابھی شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہ تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ ایک بوریا مسجد سے باہر صحن میں ڈال دو اور ایک مسجد کے اندر بچھا دو۔ اور جب فضل حق اور صدر الدین آئیں تو ان کو وہیں صحن میں بٹھا دینا۔ ان کے آنے پر تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ میاں آج سبق پڑھانے کو جی نہیں چاہتا۔ البتہ یہ جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کی خرافات میں گفتگو ہو۔

یہ دونوں اس میدان کے مرد تھے ہی فوراً بولے جیسی حضرت کی خوشی۔ شاہ صاحب نے کہا کہ کوئی مسئلہ لو۔ قوی پہلو تم اختیار کرو۔ اور کمزور مجھے دو چنانچہ حصول الاشیاء بانفسہا و باشباحہا پر گفتگو شروع ہوئی۔

شاہ صاحب نے دلائل سے "بانفسہا" کے قول کو ثابت کر دکھایا۔ بالآخر دونوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ شکست تو کھا گئے لیکن یہ شکست روحانیت سے کھائی ہے علمیت سے نہیں۔ لاجواب تو ہو گئے لیکن بات وہی ٹھیک ہے جو ہم کہتے ہیں (یہ بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ علامہ نے حاشیہ قاضی مبارک میں اس پر مفصل و مدلل خامہ فرسائی فرمائی ہے)

شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی، ہم نے اس کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس نے ہمیں اب تک نہ چھوڑا۔ وہ اب تک

(بقیہ صفحہ ۱۴۳ کا) کورس سے پڑھے ۵۷ء کے قبل استاد کے محکمہ بریلی کے سررشتہ دار ہوئے۔" غدر" کے بعد مفتی عنایت احمد انڈمان بھیج دیئے گئے۔ یہ علیگڈھ آ گئے ابتدا میں کایستوں کے قائم کردہ مکتب میں دس روپیہ ماہانہ پر زندگی بسر کی۔ اس کے بعد استاد نے انڈمان سے واپسی پر مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس دوم کر دیا۔ کچھ دن بعد مدرس اول ہو گئے۔ ستائیس برس کانپور رہنے کے بعد مدرسہ جامع مسجد علی گڈھ میں مدرس اول ہوئے۔ پچاس روپیہ مشاہرہ ہوا۔ ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ تک مسلسل درس دیا۔ ۱۳۱۲ھ میں تقلید و عدم تقلید کے قصے میں بہر دیا گیا! اس سے اللہ نے نجات دی۔ ۱۸۹۵ء میں سات سو روپیہ ماہانہ پر صدارت المدرسین پر حیدرآباد میں تقرر ہوا۔ بعد میں ایک ہزار تنخواہ پر مفتی عدالت ہو گئے۔ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء عرفہ کے دن نوے برس کی عمر میں علی گڈھ میں وفات پائی۔ شاہ جمال میں مدفون ہوئے۔ "استاذ العلماء" مادہ تاریخ ہے
۱۳۳۴ھ
(استاذ العلماء مصنفہ نواب صدر یار جنگ بہادر)

ہماری قدم بوسی کیے جاتی ہے۔

اس مباحثہ سے شاہ صاحب کا مقصد صرف تنبیہ تھا کہ اساتذہ کی جانب سوءظن حصول علم سے مانع ہوتا ہے۔ استاد اور شاگرد درمیان عقیدت ہی کا رابطہ ہوتا ہے جو افہام و استفہام میں معین و مددگار رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں کامل کے بجائے ناقص اور لائق کے بدلے نالائق افراد کی بہتات ہے۔

فطانت و ذہانت:- ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں تیرہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ ونقلیہ و آلیہ کی تکمیل کی۔ چار ماہ اور کچھ روز میں قرآن مجید حفظ کیا[1] تواتر سے یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جب ردّ شیعہ میں تحفۂ اثنا عشری محققانہ انداز میں تحریر فرمائی تو شیعانِ ہند کی طرح اہل تشیع ایران میں بھی ہیجان پیدا ہوا۔ ایران سے میر باقر داماد صاحب افق مبین کے خاندان کا متبحر عالم و مجتہد اونٹوں پر کتب فریقین بار کر کے شاہ صاحب سے مناظرہ کیلئے دہلی پہنچا۔ خانقاہ میں داخل، ہونے پر شاہ صاحب نے فرائض میزبانی ادا فرماتے ہوئے مناسب جگہ قیام کے لئے تجویز فرما کر رختِ سفر کھلوایا۔

شام کو فضل حق حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کو مصروف مہمان نوازی دیکھ کر کیفیت معلوم کی۔ تھوڑی دیر حاضر خدمت رہ کر بعدِ مغرب مجتہد صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ علمی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مجتہد صاحب نے پوچھا:-

"میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو۔"

عرض کیا شرح اشارات، شفا اور افق مبین وغیرہ دیکھتا ہوں۔

مجتہد صاحب کو بڑی حیرت ہوئی، افق المبین کی کسی عبارت کا مطلب پوچھ لیا۔ علامہ نے ایسی مدلل تقریر کی کہ متعدد اعتراضات صاحب افق المبین پر کر گئے۔ معزز مہمان نے اعتراضات کی جوابدہی کی کوشش کی تو ان کو جان چھڑانا اور بھی دوبھر ہوگئی۔ جب خوب عاجز کر لیا تو آپ نے شبہات کے ایسے انداز میں جوابات دیئے کہ تمام ہمراہی علماء بھی انگشت بدنداں ہوگئے۔

---

[1] سیر العلماء۔

آخر میں آپ نے یہ بھی اظہار کر دیا کہ حضرت شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد اور کفش بردار ہوں۔ اور اظہار معذرت کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔

علماءِ ایران نے اندازہ کر لیا کہ اس خانقاہ کے بچوں کے علم وفضل کا جب یہ عالم ہے تو خود شیخ خانقاہ کا کیا حال ہوگا۔

صبح کو جب خیریت طلبیٔ مہمان کے لئے شاہ صاحب نے آدمی بھیجا تو پتہ چلا کہ آخر شب میں دہلی ہی سے روانہ ہو چکے ہیں۔

شاہ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی۔ سبب ناخوشیٔ مہمان معلوم کرنے کی کوشش فرمائی تو فضل حق کی کرشمہ سازیوں کا راز کھلا۔ بلا کر بہت ڈانٹا کہ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ وہ ہم سے گفتگو کرنے آئے تھے ہم خود ان سے نبٹ لیتے۔

علامۃ الہند مولانا معین الدین الاجمیری رامپور کے ایک اعلیٰ عہدیدار (جن کا نام حافظ میں نہیں رہا) کے متعلق یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ ان کا قول تھا کہ:-

"میں اس وجہ سے مسلمان ہوں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور علامہ فضل حق خیرآبادی مسلمان ہیں۔"

غور کیجئے کہ اول الذکر کے کمالات روحانیت اور ثانی الذکر کی ذہانت و فطانت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر کیسا جما ہوا تھا۔ ان عہدیدار کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ فضل حق جیسا ذہین وفطین انسان جس مذہب کو حق سمجھے وہ یقیناً حق ہوگا۔

درس و تدریس:- ہند و بیرونِ ہند سے جو طلبہ مولانا فضل امام سے پڑھنے آتے مولانا کے ارشاد کے مطابق علامہ بھی انھیں پڑھاتے۔

تیرہ برس کی عمر اور مسندِ تدریس پر رونق افروزی، عجیب سا واقعہ معلوم ہوتا ہے حلقۂ درس میں معمر وصاحبِ ریش وبروت تلامذہ اور قدما کی کتابیں زیرِ درس،

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد، خدائے بخشندہ!!

ابتدا تدریس کا زمانہ تھا کہ ایک طالب علم سے جو مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا تھا۔ موصوف نے فرمایا کہ میاں تم بھی فضل حق ہی سے سبق پڑھ لیا کرو۔ وہ آیا۔

غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ، علم کم، ذہن کند یہ نازک طبع ناز پروردہ، جمال صورت و معنی سے آراستہ، چودہ برس کا سن، نئی فضیلت، ذہن میں جودت بھلا میل ملے تو کیسے ملے۔ صحبت راس آئے تو کیونکر آئے۔ تھوڑا سبق پڑھایا تھا کر بگڑ گئے۔ اس کی کتاب پھینک دی، برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا کے پاس پہونچا اور سارا حال بیان کیا۔ فرمایا کہ بلاؤ اس خبیث کو۔ آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے ایک تھپڑ ایسے زور سے دیا کہ ان کی دستارِ فضیلت دور جا پڑی۔ پھر فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا۔ ناز و نعم میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب رکھی۔ اس نے خاطر داری سے پڑھایا۔ طلبہ کی قدر و منزلت تو کیا جانے۔ اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ۔ خبردار تم جانو گے اگر آئندہ ہمارے طالب علموں سے کچھ کہا۔

درازیٔ شب از مژگانِ من پرس
کہ یکدم خواب در چشمم نگشت است

یہ چپ کھڑے روتے رہے کچھ دم نہ مارا، خیر قصہ رفع دفع ہوا لیکن پھر کسی طالب علم سے کچھ نہ کہا۔[1]

شاہ غوث علی صاحب جب ایک بار رامپور میں علامہ سے ملے اور یہ واقعہ یاد دلایا تو علامہ نے اس سب و شتم اور ضرب مولم کی تائید کی۔[2]

مولانا کے اس واقعہ سے طلبہ پر شفقت اور اولاد کی ہدایت و تربیت کا جذبہ معلوم ہوتا ہے۔ جن طلبہ کے متعلق حدیث میں آتا ہو کہ فرشتے ان کے قدموں کے نیچے پر بچھاتے ہیں اس دور کا سرمایہ دار انھیں کیسی نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے یہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ کاش وہ سمجھے کہ علوم دینیہ کی بقا اور قال اللہ، قال الرسول کا غلغلہ انھیں کے دم سے بلند ہے۔ اگر یہ بوریہ نشین اور غربا و مساکین کی جماعت نہ ہوتی تو ہندوستان سے مذہبی علوم کا جنازہ ہی نکل چکا ہوتا۔

---

[1] تذکرہ غوثیہ ص ۱۲۳ گل حسن شاہ پانی پتی
[2] تذکرہ غوثیہ۔

مولوی رحمٰن علی خاں اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۲۶۴ھ میں (پوری ایک صدی پہلے کی بات ہے اس وقت علامہ کی عمر باون ۵۲ سال کی تھی) بمقام لکھنؤ مولانا کو دیکھا کہ حقہ نوشی کی حالت میں شطرنج بھی کھیلتے جاتے تھے۔ اور ایک طالب علم کو اُفق المبین کا درس اس خوبی سے دیتے تھے کہ مضامین کتاب طالب علم کے ذہن نشین ہوتے جاتے تھے۔ [لہ]

۱۸۰۹ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک مسلسل پچاس برس تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ فرائضِ ملازمت، امورِ سلطنت اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی اسمیں کبھی حارج نہ ہوا۔

ملازمت

والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر بتیس ۳۲ سال تھی۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمہ کے سررشتہ دار ہو گئے۔

دہلی میں جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو علماء و ثقات کا عام مسلک یہ رہا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ نرم پڑتے گئے چنانچہ دہلی کے کئی خاندانی آدمیوں نے ملازمت اختیار کر لی تھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کا مولوی عبدالحیٔ اپنے خویش کو ملازمت میرٹھ کی اجازت دیدینا اس دروازے کی آخری بندش کا ٹوٹنا تھا۔ البتہ خانقاہ والوں کا مسلک غدر (انقلاب ۱۸۵۷ء) تک یہی رہا کہ وہ انگریزی حکومت کے نوکروں سے کسی طرح کا نذرانہ یا تحفہ بھی قبول نہ کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ان کا وسیلۂ معیشت مشتبہ ہے سرسید احمد خاں بھی خانقاہ کے مریدوں میں سے تھے۔ اور شاہ غلام علی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اور انھوں نے جب انگریزی نوکری کر لی۔ اور اس کے بعد ملنے گئے۔ نیز حسب معمول نذر لے گئے تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

انگریزوں کو اس بات کی بڑی خواہش و جستجو رہتی تھی کہ مسلمانوں کے خاندانی اور ذی وجاہت اشخاص افتاء، و صدارت کے مناصب قبول کر لیں تاکہ شمالی ہند

[لہ] تذکرہ علمائے ہند۔

میں انگریزی حکومت عوام میں مقبول ہو سکے۔

ہندوستانیوں کے لئے بڑا عہدہ صدر الصدور عدالت کا تھا۔ اس لئے اکابر و افاضل کو ہی پیش کیا جا سکتا تھا۔ دہلی چونکہ قدیم دار السلطنت اور اسلامی تہذیب کا مرکز تھی اس لئے یہاں کی صدارت کے لئے خصوصیت سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام صدر الصدور کئے گئے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مفتی صدر الدین خاں آزردہ اس عہدے پر فائز کئے گئے ان کے متعلق ریزیڈنٹ نے اکبر شاہ ثانی بادشاہ سے بھی مشورہ کر لیا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد ریزیڈنسی کمشنری میں اپنے آپ کو تبدیل کرالیا۔ یہاں بھی رنگ بے رنگ تھا۔ یہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ حکام تھے تنگ مزاج حفظ مراتب کہاں۔ ارباب علم اور بے علم سب ایک آنکھ سے دیکھے جاتے تھے علامہ نے استعفیٰ دیدیا۔ نواب فیض محمد خاں والی جھجر نے پانصد روپیہ ماہوار مصارف پیش کئے۔ اور قدر دانی کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔ دہلی سے روانگی کے ولیعہد سلطنت صاحب عالم مرزا، ابو ظفر بہادر نے اپنے ملبوس دوشالہ علامہ کو اوڑھا دیا۔ اور بوقت رخصت آبدیدہ ہو کر کہا:۔

“چونکہ آپ جانے کو تیار ہیں۔ میرے لئے بجز۔ اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔”

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اس المناک درد فراق کا حال لکھا ہے مولوی سراج الدین کو مرزا نے کسی واقعہ کا قطعۂ تاریخ لکھ کر بھیجا۔ انھوں نے مرزا کی خواہش کے بغیر وہ قطعہ بہت سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوا دیا۔ جب وہ پرچہ نظر سے گذرا تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک خبر کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

“گمنامے را نامور ساختن و ہیچے را بہ پنداشتن عنایتے ست بزرگ، و مرحمتے ست بزرگ خاصہ کہ آں بزرگ عنایت بے ابرام داعی روئے نماید و آں بزرگ مرحمت بے استدعائے سائل بظہور آید۔ نگرندہ اگر دیدۂ حق بیں دارد بنگرد کہ واجب تعالیٰ شانہ اجزائے ممکنہ

را درکتم عدم متواری بودہ اند بمحض عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ، وبراں معدومات منتے نہادہ حقا کہ اگر تلطے بسزا کردہ شود درقم گشتن قطعۂ تاریخ درآئینہ سکندر ازیں عالم خبر میدہد۔ وچوں ناخواستہ ایں چنیں نوازش بمیاں آمد، ہرآئینہ روائی خواہش را چگونہ چشم تواں داشت۔ لاجرم درگذارش مدعا فصلے بمیاں نہادہ آرزو در انجام گفتگو دادہ می شود"۔

نہفتہ مباد کہ قدر شناسی حکام رنگِ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر والمعیٔ یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را ننگ و عار دار ہاند۔ حقا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک واماند و باز آں پایہ را بسر رشتہ داری عدالت دیوانی بخشند، ہنوز ایں عہدہ دون مرتبہ وے خواہد بود۔ بالجملہ بعد ازیں استعفا، نواب فیض محمد خاں (رئیس جھجر) پانصد روپیہ ماہانہ برائے مصارف خدام مخدومی معین کردہ نزد خود خواند، روز یکہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت۔ ولیعہد خسروِ دہلی صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر، مولانا را تا پدرود کند سوئے طلبید و دو شالۂ ملبوس خاص بدوش وے نہاد۔ و آب در دیدہ گردانده فرمود"

کہ ہرگاہ شما می گوئید کہ من رخصت می شوم مراجز ایں کہ بپذیرم گریز نیست
اما ایزد دانا داند کہ لفظ وداع از دل بزبان نمی رسد الا بصد جرِ ثقیل۔

تا اینجا سخن ولیعہد بہادر است۔ غالب تمام از شما می خواہد کہ واقعہ تودیع مولوی فضل حق، و اندوہ ناکی ولیعہد بہادر، و بدرد آمدن دلہائے اہل شہر، بعبارتے روشن و بیان دلآویز در آئینہ سکندر بنقاب طبع در آرید، مرادریں تفقد منت پذیر انگارید۔

والسلام[1]

اس خط سے مرزا غالب کا علامہ سے بے پایاں خلوص اور غمِ ہجر ظاہر ہوتا ہے۔ اخلاص ومحبت کا پتہ ایک طویل خط کے ابتدائی جملوں سے بھی چلتا ہے۔ علامہ کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعہ لالہ ہیرالال معلوم ہوئی اس پر اس طرح لکھتے ہیں:۔

"قبلہ و کعبہ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرالال راہوائے دیدن عنقا در سر، و ناگاہ

---

[1] یادگار غالب ص ۳۵۵

شامگاہے کہ پنجشنبہ بست و پنجم ربیع الاول بود بہ نشیمن تنہائی من گذر افتادے۔ آں در گرفتنِ آتش گرداگرد والا کاشانہ و سوختنِ خانہ و رخت ہمسائگاں از ہر کرانہ، و نرسیدن آسیبے بلازمان دراں میانہ از کجا شنودے و اگر نہ شنودے ہر آئینہ حق دوستانہ، پرسش کہ شیوۂ غم خواری و اندوہ ربائی است ناگزاردہ ماندے، و ہم ایزدی نیائش کہ لازمۂ حق شناسی و سپاس گذاری است بتقدیم نرسیدے۔ ہاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں ہیرالال) کامیاب پیام و نامہ و آشنایان جگر تشنۂ رشحۂ خامہ!

وائے بر من کہ رقیب از تو بہ من بنماید
نامۂ وا شدہ مہر بہ عنوان زدہ [1]

علامہ اواخر ۱۸۱۵ء سے والد ماجد کے حکم کی تعمیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہو گئے تھے۔ مگر طبعاً یہ ملازمت ناپسند تھی۔ اسی لئے ۱۸۱۸ء میں ایک خط والد ماجد کو لکھ کر اظہارِ بیزاری کیا [2] منشأ پدری نہ پاکر سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ملازمت کا تلخ گھونٹ پیتے رہے۔ اور والد ماجد کے انتقال کے دوسرے ہی سال ۱۸۳۱ء میں اس غیر مطبوع ملازمت سے مستعفی ہو کر کچھ دن بعد ریاست جھجر سے تعلق قائم کر لیا۔

۱۶ سالہ دورِ ملازمت میں علامہ انگریزی راج کے عزائم کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے رہے جس کا اظہار "الثورۃ الہندیہ" میں تفصیلی طور پر کیا ہے۔

مندرجہ ذیل عرضی بھی اسی کی غمازی کر رہی ہے۔ یہ عرضی باشندگانِ دہلی کی طرف سے مرتب کر کے بادشاہ دہلی اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ یہ ناقص الآخر ہے۔ اس لئے تاریخ نگارش معلوم نہ ہو سکی مگر تاریخی قرائن بتا رہے ہیں کہ دورانِ ملازمت ۱۸۲۷ء سے قبل ہی کی تحریر کردہ ہے کیونکہ اس میں سر چارلس مٹکاف کے ٹیکس لگانے کا ذکر ہے جو ۱۸۲۷ء تک دہلی کا ریزیڈنٹ رہا تھا۔

عرضی رقم زدہ مولوی فضل حق صاحب۔ از طرف رعایائے شہر در باب امتناع ٹیکس وغیرہ۔

حضرت جہاں پناہ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ۔ بعرض اقدس و اعلیٰ (میرساند) برائے جہاں آرائے اقدس روشن و مبرہن است۔ کہ رعایائے ایں ملک چہ ہنود و چہ مسلمان برستہ ازاں

---

[1] یادگار غالب ص ۳۴۳ و کلیات نثر غالب ص ۱۱۱۔ [2] بیاض مملوکہ حکیم نصیر الدین اجمیری ثم کراچوی۔

مزارعان و کشاورزان و اکثر روزگار پیشہ و بعض ازاں ہا تجار و اکثرے اہل حرفہ و بعض لاخراج دار و روزینہ دار و بعض دریوزہ گر بودہ اند۔ و اکثر از اہل اسلام و بعض ہنود اصل متوطن اینجا نیستند بلکہ بہمراہی حکام و سلاطین ترک اوطان خود ہا (کردہ) دریں جا توطن گزیدہ اند تا وقتے کہ مملکت ہندوستان بقبضہ و تصرف سلاطین و راجگان بود وجہ معیشت سکان ایں دیار ہیچ گونہ تنگی نکردہ بود۔ کہ ہمگی وجوہ معاش کہ خدمات عمدہ وجہ روزگار سپاہ، و حرفہ لبسکنۂ ایں دیار اختصاص داشت ہر کس از سکنۂ ہمیں ملک بقدر حوصلۂ و فراخور لیاقت خود روزگارے در اہل مناصب یا در زمرۂ سپاہ یا در پیشۂ تجارت یا در حرفہ میداشت از زمانے کہ عملداری سرکار انگریزی در مملکت ہندوستان رسیدہ است۔ بتدریج تنگیٔ روزی و ضیق معاش رفتہ رفتہ الحال بحدے رسیدہ است کہ نوبت بجان و کار دبا تخوان رسیدہ۔ زیرا در سرکار انگریزی ہمگی وجوہ معاش مفقود۔ و ابواب روزی مسدود شدہ اید۔ بجز معدودے چند یعنی چند کس در عملۂ عدالت دیوانی و کلکٹری و فوجداری و پرمٹ و تھانہ و تحصیل بمشاہرۂ قلیل ملازم اند و پس از تبدیل دفاتر و تغیر طرز نوشت و خواند کچہری ہا چناں تخیل می گردد کہ در چندے ایں روزگار ہم نصیب ایں بے چارگاں نہ خواہد ماند۔ این است حال تنگی معاش روزگار سکان این دیار و حال تجار این است کہ سرکار انگریزی ہمہ وجوہ تجارت خود اختیار نمودہ۔ و ہمگی اجناس از قسم پارچہ و ریسمان و ظروف و اسپاں وغیرہ دواب خود از ملک انگلستان وغیرہ بہم رسانیدہ دریں ملک برائے فروش علی التواتر در ہر قریہ و بلدہ از بلاد ایں ملک می آرد و منفعتے برائے کسے از سکنۂ ایں دیار نمی گزارد۔ درین جہت ہمہ تجار این دیار از پیشۂ خود دست بردار شدند و حال لاخراجیداراں این است کہ ہمہ لاخراجی با وجود ایں کہ در قوانین سنہ ۱۸۰۳ء و سنہ ۱۸۰۵ء سرکار انگریزی عہد و میثاق نوشتہ اند کہ ہر اراضی لاخراجی کہ پیش از غرۂ جنوری سنہ ۱۸۱۰ء و غرۂ جنوری سنہ ۱۸۰۳ء بقبض و تصرف لاخراجید خواہد بود گرسنہ باشد یا نہ یا واہب آن اختیار عطا داشتہ باشد یا نہ گاہے بضبطی نہ خواہد آمد۔ الحال ہلا ہیچک تحقیقات و بلا تامل در ہر یک ضلع ضبط شدہ می شود۔ حالا از وجہ معیشت لاخراجیداران بالمرہ مسدود شدہ است در روزیکہ یک قلم در ہمہ اضلاع

وقوف شدہ است۔ این وجہ معیشت ہم باقی نماندہ وحال مزارعان وکشاورزان این است کہ براہاں آن چناں جمع خراج مقرر شدہ است کہ دراں حالتے واستطاعتے باقی نماندہ است۔ وحال بے استطاعتی وبے مقدوری آنہا خود از دفاتر کلکٹری ظاہر وہرگاہے کہ برائے ایں سکان ایں دیار وجہ معیشت باقی نماند۔ اہل حرفہ چہ کار برائے کدام کس توانند کہ بذریعۂ آن برائے خود کسب معیشت توانند نمود۔ ہرگاہیکہ ہمگی خلائق از معیشت خود تنگ باشد بدریوزہ گر کدام کس تواند داد؟ این ہمہ حالات اجمالی، تنگی معاش جملہ رعایائے ہندوستان است۔

وحال تنگی معاش رعایائے علاقۂ شاہجہان آباد مجملاً ایں است کہ در ابتدائے عمل سرکار انگریزی پرگنہ ہوڈل وپلول وہتین ونہف گڈھ وسالمہ وفیروز آباد وڈیگ وپوناہانہ وسانگرس وبجنور وسونی پت وگوہانہ وجرسٹھ وکھرکھودہ ورہتک وہم وہانسی وحصار وغیرہ پرگنات درجاگیر بودند ودرسرکارات جاگیرداران این ہمہ پرگنات ہزارہا کسان در ہرکارہ ودر فوج وشاگرد پیشہ ملازم بودند واکثر دیہات دربست واراضیات بحیطۂ ضبطی درآمدند۔ ومعیشت لکوک کسان بالمرہ موقوف شدہ حالا درتمام عالم روزگار ہمچو عنقا ناپدید است۔ وبیوہا وبیچارگان از مسدودی روزینہ وضبطی املاک مدار بر سر برداوقات خود ہا برچرخہ زنی وریسمان فروشی وآسیا سائی می داشتند بسبب ایں کہ سرکار تجارت ریسمان اختیار کردہ وآسیاہائے آبی نصب نمودہ است۔ ایں وجہ معیشت آنہا بالمرہ مسدود گردید، وہم چنیں اہل حرفہ ودوکانداراں وساہوکاراں (بہ) بے بضاعتی خلائق از انتفاع مایوس گشتہ۔ سرمایہ کہ داشتند بصرف خورد ونوش درآوردہ اند۔ باایں ہمہ تنگی ہا ازندش سرچارلس مٹکاف صاحب بہادر مصادرۂ ادلئے زر چوکیداری بربے چارگان چاروناچار کہ حکم حاکم مرگ مفاجات است دادن مصادرہ باوصف آنکہ گاہے از سلاطین وحکام سلف علت آن نداشتیم بذمۂ خود نہادہ تاحال کردہ ماندہ ایم حالا چند روز ست کہ صاحب مجسٹریٹ حال در کوچہ وبرزن وبازار بہ تعمیر پھاٹک ہائے قدیم وجدید کہ ہیچ یک فائدہ براں مترتب نیست وگاہے مترتب نخواہد شد حکم دادند۔ لہذا باجبر او کر باآنکہ تکالیف فاقہ کشی وبیع ورہن اسباب خورد ونوش برداشتہ بصرف

ہزار روپیہ تعمیل حکم نمودیم و تکالیف ہر روزہ از مسدود ماندن دروازہائے نو تعمیر و اغماض چوکیداران بریک محلہ، در بست و کشاد آں عائد حال مایان می شود۔ بر خود گوارا می نمائیم۔ الحال علاوہ ازیں خیر صاحب مجسٹریٹ حکم تقرر پنچ پنچ کس پنچان در کوچہ و محلہ ۱؎

(ناقص الآخر)

ایک عرصہ تک جھجر رہے۔ پھر مہاراجہ الور نے بلالیا۔ کچھ دن بعد سہارنپور قیام رہا۔ دو سال تک کسی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ نواب ٹونک کے پاس بھی رہے۔ نواب یوسف علی خاں نے رامپور بلالیا۔ خود تلمذ اختیار کیا۔ اور محکمۂ نظامت اور مرافعۂ عدالتین میں منسلک کر دیئے گئے۔ نواب کلب علی خاں نے بھی آپ سے پڑھا۔

دورانِ قیام رامپور اپنے مخلص دوست مرزا اسداللہ خاں غالب کی تعریف و توصیف اکثر نواب سے فرماتے رہے۔ تاآنکہ نواب مرزا کے کلام کے مشتاق ہو گئے۔ اور کچھ دن بعد تعلقات نے استواری اختیار کر لی۔ اس طرح مرزا کی قدیم دوستی کا حق بھی ادا کر دیا گیا۔

آٹھ برس رامپور رہنے کے بعد لکھنؤ ۲؎ چلے گئے۔ وہاں صدر الصدور بنائے گئے۔ ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ اختر اپنے والد امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد سریر آرائے سلطنت اودھ ہوئے۔ ابتدا ہی سے عیش و عشرت کے خوگر تھے۔ حکمراں ہونے پر بھی عادت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ نظام سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے دوسرے ہی سال ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ پہنچ کر فہمائش کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے مقرر ہوئی اس کے مہتمم علامہ فضل حق خیر آبادی ہی قرار پائے۔ مستغیثان سپاہ فوج سرکار کمپنی ملک اودھ کی زمین داری کا مقدمہ محکہ جات شاہی میں فیصل ہوا کرتا تھا۔ مگر غفلت یا طمع عمال سے یا سرکشی تعلقہ دار سے وہ لوگ اپنے حق کو نہ پہنچ کر ہمیشہ داد بیداد کرتے رہتے تھے۔ ان کی دادرسی کے لئے "حضور تحصیل" مقرر ہوئی تھی۔ ۳؎

۱؎ نوائے ادب بمبئی، جولائی ۱۹۶۲ء بر مقالہ شاہ احمد فاروقی۔ ۲؎ انتخاب یادگار منشی امیر احمد مینائی۔

۳؎ تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۱۵۲ نجم الغنی خاں رامپوری

زمانۂ ملازمت میں تمام امور دیانتداری اور زیرکی سے انجام دیئے حکام و رعایا دونوں خوش رہے۔ قاضی الیاس حسین سیتاپوری راوی ہیں۔ زمانۂ سررشتہ داری دہلی میں ایک قطعۂ زمین کیلئے ہندو اور مسلمان دونوں خواہشمند تھے۔ برادران وطن نے ایک لاکھ روپیہ کی پیش کش بھی کی۔ چونکہ استحقاق مسلمانوں کا ثابت ہوا۔ اس لئے علامہ نے وہ قطعۂ زمین مسلمانوں ہی کے حوالے کر دی۔

یہی انصاف پروری و ہردلعزیزی تھی۔ جسکی وجہ سے بلند اقبال عبدالحق کی پیدائش پر رعایا نے اور بالخصوص برادران وطن نے تحفے تحائف کے علاوہ لاکھوں روپئے نذر کئے۔

یہی قاضی صاحب راوی ہیں کہ دہلی کے کسی پل پر کسی وجہ سے آمد و رفت ممنوع قرار دیدی گئی تھی۔ علامہ کے پاس کچھ لوگ آئے اور برات نکال لے جانے کی بصد منت و الحاح اجازت چاہی۔ علامہ نے ایک دستخطی پرچہ لکھ دیا کہ:۔

”روکو مت جانے دو“

محافظین نے پرچہ دیکھ کر نکل جانے دیا۔ حکومت کی طرف سے جواب طلب ہوا۔ محافظین نے اجازت نامہ پیش کر دیا۔ علامہ نے جواب دہی کرتے ہوئے فرمایا میں نے تو لکھا تھا ”روکو۔ مت جانے دو۔“

علامہ نے اپنی زیرکی و دانائی سے غریبوں کا کام بھی نکال دیا اور الزام بھی اپنے اوپر آنے نہ دیا۔

اس جملہ میں لطیفہ یہ ہے کہ ”روکو“ کو مابعد سے علیحدہ کر کے پڑھا جائے تو ممانعت کا پہلو نکلتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ”مت“ ملا کر پڑھا جائے تو اجازت ہو جاتی ہے۔

روکو، مت جانے دو ـــــــــــ روکو مت، جانے دو۔

سخن فہمی

عام علماء کی طرح علامہ شعر و سخن کے فن سے بے خبر نہ تھے۔ شعر گوئی کے مانند سخن فہمی میں بھی کمال حاصل تھا۔

وطن مالوف خیرآباد جہاں علماء صلحاء کا منبع و مسکن چلا آرہا تھا۔ وہیں لکھنؤ کے قرب اور اپنی زمین مردم خیز کی وجہ سے معدن شعراء بھی بنا ہوا تھا۔ علامہ کے دور میں حاجی مولوی

لہ حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء از مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی۔

تراب علی ناجی۔ منشی قدرت حسین قدرت، مولوی مظفر حسین شوخی، متولی منشی محمد جعفر زہری۔ منشی بہاری لال خاوری، منشی موہن لال گرامی، مولوی الٰہی بخش نازش، مولوی فضلِ عظیم عظیم وغیرہم گلستانِ شاعری کے مختلف رنگ و بو رکھنے والے شگفتہ پھول تھے۔ نمونے کے طور پر ایک ایک دو دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ قدرتِ بیان اور سلاستِ زبان کا اندازہ خود ہو جائے گا۔

ناجی سحر از جنبشِ شمشاد، بگلگشتِ چمن ؛ یادم آمد روشِ قامتِ دلجوئی کسے
قدرت بیاضِ صبحِ نورانی، ز نورِ عارضش روشن ؛ سوادِ شامِ ظلمانی ظہورِ موئے پیچانش
شوخی دی نالہ ام کہ دم کشِ آہنگِ صور بود ؛ شامِ فراق خندۂ صبحِ نشور بود
زہری اے بنامِ تو سخن تازہ چو گل ؛ دے بحمدِ تو زبانہا بلبل
دل ربائی تو مانا کہ کشدۂ ؛ دل سوئے کاکل دِ پیچ سنبل
خاوری دود آہِ دل بہم پیچیدہ کاکل ساختند ؛ چوں گلستان رخش بردند سنبل ساختند
گرامی می تواں جست از زبانِ شمع ؛ قصۂ سوز و سازِ معشوقاں
فرہاد نیستم کہ بہ سنگے زدہ است سر ؛ از نالہ کوہ را بہ طپیدن در آورم
نازش اٹھا تابوت یا رب کس حریقِ سوزِ ہجراں کا ؛ کہ شعلہ آ کے کاندھا دے گیا برقِ درخشاں کا
عظیم ستم نمود بہ جانِ من اینکہ شب نگہش ؛ بہ بزمِ غیر رواجِ ستمگری میداد

یہی وہ شعر و سخن کے چرچے تھے جس نے علامہ کو سخن فہمی و نکتہ سنجی میں ماہر بنا دیا تھا۔ علامہ کی صاحبزادی بی بی سعید النساء (والدہ حضرت مضطر خیر آبادی) بھی بڑی شاعرہ تھیں۔ حرماں تخلص فرماتی تھیں۔ یہ مشہور و زبان زد شعر موصوفہ ہی کا ہے:۔

خانۂ یار کا کیا تم کو پتا بتلاؤں ؛ جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہے، دور بھی ہے

خیر آباد کی یہی وہ علمی و ادبی فضا تھی جس نے اس آخری دور میں بھی ریاض، مضطر، وسیم، کوثر، بسمل، نیر اور اختر جیسے صاحبِ دیوان و باکمال شعراء پیدا کیے جنھوں نے لکھنوی اسکول کی شان کو چار چاند لگائے۔ لسان الملک ریاض کی وفات کے بعد میں نے "ریاض اور خیر آباد" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون لکھا تھا جو النجم لکھنؤ جون و جولائی ۱۹۳۵ء میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔ جس میں دوسرے نامور

شعرائے خیر آباد کا ذکر بھی ضمناً آگیا ہے وَمَنْ شاء فلیطالع۔

علامہ خیر آباد سے دہلی پہنچے۔ تو وہاں بھی یہی رنگ دیکھا۔ دار السلطنت دہلی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی کاملینِ فن کا مرکز تھی۔ ولیعہد سلطنت صاحب عالم ابو ظفر (بہادر شاہ) کی شعر و سخن کی دلچسپی نے زمینِ دہلی کو اور بھی رشکِ آسمان بنا دیا تھا۔

علامہ ریزیڈنٹ کے محکمے کے سر رشتہ دار ہو چکے تھے۔ ولیعہد سے دوستانہ مراسم تھے۔ قلعہ میں آمد و رفت رہتی تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر، مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبد اللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومن، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیرّ، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا خاں عیش۔ حافظ عبد الرحمٰن خاں احسان، میر حسن تسکین۔ اور خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہو گا۔[1]

مرزا غالب سے علامہ کے پرخلوص اور گہرے تعلقات تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ دونوں بالکل ہمسن تھے۔ دونوں سنہ ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ "ثالث ثلٰثہ" تھے۔ یہ تینوں ایک جسم کے لئے "ابعادِ ثلٰثہ" (طول، عرض، عمق) کا حکم رکھتے تھے۔ جس طرح جسم اپنے ابعاد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح ان تینوں کو جسم خلوص و محبت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مفتی صاحب دونوں سے آٹھ سال بڑے تھے "چراغ" ۱۲۰۴ تاریخ ولادت ہے۔ اگر سنہ ولادت میں دونوں میں سے کسی کا ساتھ نہ دے سکے تھے تو سنہ وفات میں ایک کا ساتھ تو نہ چھوڑا۔ "چراغ دو جہان بود" ۱۲۸۵ھ تاریخ وفات ہے۔ مرزا غالب کا بھی سال رحلت یہی ہے۔ اور یہ بھی کیسا پر لطف اتفاق ہے کہ مفتی صاحب علامہ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ اور آٹھ سال بعد ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ علامہ کی وفات جزیرہ انڈمان میں سنہ ۱۲۷۸ھ میں ہوئی ہے۔ مرزا غالب نے ولادت میں ایک دوست کا ساتھ دیا اور وفات میں دوسرے کا۔

مرزا کی شعر گوئی کا طرز سب سے جداگانہ تھا۔ طبیعت مشکل پسند واقع ہوئی تھی۔

---

[1] گل رعنا ص ۳۱۲۔

علماء و فضلاء کی صحبت نے قابلیت میں اور چار چاند لگا دیئے تھے۔ روزانہ کی صحبتوں میں مشکل و ادق الفاظ استعمال ہوتے رہتے تھے۔ جملوں کی نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ مرزا جب شعر کہنے بیٹھتے تو انھیں مجالس کا خیال دامنگیر رہتا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ میرے اشعار کے مخاطب یہی باکمال حضرات ہیں۔ تحسین کی توقع بھی انھیں سے ہوتی تھی۔ اس لئے مرزا ان ترکیبوں اور مشکل و دقیق الفاظ کے لئے مجبور بھی تھے۔

مفتی صاحب اسی بنا پر سخت ناخوش رہتے تھے۔ اور ایسے اشعار سے طبیعت میں تکدر پیدا ہو جاتا تھا جس کا اظہار شہود و غیبت میں کرتے بھی رہتے تھے۔ مرزا کو آزردہ کی اس روش کی کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی۔ لیکن علامہ کے شریک مجلس ہونے اور غزلوں کو سننے اور دیکھنے کے بعد جب مرزا کو سمجھانے کی نوبت آئی کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے تو مرزا بہت پریشان ہوئے۔

مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں:۔

"کہ مولوی فضل حق صاحب، فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی میں سرشتہ دار تھے۔ اس عہد میں مرزا خاں کوتوال تھے وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا، اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا جو کچھ کر چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"۔[1]

حالی لکھتے ہیں:۔

"مولوی فضل حق کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا۔ اور اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔"[2]

---

[1] آب حیات صـ ۵۱۲ [2] یادگار غالب صـ ۲۰۱ ۔

مرزا نے اسی سے متاثر ہو کر یہ رباعی کہی تھی :۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سن سن کے اسے سخنوران کامل ؎
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ؎ گویم مشکل وگر نگویم مشکل

علامہ کی سخن فہمی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ حالی لکھتے ہیں :۔

"مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا شعر ہے :۔

ہمچناں در تُتُقِ غیب ثبوتے دارند بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے "ثبوتے" کی جگہ "نمودے" لکھا تھا مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیان ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے۔ اس کی جگہ ثبوت بنادو۔ چنانچہ طبع ثانی میں بجائے 'نمود' کے 'ثبوت' بنادیا ہے۔"[1]

اہل علم جانتے ہیں کہ اس اصلاح نے فلسفیانہ اصطلاح کے مطابق شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ مرزا کو ایسے باریک بینوں اور بال کی کھال نکالنے والوں سے سابقہ تھا یہی وجہ تھی کہ موصوف کو اپنے لئے نئی راہ نکالنی پڑی۔ اور دشواریوں میں مبتلا ہو کر "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کہنا پڑا۔

مرزا نے ایک خط میں علامہ کو خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے قصیدے پر لکھا ہے خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کی داد چاہی ہے۔ مرزا لکھتے ہیں :۔

"سبحان اللہ! باآنکہ از فراموش گشتگان ام، و دانم کہ دوست عرابہ دو جو جگر بہ نیم خس برنگیرد۔ ہر گاہ بساز دادن آہنگ گلہ روئے آرم دستجم کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، از قہرمان اندیشہ دور باشے (یعنی امتناعی) درمیاں نیست۔ بہ آئینہ بدیں شادمانی کہ ہنوز زمزمہ باد دست روئے سخنے ہست۔ آنچناں بر خویشتن می بالم کہ غم جانگداز فراموشی فراموش، و لب از زمزمہ کہ دل در بند سرودن آنست (یعنی شکایت) خاموش میگردد۔

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۹۷ ۔

از خویشتن بہ ذوقِ جفا با تو ساختیم باما دگر ساز کہ ما با تو ساختیم

درین روز ہوائے آں در سر افتاد کہ بیتے چند در توحید تتبّعاً لِعرفی گفتہ آید۔ چوں کوشش اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند و نہ مرا جائے۔ ناگزیر آں ابیات را بر کسے عرضہ میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بہ سخن پرورش تواند کرد، و پایۂ ہر یک بہ ہر یک تواند نمود۔ وَالسّلام"۔[1]

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا علامہ کو سخن فہمی و نکتہ پروری میں کیا سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ مرزا کی شاعری علامہ کی توجہ و التفات کی کس قدر رہین منت تھی۔ غالب ہی پر کیا موقوف ہے۔ علامہ کی نظرِ توجہ جس کی طرف ہو گئی اسے پارس بنا دیا۔

سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی کو (جو ناسخ و رشک کے نامور شاگرد، اور انیسویں صدی کے مشہور شاعر ہیں) مصطفےٰ بیگ نامی ایک شخص نے قتل نواب جان کے سلسلے میں پھنسا دیا تھا۔ اسی دور میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہو گیا۔ نواب فرخ آباد کے ساتھ شریک انقلاب ہو گئے۔ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ باندہ، الہ آباد، کلکتہ جیلوں میں رہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر پاپیادہ لے جایا گیا تھا۔ ان پُر صعوبت سفروں کو دیوان میں مختلف جگہ نظم کیا ہے۔ جب علامہ انڈمان پہنچ گئے تو یہ بھی شریک مجلس ہونے لگے۔ دہلی کی پُر لطف صحبتوں کا کچھ کچھ غم غلط ہونے لگا۔

منیر اپنے ایک خط میں جو انڈمان سے محمد وزیر خاں مقیم شہر باندہ کو ۲۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو بھیجا تھا۔ لکھتے ہیں :۔

"بیشتر غزلیات و بعض قصائد لباس نظم پوشیدہ از انجملہ یک قصیدہ در تتبع بدر چاچی و خاقانی کہ بہ مبالغہ و اصرارِ عالم معقول و ادب علامہ لبیب المشتہر فی الہند مولوی فضل حق خیر آبادی موطن، دہلوی مسکن، ایں جزیرہ مدفن، گفتہ ام و بخاتمہ قصیدہ کیفیت اصرار جناب مرحوم بہ نظم آوردہ۔ بالجملہ قصیدہ ایست کہ از قدرت ایزدی خبری دہد"۔[2]

علامہ کے اصرار پر (۱۵۱) اشعار کا حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی منقبت میں بڑی قابلیت سے ایک قصیدہ لکھا۔ علامہ کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ ڈیڑھ سو اشعار

---

[1] یادگار غالب ص ۳۶۵۔ [2] کلیات منیر۔

تقریباً ڈیڑھ سال میں پورے کر پائے ہیں۔ علامہ کی وفات سنہ ۱۲۷۸ھ میں واقع ہوئی۔ سنہ ۱۲۷۹ھ میں قصیدے کی تکمیل ہو پائی۔ قصیدہ کا پہلا مطلع یہ ہے:-

اشک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن   غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن

قصیدے کے آخری اشعار کے ذریعہ ساری روئداد منیری کی زبان سے سنئے:۔

مخزن فضل و کمال، عالم عالی مقام   ناقد تازی زباں نبض شناس سخن
مولوی بے نظیر فضل حق اسم شریف   دہلی سے تا لکھنؤ، مشتہر و موتمن
قید میں، میں اور وہ رہتے تھے ایک جگہ   عین سمندر میں تھے غرقۂ بحر محن
کہنے لگے ایک دن کچھ سبب اس کا بتا   شاعر اردو زباں اس میں ہوں گو یا کہن
مصطلحات عجم اور کنایات فرس   کس لئے کرتے نہیں زینتِ نظم سخن
یا متحمل نہیں، لہجۂ اردو زبان،   یا کوئی لائق نہیں تم میں سے بے ریب و ظن
گو غزل میں نہ ہو پر ہے قصیدے میں فرض   دقت مضموں سے ہے حسن بوجہ حسن
حضرت سودا بغیر کس نے قصیدے کہے   وہ بھی پر اس راہ میں ہو نہ سکے قطرہ زن
شاعروں میں جز غزل پھر نہ کسی نے کہا   زعم میں گو اپنے ہوں طوطیٔ شکر شکن

میں نے کہا راست ہے آپ جو فرماتے ہیں   آپ سنیں تو کہے کچھ یہ اسیرِ محن،
مصطلحات غریب جو کہ نہ معروف ہوں   نظم کرے کس طرح شاعرِ ہندی سخن
جو متعارف ہوا شاعروں میں پہلے سے   اس کو بھی سن کے آج ہوتے ہیں سب طعنہ زن

کہنے لگے یہ کلام مہمل و بے مغز ہے   ہیں شعرا بے سواد، جہل ہے ان کا وطن
گرم ہوئے بڑھ گیا سلسلۂ قہر و خشم   بسکہ تھے نازک مزاج، ماتھے پہ آئی شکن
کہتے تھے وہ بار بار ہندیوں سے ہے محال   رمز و کنایات میں دقت و لطفِ سخن

ہو کے ادب سے خموش پھر یہ قصیدہ کہا   کوچۂ نو میں چلا قاصدِ مشقِ کہن
قید میں قحط کتاب، حافظہ از بس ضعیف   پر مددِ غیب سے خامہ ہوا حرف زن

بعض تراکیب خاص طبع کی ایجاد ہیں نظم ہوئیں جو تھیں یاد مصطلحات کہن
نصف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم ختم ہوا جب وہ تھے ہمدم گور و کفن
میری خطائیں کریں صاحبِ انصاف عفو قید میں خود میں ہوں پوچ، پوچھے میرا سخن
غیب سے تاریخ نَو ہاتھ لگی اے منیر
جزو دل و جاں ہوئی، شرح حدیث حسن[1]

۱۲۷۹ھ

شاعری و نثر نگاری

سخن فہمی، نکتہ آفرینی اور شاعر گری کا حال، آپ معلوم کر چکے اب شاعری کی کیفیت بھی ملاحظہ کرتے چلیے۔

یہ تو گذر ہی چکا ہے کہ وطن مالوف خیرآباد علم و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دہلی پہنچے تو وہاں بھی ہر طرف باکمال حضرات کا جمگھٹا نظر آیا۔ ماحول و گرد و پیش کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد جب تک دلی میں رہے علامہ کے یہاں اہلِ علم و ادب کی نشست روزانہ رہتی۔ دہلی میں علمار کی دو جگہ نشست تھی۔ ایک علامہ کے یہاں، دوسری مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے دولتکدہ پر علامہ کے علمی دربار میں آٹھویں روز شعرائے دہلی کا بھی اجتماع ہوتا تھا۔

غالب، صہبائی، مومن، آزردہ، احسان، نیر، نثار، شیفتہ، ضمیر، ممنون نصیر عزیز

علمار میں مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی عبدالخالق، مولوی محبوب علی، مولوی نصیرالدین شافعی، مولوی کریم اللہ، مولوی نورالحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی مفتی سید رحمت علی خاں، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی محمد رستم علی خاں وغیرہم۔

ان کے علاوہ دوسرے ماہرینِ فنون میں، امام الدین خاں خوشنویس، غلام علی خاں مصور، ہمت خاں گویا۔ راگ رس خاں گویا، صوفی شاہ محمد حنیف، صوفی شاہ فدا حسین، سید عسکری، حکیم غلام نجف خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم نصراللہ خاں، قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات روزمرہ کے آنے جانے والے تھے۔

اندازہ لگائیے کہ اکبر ثانی شاہ کے شاہی دربار سے یہ دربار کس طرح کم تھے۔ بادشاہ

---

[1] کلیات منیر۔

نے لاکھوں روپے صرف کر کے نورتن جمع کئے تھے۔ اور ان شاہان علم نے اپنے حسن اخلاق سے سینکڑوں باکمال حضرات کو درباری بنالیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان مجالس کا ذکر مولانا مہر سے کیا تھا۔ انھوں نے "غالب" میں اسے نقل کیا ہے:۔

"والد مرحوم (مولانا خیر الدین دہلوی) شب کی نشستوں میں جب کبھی اس عہد کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے۔ اور آبدیدہ ہو جاتے

تمتع من شمیم عرار نجد   فما بعد العشیة من عرار[1]

فرماتے تھے کہ مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے تمام منتخب افراد کا مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی یہ مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر

---

[1] یہ شعر صمہ قشیری کا ہے۔ پانچ اشعار اسی سلسلے کے اور ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے ترجمہ کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں مولانا آزاد کو ان اشعار سے کافی تعلق ہے بعض احباب کو اپنے خطوط میں بھی تحریر فرما دیتے ہیں:۔

اقول لصاحبی والعیس تہوی   بنا بین المنیفة فالضمار

میں نے اپنے ساتھی سے جبکہ اونٹ ہمیں تیزی سے منیفہ (چشمہ بنی تمیم) اور ضمار (گاؤں) کے درمیان لئے جارہے تھے، کہا

تمتع من شمیم عرار نجد   فما بعد العشیة من عرار

عرار نجد (زرد رنگ خوشبودار پھول) کی مدت حیات صرف ایک شب ہے۔ اس سے جی بھر کے فائدہ اٹھالے کیونکہ اس شب کے بعد اس کا ملنا ناممکن ہے

الا یا حبذا نفحات نجد   وریا روضة بعد القطار

کس قدر خوشگوار ہیں نجد کے پھولوں کی مہکیں اور بارش کے بعد اسکے باغوں کی تر و تازگی کتنی پربہار ہے۔"

واھلک اذ یحل الحی نجدا   وانت علی زمانک غیر زار

نجد کے رہنے والے عزت و محبت کے مستحق ہیں انکی آب و ہوا دین کیلئے موافق ہے۔ وہاں پہنچکر کوئی زمانے کی ناموافقت کا شکوہ نہیں ہوسکتا۔

شہور ینقضین وما شعرنا   بانصاف لھن ولا سرار

مہینے گذرتے ہیں اور عیش و آرام کی وجہ سے ہمیں نصف شب اور آخر شب کا پتہ بھی نہیں چلتا۔"

فاما لیلھن فخیر لیل   واقصر ما یکون من النھار

ان مہینوں کی راتیں بہترین راتیں ہیں۔ اور ان کے دن بے حد مختصر ہیں۔

⁂

> کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا اگر کوئی نو وارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے اہل فضل و کمال کو بیک وقت اور بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا[1]

> اٹھارویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امراء کے سیلون، اور ڈرائنگ رومز کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں بعینہ یہی حال دہلی کے دیوان خانوں کی مجلسوں کا بھی تھا۔ ہر حلقے میں کسی نہ کسی امیر کا دیوان خانہ شب کے اجتماع و سمر کا مرکز بن جاتا تھا۔ اور اس حلقے کے لئے ٹھیک ایک علمی، ادبی اور تفریحی کلب کا کام دیتا تھا۔ والد مرحوم ان دیوان خانوں کی مجلس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے کاش وہ قلمبند کئے جا سکتے۔ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھا۔ دہلی مرحوم کے ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔ گو شان و شکوہ کے سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے لیکن مٹے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہد ماضی کے مرقعوں کی بہار دیکھی جا سکتی تھی[2]

علامہ نے آنکھ کھولی تو آبائی وطن خیر آباد اور اقامتی وطن دہلی میں علمی و ادبی مجالس، شعر و شاعری کی صحبتیں قدم قدم پر نظر آئیں۔ ذہانت و جودت طبع خلاق بے نیاز کی جانب سے پہلے ہی ودیعت ہو چکی تھی۔ جہاں تیرہ سال کی عمر میں سند تکمیل منقولات و معقولات حاصل کی تھی وہاں فنون ادبیہ میں بھی مہارت تامہ پیدا کر لی تھی بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا۔ عربی، فارسی، دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرمائی۔ فارسی شاعری کے لئے فرقتی تخلص رکھا۔

فرقتی در کعبہ رفتی بارہا ، ہو ۔   نامسلماں نامسلمانی ہنوز[3]

علامہ نے ادب عربی میں وہ کمال پیدا کیا کہ عرب کے معاصرین شعراء سے کہیں سبقت لے گئے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی شاعری کی ہے۔ رسالہ الثورۃ الہندیہ اور بعض خطبات اس کے شاہد عادل ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے المناک واقعات کے بیان میں، بحالت اسیری، جزیرہ انڈمان مصائب و آلام کے بے پناہ

---

[1] غالب از مہر صفحہ ۲۹ [2] غالب از مہر صفحہ ۲۹ [3] گلزار بہار صفحہ ۱۱۲۔

ہجوم میں جو فصاحت و بلاغت اور درد انگیز پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔ اس سے علامہ کی زبان عربی پر مہارت اور قدرت کاملہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

”مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید“ کے اصول پر جب اہل علم و ادب اس رسالہ کو جو اب تک پردۂ خفا میں تھا اور اب اس سوانح حیات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے دیکھیں گے تو مشام جاں کو معطر بنائے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اور سر دھننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا۔

علامہ نے پچاسوں قصیدے کہے ہیں جن میں نعت کا حصّہ زیادہ ہے۔ ہزارہا اشعار مختلف بیاضوں میں (جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہی ہیں) موجود ہیں[1]

علامہ عربی اشعار حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ کو دکھاتے تھے۔ اوائل عمری کا واقعہ ہے عرب کے مشہور اشعر الشعراء امرء القیس کے ایک قصیدے کے طرز پر قصیدہ لکھا۔ شاہ صاحب کو جا کر سنایا۔ مولانا شاہ غوث علی قلندر کا بیان ہے کہ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے متقدمین کے بیس اشعار پڑھ دیے۔ مولانا فضل امام بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ وہ فرمانے لگے کہ بس حدّ ادب۔

عرض کیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں۔ فن شاعری ہے۔ اس میں؛

---

[1] ۳۶ اور ۴۲ اوراق کے دو قصیدے اور قصائد فتنۃ الہند سبحان اللہ اورینٹل کلیکشن لٹن لائبریری، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں ہیں۔ دو بیاضیں مولوی شاہ ولایت احمد لاہر پوری سجادہ نشین آستانہ قلندریہ کے کتابخانہ میں اور کلام کا کچھ حصہ جس میں اصل مسودہ بھی شامل ہے کتابخانہ سفیان گوپامؤ میں ہے۔ ایک نامکمل بیاض جس میں عربی میں مختلف بزرگوں اور دوستوں کے نام چھ خطوط اور پندرہ طویل قصیدے ہیں جن میں اکثر مکمل اور بعض نامکمل ہیں۔ محب محترم مولوی حکیم نصیر الدین اجمیری برادر زادہ مولانا معین الدین الاجمیری کے پاس ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بعض قصائد و خطوط خود علامہ ہی کے دست مبارک کے لکھے ہوئے ہیں کہیں جگہ دستخط بھی ثبت ہیں۔ اس بیاض کی نقل اور رسالۃ الثورۃ الہندیہ مع قصائد فتنۃ الہند حضرت الاستاذ علامہ اجمیری کے ہاتھ کے لکھے ہوئے میرے پاس بھی ہیں۔ رسالۃ الثورۃ الہندیہ مع قصائد فتنۃ الہند کتابخانہ حبیب گنج، کتابخانہ ٹونک اور کتابخانہ مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی میں بھی موجود ہے۔ ۱۲

بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا:۔

" برخوردار تم سچ کہتے ہو۔ مجھ کو سہو ہوا ہے"[1]

عربی قصائد کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۲ھ میں بمقام بانسی ۸۰ اشعار کا نعتیہ قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

یاسائلاً عن شانہ یغنیک عن تبیانہ   دمع جری فی شانہ ھملاً وفرط انانہ
ماذا تسائل نازعا، قاصی المواطن نازحا   عنھا الیھا نازعا، یشکوا اسا توقانہ
فھواہ فی ھیجانہ، وجواہ فی وھجانہ   والطرف فی ھمعانہ والقلب فی خفقانہ
ان شام برقا وامضا اھراق دمعا قابضا   فاذاع سرا غامضا قد جد فی کتمانہ
واذا تالق بارق اوسح وبل وادق   فاجاہ دمع دافق و ذکا لظی نیرانہ
یزداد فی ھیمانہ ویحن فی اشجانہ   ان اورق فی بانہ، غنی علی اشجانہ

رمضان المبارک ۱۲۳۶ھ میں ۱۱۱ اشعار کا قصیدۂ نعتیہ دربار رسالت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس کے چند متفرق اشعار یہ ہیں:۔

خفا خفی ھواہ دمعہ الجاری،   لما خفا بارق بادی السنا شاری
ویلاہ من ھائم کلف تکلف ان   یبدی التجلد اسرارا لاسرار
وکیف یخفی الھوی من کان لوعتہ   تبدو اذا ادکر الدار والجار
کم لائم لامہ عنفا وعیرہ،   جدا فلم یکترث باللوم والعار
ومن اطاع الھوی طوعا و دان لہ   فلا محالۃ یعصی اللائم الزاری
یالائمی فی ھوی العذرا ابیت لک ان   جلوتھا فی الھوی العذری اعذاری
ما للکری یتحامی مقلتی و قد   دب المنام الی اجفان سمار
کم بات فی عضدی من لو تاملہ   بدر لعاد ھلالا لابعد ابدار
للہ در زمان بالحبیب مضی   لو کان یبقی وھل باق سوی الباری

مولانا فیض اللہ رفیق خاص محب با اخلاص کے حادثۂ شہادت پر ۲ رجمادی الآخر

---

[1] تذکرۂ غوثیہ۔

سنہ ۱۲۳۶ھ کو خبر وحشت اثر ملتے ہی شب کو ۵۳، اشعار کا مرثیہ لکھا بعض اشعار درج ذیل ہیں

أَیَا ما اللَیلیٰ لاتسیر نجومُہ   وما لصباحی لایہب نسِیمہ
کذبت ومن این الصباح لجانع   بجنح دجی لایستنیر بہیمہ
وما بال طرفی لایلذ بنومۃ   وقد طال جدًّا سہدہ ونجومہ
لقد ساقہ ظلما علیہ اخٌ لہ   یعادیہ مشئُوم الشمال لئیمہ
علی غیر ذنب غیر ان الٰہہ   حباہ اعتزا راحلّ عنہ سہیمہ
فطوبیٰ لمن یودی شہید افیدخل   الجنان ویلقی فی الجحیم خصیمہ
لہ فی جنان العدن نعمی وللذی   یقتّلہ سوء العذاب الیمہ
فیا صاحبی لفضل الدیوم سقی ثری   ضریحک من غیث یبثّ دلومہ
علیک سلام اللہ ما قال ساہر   ایا ما للیلی لاتسیر نجُومہ

اسی حادثۂ شہادت کے متعلق والد ماجد مولانا فضل امام کو ایک نیاز نامہ، ۲۷ر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۳۶ھ کو جب کہ مولانا پالی میں قیام فرما تھے، لکھا۔ اور اسی کے ساتھ ۲۰ر جمادی الاولیٰ کا لکھا ہوا ۱۰۵، اشعار کا مرثیہ بھی بھیجا۔ جس کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔ مولانا محمد فیض اللہ نے جام شہادت نوش کرنے سے قبل خواب دیکھا تھا۔ جس میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ سرکار رسالت نے عزت کے ساتھ گلے لگا کر سیدھے ہاتھ پر بٹھایا تھا۔ دو اشعار اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں:۔

ایا ما للدہری بعد اسعادہ عدا   واَعتَد لی اَدھی المصائب واعتدیٰ
تسابعد لین واعتدی بعد مرفق   وواعَد لطفا ثم عاد فاوَعدا
فکنّا زمانا لانخاف فراقنا   مدی الدھر حتی قیل لن یتبدّدا
فلما افترقنا بعد طول اجتماعنا   بلینا ببعدٍ ما لمدّتہ مَدیٰ
فواللہ ثم اللہ لو ان مثلہ   یفادی بمثلی کان نفسی لہ الفدا
قتلت شہیدا عند ربک شاہدا   وقد کنت مشہودا لکمال محمّدا

تعیشت فی الدنیا حمید المحمدا — وفارقتها متشهدا متشهدا
وقد ایقنت نفسی بان ستفوز با — لشهادة اذ زرت النبی محمدا
فحیاك اکراما وضمك رافة — واداك فی النادی وارواك بالندی
علیك سلام اللہ ما رن جانع — وحن غریب ند فیه مصعدا
سلام علی قبر حواك فنانه — حوی منك احانا وبرا ومحتدا

۴۲ ر اشعار کے قصیدۂ نعتیہ میں محرم سنہ ۱۲۴۱ھ میں لکھتے ہیں:-

واھا لواہ مکمد فی جنح لیل سرمد — قد بات لیلة ارمد یلقی القذی من اثمد
یا ویله یا ویله یشکو الزمان ویله — ویقول یشکو لیله یا لیل هل لك من غد
یصف النجوم وشومها یرعی السما نجومها — دریها وخومها من نثرة او فرقد
ماوی الانام باسرهم طرا وجابر کسرهم — لطفا وواضع اصرهم عنهم غدا فی الموعد
خیر الوری وابرهم جهادا وکاشف ضرهم — وملجاءهم فی امرهم وشفیعهم فی المشهد
حامی الحقیقه انجد اعلی الخلیقه انجد — زاکی الخلیقة احمد خیر الانام محمد
هو اول النور السنی یتلوه کل تعین — ثانیه لیس بممکن عند الحصیف المهتدی

یہ تو نظم کے چند نمونے تھے۔ عربی نثر نگاری کا صحیح اندازہ مختلف اصناف سخن سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے عربی نثر کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ اہل علم علامہ کو ایک فلسفی اور مجاہد کی حیثیت سے جانتے رہے ہیں۔ ادبی عظمت، فلسفہ، جہاد سے مغلوب ہو کر پردۂ خفا میں رہ گئی تھی۔

علامہ اپنے والد ماجد مولانا فضل امام کو اپنے ابن العم۔ مولوی محمد بقا کے انتقال کی خبر سن کر ۲۰ ذیقعدہ سنہ ۱۲۳۴ھ کو ایک طویل عریضہ دہلی سے دجانہ لکھتے ہیں اس خط کا ابتدائی کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے:-

اقبل ارضا یهزی شمیم ترابها العتیق ؛ بالمسك الفتیق ؛
والعنبر السحیق ؛ واستلم عتبة هی قبلة طلاب التحقیق ؛

وارباب التدقیق ؞ فیایّها الرجال رجالا، علی کل ضامر بکل فج عمیق ؞ من کل بلد سحیق ؞ بین یدی الامام الحبر ؞ بل القمقام البحر ؞ مولانا الشیخ الفخر ؞ الهازئة شذرات کلامه بعقد السحر ؞ وقلائد نظامه بعقود النحر ؞ لازال بابه مقصودا، وفضله محمودا، وکرمه محمودا، وظله ممدودا، مدی الدهر ؞ بحرمة محمد الامین صلی الله تعالیٰ علیه وسلم -

وبعد فماذا یصف المملوک من حزن دهاه ؞ وشجن ادهاه ؞ ونصب شغله عن عیشه والهاه ؞ وشجو عاناه ؞ وکرب اناه ؞ وکمد عنّاه ؞ ووجد اَضناه ؞ وقلق ایسره بسکرة الموت وادناه ؞ وجزع بلغ به غایته فما اغناه ؞ لما بلغه نعی اجودِ مَن نعاه ناع ؞ ودعا له بالرحمة داع ؞ وندبه حزین لاع ؞ وافضلِ مَن وُصف بطول باع ؞ وبسط ذراع ؞ واسخی مَن اَمّه معتف وسعی الیه ساع ؞ واسبقِ ساع ؞ الی معال ومساع ؞ ذی عطاء مکتوم وثناء مُشاع ؞ وعِرض مصون وعَرض مضاع ؞ السمیدع المتقی الحمید اللقا ؞ الراقی من ذری المجد اعلی مرتقی ؞ الباقی فی جوار رحمة الله محمد بقا ؞ اکرم الله مثواه، ونزّله فی دار البقا ؞ وبرّد ضریحه بشآبیب رحمته وسقی ؞ فبالله ای قمر انخسف بعد اِبداره ؞ وای نظر انکشف غِب اِدراره ؞ وای نجم خوی وهو طالع فی وسط سمائه ؞ وای نجم ذری وهو طالع فی نشوه ونَمائه ؞ اهکذا یموت الشبان ؞ قبل الامان ؞ اهکذا یزوی البان وهُو اَیّان ؞ اهکذا تطرق الموت قبل اوانه ؞ اهکذا یموت الشب فی عنفوانه ؞ اهکذا یتردّی السرّی ؞

اهكذا يتمشى الحسرات ؛ اهكذا يحدث الاحداث في الجديدين ويتجدد ؛ اهكذا يتفرق الشمل ويتبدد ؛ ياليت الزفرات المردّدة ؛ والجيوب المقدّدة ؛ و الدموع المتحدرة ؛ والانفاس المتصعدة ؛ اغنت من موت فاجع ؛ اوشفت بلابل جازع ؛ ويا ليت المندوب يرجع ويؤوب ؛ كلّا ان سكرة الموت سكر ليس له صحو ؛ وظلمة القمر دجية ليس بعدها ضحو ؛ وكذا الدنيا اولها الفة ؛ واٰخرها لهفة ؛ واولها امل ؛ واٰخرها اجلٌ ؛ واولها اُمنيّة ؛ واٰخرها منيّة ؛ واولها سرور وغرورٌ واٰخرها مُضِيّ ومرورٌ"

ایک دوسرے خط میں ۵ ربیع الاول ۱۲۳۶ھ کو مولانا خلیل الدین بن نجم الدین الکاکوروی کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"وبعدُ فرُبّ اذُنٍ عشِقتْ قبل العين ؛ ورب اثر اثر قبل العين ؛ وكم في الورىٰ ؛ من هام يطيف سرى في الكرىٰ قبل ان يرىٰ ؛ ولواعج الشوق قد تهتاج بسورة ؛ قبل لقيان وزورة ؛ وكم من حبيب يتصبّا قبل ان يُرى ؛ وكم من لهيب يتلظى قبل ان يورى ؛ والبعد المتوقفين عن الريب ؛ من ايقن بالغيب ؛ كذلك مولانا ان لم الاقه ؛ فقد همت باخلاقه ؛ وان كنت لم اره ؛ فقد سمعت خبره ؛ وان لم اكن لقيتُه ؛ فقد لقيني صِيتُه ؛ وشاقتني احاديث كماله ؛ وان لم اكتحل بلألا جماله ؛ وهيمتني نوافح عَرفه ؛ ومنائح عُرفه ؛ قبل ان اشرف منه بعرفه ؛ وبعوارف نشره ؛ قبل معارف بشره ؛ وشغفت بريّاه ؛ قبل ان يرى محيّاه ؛ ولم يزل مذاخر

بمدامعه ؛ ظامیاً الی الاستمتاع بمنامحه ؛ وما فتیٔ منذ انبیٔ بانبائه ؛ یتلمس سبیلاً الی لقائه ؛ لیستضیٔ بلألأه ؛ ویستفیٔ من آلائه ؛ ولکن لم یساعده علی ذلک الدهر ولم یساعف الزمن ؎

ما کل ما یتمنی المرء یدرکه   تجری الریاح بما لا تشتهی السفن

مولانا شیخ احمد الانصاری الیمنی الشروانی صاحب نفحۃ الیمن مشہور ادیب عصر کو ۱۹ جمادی الآخرہ ۱۲۳۶ھ کو ارقام فرماتے ہیں۔ علامہ کے شریکِ کار سلطنت اودھ اور رفیق خاص ومحب مخلص مولانا محمد فیض اللہ الشہید کو ان کے حاسد بھائیوں نے موقع پاکر شہید کر ڈالا تھا۔ اس حادثۂ فاجعہ سے علامہ سخت متاثر ہوئے حکومت میں دادرسی کے لئے کوشاں ہوئے۔ مولانا شروانی کو اعانتِ مظلوم کی طرف توجہ دلا رہے ہیں:۔

”فقد کان المملوک مملوکاً له بلا رِقّ ؛ واخاً له بلا اجتماعٍ معه فی عِرق ؛ وقریباً له بالمصافاة ؛ لا بالمکافاة ؛ و نسیباً له بالحب والوِداد ؛ لا بالآباء والاجداد ؛ وحسیباً له بالصداقة والخلال ؛ لا بالاعمام والاخوال ؛ ورب بعیدٍ تقارب بالوداد ؛ وقریبٍ تباعد بالاحقاد ؛ والارواح جنود مجندة، ما تعارف منها ائتلف ؛ وما تناکر منها اختلف ؛ فنزعت الی الشیخ المولی ؛ فخله بان یشکی مظلتی اولی ؛ فقد قیل ان المناسبة فی الادب ؛ فوق المقاربة فی النسب ؛ فان رق مولانا لبابه متنجع ؛ و شائه متوجع ؛ وحنان مرجّع ؛ ولهفان مسترجع ؛ من علینا باسو الکلوم ؛ ونصر المظلوم ؛ فالمامول من المولی ان لا یالو جهداً الی ان یجازی ؛ ادام الله ایامه من ظلم بنقمة، ویواسی ؛ من خلقه المظلوم بنعمة ؛ ویبقی ما

کان ادتلی ولاخی لتربیۃ ایتامہ؛ اسباغا لمنہ واتماما لانعامہ"

سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں علامہ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے۔ یہ خطبہ حضرت الاستاذ مولانا الاجمیری کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ رسالہ 'الثورۃ الہندیہ' کے آخر میں میرے پاس بھی موجود ہے۔ اس کا کچھ اقتباس پیش ہے:-

"امابعد فان الدنیا غرور؛ مالہا قرور؛ بل قرورہا مرور؛ وظلہا حرور؛ لایوازی ہمومہا سرورہا؛ ولا یوازن خیورہا شرورہا؛ ولا تتکافی معافاتہا؛ وآفاتہا؛ ولاتتادی افراحہا؛ واتراحہا؛ ولاعنہا وراحہا؛ ولا یلاقی سمومہا نعیمہا؛ ولا سمومہا نسیمہا؛ ولا ضنکہا رخاءہا؛ ولا زعزعہا رخاءہا؛ تریاقہا شمال؛ ونقصانہا کمال؛ وعاقبۃ عافیتہا اوصاب؛ وحلوہا وسلوہا علاقم اوصاب؛ اولہا حبور؛ وآخرہا ثبور؛ وصفاءہا غبار؛ ونقاءہا غبور؛ واہلہا بور؛ وقصورہم قبور؛ کل من عمر فیہا مرموس؛ وکل ما عمر فیہا مطموس؛ وکل من اوی وان ثری؛ فان مصیرہ الی الثری؛ مبادیہا آمال ومنا؛ وعواقبہا آجال ومنا؛ ما فیہا صفو عیش الا ویکدّرہ نوازل الاحداث؛ وما علیہا من ذی نفس ونفس الا وہبوطہ منازل الاجداث"

۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۶۱ھ کو مولانا حیدر علی فیض آبادی کو موصوف کی کتاب "منتہی الکلام" کے موصول ہونے اور اس کے مطالعہ کرنے کے بعد ایک طویل خط میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب مولانا نے ایک شیعی متبحر عالم سبحان علی خاں کے رسالہ مصنفہ سنہ ۱۲۴۷ھ کے جواب میں سنہ ۱۲۵۰ھ میں لکھی ہے۔ سنیوں کے دلائل قاہرہ اور براہین باہرہ اس میں درج ہیں۔

کذلك استبشرت اذ منّ له المولیٰ علی بارسال کتابه ؛ فلثمت لثامه ورحبت من اتی به ؛ فیالها من نعمة وافیة سرت فسرّت موافاتها ؛ ومنة کافیة اصطنعت فامتنعت مکافاتها ؛ فکان طلوعه علیّ قبل تطلعی الیه ؛ وطلاعی مافیه واطلاعی علیه ؛ أبهج من تباشیر طلوع الصباح علی عاشق مهجور ؛ وابلج من تباشیر طلوع الصباح، فی غاسق دیجور ؛ فاما ما حرر المولی الی رقه من توقانه ؛ الی العبد الذی کاتبه باحسانه وحنانه ؛ فکانما هو صدی احنینی الی لقیانه ؛ فانی مذ طالعت کتابه الموسوم بمنتهی الکلام ؛ واطلعت علی مافیه من کلام ؛ فی مالها من التیام فی نحر کل نحر من اللئام ؛ ورأسه ان المولیٰ لم یال جهدا فی تخریج روایاتهم ؛ واجتهد جدا فی الارشاد والتنبیه علی غوایاتهم ؛ وامعان النظر لتبصیر عمایاتهم ؛ وتصفح کتب علمائهم لاعلام جهالاتهم ؛ ولم یصفح عن صفائح صحائفهم الی ان دلّ علی ضلالاتهم ؛ ونکی فی نحور نحاریرهم ؛ بما طعنوا فی تحاریرهم ؛ وابکم السنة وقاریرهم ؛ بقلب دقاریرهم ؛ بردتقاریرهم ؛ بل باقاریرهم ؛ فاشجی اخلیائهم المترفین باشجان من الاشجان والاوکار ؛ ولم یذر لدهاتهم لانکار سبیلا الی الانکار ؛ ولم یدع لقائل مجال اقال ؛ بل غال کل غال ؛ اوغل فی العلم من ادغال ؛ فتری کل مفترٍ مفترا، وکل نکر منهم مستنکرا ؛

——— لازال مشتاقا الی لقائه ؛ داعیا بطول بقائه ؛ لاصلاح مفاسد المبتدعین ؛ وفضوح مکائد المختدعین ؛ وقطع الدابر المدابرین المتبدرین ؛ وارغاما بالانوف المکابرین المتکبرین ؛

واما ما استکشف عنه المولیٰ الجلیل النبیل ؛ من حال النزیل التذیل ؛ فانما هو خال خال ؛ بل شن بال مغطی

بسربال ؛ مبتلى بوبال ؛ غير ذى خطر وبال ؛ لا يستاهل ان يخطر بخاطر وبال ؛ ولا بان يعبا به مبال ؛ فانه انما ضيع عمره فى مراث ومبال ؛ او توغير وخبال ؛ لا يتوسم فيه من العلم علامة وقصارى امره انه تكلامه ؛ يحفظ قصصا واساطير مخترعه، مخترعة مختلفة فى باب الامامة وهى اكاذيب موضوعة ؛ لا احاديث مرفوعه ؛ قد صاغها صواغون طاغون ؛ وتناقلها راوون غاوون ؛ يعدون كذبات ؛ ويعدونها قربات ؛ وائمة الهدى يشهدون عليهم بانهم زنادقة ؛ وشهادات الائمة لاشك صادقة ؛ ومن يقص اكاذيب الاسمار واباطيل الاخبار ؛ لا يستاهل ان يعدّ من معاشر العلماء، او من قبيل الاحبار ؛ بل هو ادون حالا ؛ واخس مآلا ؛ من سمير ؛ يؤنق فى سرد الملهيات لتنويم امير ؛ ومن هاذٍ هازل منطيق ؛ يفترى خزعبلات بتلفيق ؛ تعليلا لقلب عليل، او تطييبا لخاطر رفيق ؛ وحاشا ان يكون ذلك من العلوم والمعارف ؛ وغايته ان يعدّ من الملاهى والمعازف ؛

صورة ما كتبه الامام الافاضل ؛ النحرير الكامل ؛ علم الهدىٰ سند الورىٰ ؛ مسند الوقت، حجة العصر، الاستاذ المطلق ؛ المولوى فضل الحق ؛ الخيرابادى ؛ صانه الله من شرور الاعادى ؛

مقرظا على هذا الكتاب المستطاب

بسم الله الرحمٰن الرحيم ۔ اثنى على ربى الحميد واحمد ؛ واصلى على من هو من سائر حماديه احمد ؛ وخلقه كخلقته من خلائق الخلائق احمد ؛ واسمه كالمسمى محمد واحمد ؛

علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ الصلوٰة الدائمة السلام السرمد؛

وبعد فقد طالعت الرسالة التی صنفها ورصفها مولٰنا الاودع الاروع الاورع؛ البارع المتبرع؛ الفارع المتفرع؛ الضارع المتضرع؛ ذو المناقب الثواقب الجلیله؛ والانظار الثواقب الدقیقه؛ الجامع بین العلوم العقلیة والنقلیه ومعارف الشریعة والحقیقه؛ طلاع الثنایا والنجاد؛ ذائع الصیب فی انجاد الحق وفلّ قرنٍ طلع من النجد فی الاغوار والانجاد؛ العریف الغِرّیف؛ الشریف الغِطریف؛ الصفی الحفی؛ الحصی الحفی؛ مولانا المولوی؛ فضل الرسول، القادری الحنفی؛ متع الله المومنین بطول بقائه؛ وصانه فی حرزه ووقائه؛ وجعل خیرا یامه یوم لقائه؛ فاذا هی مع وجازتها جامع لحقائق العقائد؛ دافع لمکائد اهل الحقائد؛ کلها تبیان واصراح؛ للحق الصراح؛ وتبیین لاوضاع الهدیٰ وایضاح؛ طلاع مطالع عباراتها الفصاح؛ لصبح الحق الصابح اصباح وافصاح؛ ولظلام ظلم المبطل کشف وفضاح؛ وتلائم الکلم التی سردت فیها بالاقتراح؛ اِلّام للقرائح بالهام الحق القراح؛ فکم ذو قرح وجرح لمن اجترح الافساد والاستجراح؛ یهتدی بها الضلیل الی سفن اهل السنة السنیه؛ ویرتوی بها الغلیل من شریعة الشریعة البیضاء الهنیه؛ قد فصم بها فُرق الفرق بین العقائد الحقه الدینیه؛ وبین باطیل الفرق الدنیه؛ وافتضح بها عوار الاعاور الرویه؛ من المعتزله والنجدیه؛ فاذ قد نجد بها الحق نجودا؛ تریٰ کل نجدی منکودا منجودا؛ بل هالکا منجودا؛

یجد علیہا کل من بغی وطنی وجدا ؛ یجد بہا کل من بغی دجل
الرشد فیجدہ بہا وجودا ؛ فجزی اللہ مولٰنا خیر الجزاء ؛
وخصہ من فضلہ العمیم باوفی الاجزاء ؛ وتقبل جہدہ و
شکر سعیہ ؛ واحسن فی الدارین رعیہ ؛ آمین ؛ بمحمد الامین ؛
وآلہ المیامین ؛ وصحبہ الحامین ؛ علیہ وعلیہم ازکی صلوٰۃ
المصلین ؛ واسنی تسلیمات المسلمین ؛ وجزاہ وجزاہم احسن
جزاء عن سائر المصلین ؛ من المومنین والمسلمین ؛
کتبہ العبد الفقیر الی ربہ الغنی محمد فضل حق ؛
الفاروقی الحنفی الخیرآبادی ؛ عاملہ اللہ بلطفہ البادی ؛
فی العواقب والمبادی ؛

مولینا فضل رسول بدایونی نے عقائد میں ایک کتاب المعتقد المنتقد ۱۲۷۰ھ عربی زبان میں لکھی تھی۔ اس پر علامہ فضل حق کی یہ تقریظ ہے۔

اس پر فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں قدس سرہ نے تعلیق لکھی ہے، جس کا نام ہے المستند المعتمد بناء نجاۃ الابد۔ جو کتاب کے ساتھ ذیل میں طبع ہوئی ہے۔ اور لاجواب تحقیقات ۱۳۲۰ھ پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ترکی میں آفسٹ پر طبع ہوا ہے۔ ضخامت دوسو ستاون ۲۵۷ صفحات ہے۔

سلسلۂ تلمذ

علامہ نے سند حدیث حضرت شاہ عبد القادر بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم محدث دہلوی سے حاصل کی۔ علامہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی صاحب لمعات واشعۃ اللمعات کے بعد شاہ عبد الرحیم ہی کے خاندان سے یہ بابرکت علم حدیث ہندوستان میں پھیلا۔ ملک میں صدیوں سے معقولات کا دور دورہ تھا۔ شاہان وقت نے علم معقول کی سرپرستی تو کی تھی لیکن علوم نقلیہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ یہ شاہ صاحبان کا ہی طفیل ہے کہ آج ملک کا گوشہ گوشہ نور علم سے معمور ہے اور ہر وادی سے قال اللہ، قال الرسول کی صدائیں اٹھ

رہی ہیں۔ اُس دور میں کتب دینیہ کی کمیابی کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث کو تفسیر کبیر یا کسی دوسری کتاب تفسیر و حدیث کے دیکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو قلعہ معلیٰ میں جانا پڑتا تھا۔ بخاری شریف جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے نسخے بھی خال خال ہی پائے جاتے تھے۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سامنے بھی حضرت علامہ نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ عربی اشعار شاہ صاحب ہی کو دکھاتے تھے۔ سلسلۂ تلمذ یوں ہے:۔

سلسلۂ تلمذ منقولات

۱۔ علامہ فضل حق خیر آبادی

۲۔ حضرت شاہ عبد القادر محدث۔
و
حضرت شاہ عبد العزیز محدث۔

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث۔

۴۔ ابو الطاہر مدنی

۵۔ شیخ ابراہیم کردی۔

۶۔ احمد قشاشی۔

۷۔ الشمس محمد بن احمد الرملی۔

۸۔ الزین زکریا الانصاری۔

۹۔ حافظ ابن حجر العسقلانی۔

۱۰۔ ابراہیم بن احمد التنوخی المعروف بالبرہان الشامی۔

۱۱۔ الشیخ احمد بن ابی طالب الحجاج

۱۲۔ ابو عبد اللہ الحسین بن مبارک الزبیدی البغدادی۔

۱۳۔ ابو الوقت عبد الاول بن عیسیٰ بن شعیب بن اسحٰق السنجری، الصوفی، الہروی۔

۱۴۔ جمال الاسلام ابو الحسن عبد الرحمٰن بن محمد الداودی۔

۱۵۔ ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن حمویہ السرخسی۔

۱۶۔ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف مطر الفربری۔

۱۷۔ ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم البخاری۔

سلسلۂ تلمذ معقولات

۱۔ علامہ فضل حق خیر آبادی المتوفی ۱۲۷۸ھ

۲۔ مولانا فضل امام خیرآبادی المتوفی سنہ ۱۲۴۰ھ
۳۔ مولانا عبد الواجد کرمانی خیرآبادی " سنہ ۱۲۱۸ھ
۴۔ ملا محمد اعلم سندیلوی۔
۵۔ مولانا کمال الدین سہالوی۔
واستاذ الکل فی الکل ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی المتوفی سنہ ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء
۶۔ ملا قطب الدین شہید سہالوی " سنہ ۱۱۰۳ھ
وملا امان اللہ بنارسی " سنہ ۱۱۳۳ھ
۷۔ مولانا دانیال جوراسی
۸۔ مولانا عبد السلام دیوہی۔
۹۔ مولانا عبد السلام لاہوری۔ " سنہ ۱۰۳۷ھ
۱۰۔ امیر فتح اللہ شیرازی " سنہ ۹۹۷ھ لہ

مولانا دانیال جوراسی وغیرہم کا سلسلہ علامہ جلال الدین محمد اسعد محقق دوانی المتوفی سنہ ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ء (زمانۂ سلطان ابو سعید) صاحب شرح ہیاکل وحاشیہ شرح تجرید

لہ علامہ خیرآبادی کے سلسلۂ اساتذہ کے اکبری عہد تک کے حالات مختصراً درج کیے جاتے ہیں۔ والد ماجد مولانا فضل امام اور ان کے استاد مولانا عبد الواجد کرمانی خیرآبادی کا ذکر اپنے مقام پر گذر چکا ہے۔

ملا اعلم سندیلوی مولانا کرمانی کے استاد ملا اعلم سندیلوی اپنے عہد کے امام فن تھے تحصیل علم کے بعد دہلی پہنچے۔ محمد شاہ بادشاہ کے مقرب شاہ باسط کے ذریعہ دربار تک رسائی چاہی۔ شاہ باسط نے امتحاناً اپنے بھتیجے سے مناظرہ کرایا کافی بحث و مباحثہ کے بعد مخالف کو زیر کر لیا اور جائے قیام پر واپس آ کر عہد کیا کہ کبھی دنیاوی حاجت کسی کے سامنے پیش نہ کریں گے۔ چار روز رہ کر وطن مالوف سندیلہ آ گئے! ور وہیں متوکلانہ زندگی بسر کی حاشیۂ صدرا، رسالۂ تشکیک، تعلیقات بر میر زاہد ملا جلال، حاشیہ دائرہ اور لطائف تصانیف یادگار ہیں۔ وفات کے وقت تلامذہ و احباب کو بلا کر اپنے مذہب حنفی، طریق چشتی اور عقائد نسفی پر گواہ بنایا یہ شعر پڑھا ؎ مابین دو حرف آمد ایں راہ ؛ اللہ محمد، محمد اللہ اس کے بعد کلمۂ طیبہ پڑھ کر ۸۴ سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے۔ شاگرد پر بڑی شفقت کرتے تھے اسی شفقت نے شاگرد کو مرتبۂ کمال تک پہنچایا تھا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۸ کا) **شیخ کمال الدین** ملا اعلم سندیلوی کے استاد مولانا شیخ کمال الدین، ملا نظام الدین سہالوی کے بنی اعمام سے ہیں فتحپور میں جو سہالی سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے) مخدوم زادگان کے یہاں شادی کی اسی جگہ قاضی بھی ہوئے۔ ان دو وجوہ سے وہیں اقامت گزیں ہو گئے۔ ملا نظام الدین کے از اول تا آخر شاگرد تھے۔ صاحب مآثر الکرام کے زمانے میں حیات تھے۔ نہایت آب و تاب کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ علم کلام میں العروۃ الوثقیٰ اور حاشیۂ شرح عقائد جلالیہ تصانیف سے ہیں۔ ملا اعلم نے ملا نظام الدین سے بھی پڑھا ہے۔

ملا نظام الدین ان دونوں بزرگوں کے استاد ملا نظام الدین سہالوی صاحبِ درس نظامیہ تھے۔ پورب کے قصبات میں تحصیل علم کر کے جناب شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے بقیہ تحصیلی کتب پڑھیں، لکھنؤ ہی میں مقیم ہو گئے۔ تدریس و تصنیف میں مشغول ہو کر بڑی شہرت و عزت کے مالک ہوئے۔ فارغ التحصیل علمار حاضر ہو کر شریکِ حلقۂ درس ہوتے۔ حضرت مخدوم شیخ عبدالرزاق بانسوی سے بیعت ہوئے۔ حاشیۂ صدرا اور شرح مسلم الثبوت تصنیف کیں۔ صاحب مآثر الکرام سے ۱۹ر ذی الحجہ ۱۱۳۶ھ کو لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ ۹ر جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ کو سفر آخرت اختیار فرمایا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی:-

عالم کامل امام عصر استاد جہاں　　طائر روحش بہ سیر جنۃ الماویٰ شتافت
سال تاریخ وفات او بطور تعمیہ　　گفتہ شد ملا نظام الدین دل فردوس رفت
۶۱ ۱۱ھ

نصابِ درس نظامیہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے۔ فرنگی محل لکھنؤ کے خاندانِ علمار کے آپ ہی مورثِ اعلیٰ ہیں۔

ملا قطب الدین سہالوی ملا نظام الدین کے والد اور استاد ملا قطب الدین شہید سہالوی تھے۔ سہالی مضافات لکھنؤ میں شیخ زادگان کی قدیم بستی ہے۔ یہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور میزبانِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہیں۔ اس بستی میں عثمانی شیخ زادگان بھی آباد تھے۔ ملا دانیال چوراسی شاگرد ملا عبدالسلام دیوی اور قاضی گھاسی سے تلمذ حاصل ہے۔ آخر الذکر سے ہی بیعت بھی ہوئے تھے۔ یہ شیخ محب اللہ الہ آبادی کے تلمیذ و خلیفہ تھے۔ ملا شہید کا دریائے فیض پورے زور و شور کے ساتھ جاری رہا۔ —— اکثر علمار ہندوستان کا سلسلہ موصوف تک پہنچتا ہے۔ شیخ زادگان عثمانی نے شرکتِ زمین داری کی نزاع کی وجہ سے اسد اللہ خاں زادہ چینپی پور سے ساز باز کر کے ملا قطب الدین پر شبخون مار کر شربت شہادت نوش کرایا۔ ۱۱۰۳ھ میں یہ حادثہ ہوا۔ قتل کے بعد مکان میں آگ بھی لگا دی۔

(بقیہ ص۱۷۹ کا) اثاث البیت کے ساتھ ملا شہید کی لاجواب تصنیف حاشیہ شرح عقائد دوانی بھی نذرِ آتش ہو گئی۔ "قطب عالم شدہ شہید اکبر" مصرع تاریخ ہے۔

ملا امان اللہ بنارسی ۱۱۰۳ھ ملا نظام الدین کے دوسرے استاد حافظ ملا امان اللہ بن نور اللہ بن حسین بنارسی ہیں معقول و منقول کے امام اور علم اصول فقہ میں شہرت تام رکھتے تھے۔ بیضاوی، عضدی، تلویح، شرح مواقف، شرح حکمۃ العین، شرح عقائد دوانی، رشیدیہ پر حواشی لکھے۔ محکم الاصول کے نام سے اپنی ہی تصنیف علم اصول کی شرح بھی لکھی۔ مسئلہ حدوث دہری پر ملا محمود جونپوری نے میر باقر داماد استرآبادی پر معارضہ کیا۔ اس پر محاکمہ لکھا۔ ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم و مسلم جب لکھنؤ قاضی تھے۔

ملا بنارسی صدر بلدہ تھے۔ علمی مباحثہ بھی دونوں میں رہا۔ حضرت شیخ خوب اللہ الہ آبادی سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے۔ ۱۱۳۳ھ میں انتقال ہوا۔ بنارس میں مدفون ہیں۔

مولانا دانیال چوراسی ملا نظام الدین کے دادا استاد مولانا دانیال چوراسی تھے۔ ان کے استاد ملا عبد السلام دیوی تھے۔ موصوف نے تحصیل علم کی منزلیں مکان پر طے کرنے کے بعد لاہور پہنچ کر اپنے ہمنام ملا عبد السلام لاہوری کی خدمت میں زندگی گذاری۔ جتنا پڑھا تھا استاد سے اس کی تصدیق کی۔ شاہجہاں بادشاہ نے منصب افتاءِ عسکر عطا کیا۔ آخر میں لاہور پہنچ کر سلسلۂ فیض جاری کیا۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔

مولانا عبد السلام لاہوری ملا عبد السلام لاہوری معدن عقلیات و نقلیات تھے فنون ادب، فقہ، اور اصول میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ بھی لکھا۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۳۷ھ میں انتقال ہوا۔

فتح اللہ شیرازی موصوف امیر فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ شاگرد خواجہ جمال الدین محمود و مولانا کمال الدین شروانی و مولانا کرد و میر غیاث الدین منصور شیرازی کے نامور شاگرد تھے (امیر موصوف کا ذکر پہلے گذر چکا ہے ۱۲، شاہد شروانی۔

تک اور ان سے سید شریف ابوالحسن علی علامہ جرجانی المولود ۷۴۰ھ مطابق ۱۳۳۹ء المتوفی ۸۱۶ھ مطابق ۱۴۱۳ء تک پہنچتا ہے۔ علامہ جرجانی سے شیخ الرئیس بو علی بن سینا المتوفی ۴۲۷ھ مطابق ۱۰۳۷ء تک۔ ان سے معلم ثانی ابونصر فارابی المتوفی ۳۴۲ھ مطابق ۹۵۳ء تک، معلم ثانی سے ارسطاطالیس یونانی (استاد سکندر ذوالقرنین) تک اور ارسطو سے حکیم ثانی فیثاغورس یونانی شاگرد اصحاب حضرت سلیمان علیہ السلام تک اور ان سے حضرت ادریس علیہ السلام صاحب معجزات منطقیہ تک پہنچتا ہے۔ ان

میں سے ہر ایک اپنے وقت کا امام اور یگانۂ روزگار تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ارسطو خاتم حکمائے مجتہدین یونان تھا اسی طرح علامہ فضل حق خاتم حکمائے مجتہدین ہندوستان تھے اور جس طرح ارسطو کے بعد سارے حکمائے یونان اسی کے خوشہ چین بنے اسی طرح فضل حق کے بعد بس مقلدین کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور اب تو اس دورِ کساد بازاری علوم قدیمہ اور ناقدریٔ شاہان و امراء میں مجتہد درکنار کسی کامل مقلد کا پیدا ہونا بھی دشوار ہے۔

تصانیف:۔

علامہ نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا۔ خاص اور اہم مجبوریوں کے سوا کبھی اس سے تساہل نہ برتا۔ علامہ کی تصانیف درجنوں ہیں جن میں مشہور حسب ذیل ہیں:۔

① الجنس الغالی شرح جواہر العالی
② حاشیہ افق المبین [1]
③ حاشیہ تلخیص الشفا۔
④ حاشیہ شرح سلّم قاضی مبارک
⑤ الہدیۃ السعیدیہ۔
⑥ رسالہ تشکیک ماہیات۔
⑦ رسالہ کلی طبعی۔
⑧ رسالہ علم و معلوم
⑨ الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود
⑩ رسالہ قاطیغوریاس
⑪ رسالہ تحقیق حقیقۃ الاجسام۔
⑫ رسالہ الثورۃ الہندیہ۔
⑬ قصائد فتنۃ الہند۔
⑭ مجموعۃ القصائد۔
⑮ امتناع النظیر۔
⑯ تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ
⑰ شرح تہذیب الکلام۔

چار پانچ مصنفات کے سوا سب غیر مطبوعہ ہیں۔ ہدیہ سعیدیہ۔ اور حاشیہ شرح سلّم از قاضی مبارک [2] کی جو شان ہے اس سے طلبہ و علماء بخوبی واقف ہیں۔

---

[1] یہ حاشیہ علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ۱۶۰/۵ نمبر پر سبحان اللہ اورینٹل لائبریری محفوظ، لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے ۱۲ شاہد شروانی۔

[2] قاضی مبارک بن قاضی دائم ادہمی گوپاموی، سلطان ابراہیم بن ادہم کی اولاد سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا دائم ادہمی اور قاضی شہاب الدین گوپاموی سے پائی۔ مولوی حکیم عبدالحی رائے بریلوی نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں: وتلقی العلم فی عصرہ عن القاضی شہاب الدین الگوفاموی خیرآباد جا کر حاجی محمد صفت اللہ محدث سے سند حدیث حاصل کی اکبرآباد پہنچ کر میر زاہد بن سید اسلم ہروی سے معقولات

ہدیہ سعیدیہ آج تک مدارس ہند و بیرون ہند میں داخل نصاب ہے۔ ہندوستان میں متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مصر میں بھی چھپ چکی ہے۔ خلف الرشید مولانا عبد الحق کو ریذیڈنسی آتے جاتے وقت ہاتھی یا پالکی میں جو سبق دیے جاتے تھے۔ ہدیہ سعیدیہ انھیں کا مجموعہ ہے۔ علامہ روزانہ ایک سبق تحریر فرما لیتے تھے وہی راستہ میں صاحبزادے کو پڑھا دیتے تھے۔ فلکیات تک یہی سلسلہ رہا۔ جب معتد بہ حصہ ہو گیا تو تلامذہ نے کتابی شکل دینے پر اصرار کیا۔ علامہ نے طلبہ کی آرزوؤں کو پامال نہ کرتے ہوئے تصنیفی حیثیت سے قلم اٹھایا۔ اہل علم مایعم الاجسام اور عنصریات کے اس فرق کو بخوبی محسوس کر سکتے ہیں فلکیات تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبتدیوں کے لئے کتاب لکھی گئی ہے۔ لیکن عنصریات میں شہباز قلم کی بلند پروازی کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔ اس کتاب میں زمین کی حرکت پر کافی دلائل قائم کر کے موجودہ سائنس کی تحقیقات کو غلط ثابت کیا ہے۔

اس دور میں زمین کی گردش کا مسئلہ موجودہ تحقیق کی رو سے اتنا عام ہو گیا ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا اپنی نادانی کا اقرار کرنا ہے۔ اسکول کے ابتدائی طالبعلم سے لے کر یونیورسٹی کے گریجویٹ اور یورپ کے بڑے سے بڑے سائنسداں تک سب اسی رنگ میں رنگے نظر آئیں گے۔

اہل مغرب جو کچھ کہتے ہیں۔ ہندوستان اس کی کورانہ تقلید میں مبتلا ہے۔ علامہ فضل حق کے کانوں میں یہ صدا پہونچی۔ انگریزی اقتدار ملک میں اپنا قدم جما چکا تھا۔ انگلش علوم و فلسفہ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ موصوف کے لئے یہ کوئی نئی آواز نہ تھی قدما فلسفہ میں ایک گروہ اس کا قائل ہو چکا تھا۔ جو اس دور میں ناقابل التفات سمجھا گیا تھا۔ صدیوں کے بعد پھر یورپ کی سرزمین سے یہ آواز بلند ہوئی۔ چونکہ

(بقیہ ص۱۸۱ کا) کی تکمیل کی۔ مولانا فضل امام خیر آبادی آمد نامہ میں لکھتے ہیں "قاضی مبارک ذہن رسا و طبیعت عالی داشت۔ و در امور عامہ دانی مشہور بود، اول کسے کہ حاشیہ بر میر زاہد نوشت و سلّم را شرح کرد" او بتتبع طرز میر باقر داماد است، و عبارت شرح سلم پیروی میر اختیار کردہ ۱۱۶۲ھ میں بعہد احمد شاہ بادشاہ دہلی میں انتقال ہوا۔ "حسن خاتمہ" ۱۱۶۲ھ مادہ تاریخ ہے۔ جنازہ گوپامئو لاکر جد امجد کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ قاضی محمد آمیر اور قاضی حکیم علی خاں دو صاحبزادے تھے۔ آخر الذکر اہل علم سے تھے۔ ۱۲ شاہد شروانی۔

علامہ کے نزدیک یہ مسلک غلط تھا۔ مرعوبیت کے تمام قید و بند توڑ کر ہدیہ سعیدیہ میں شرح و بسط کے ساتھ حرکتِ زمین کو باطل کیا ہے۔ اور مخالفین کے دلائل کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اس بحث کو علامہ نے حسب ذیل الفاظ میں شروع کیا ہے:۔

الثالث فھو مما ذھب الیہ قوم من قدماء الیونانیین، واختارہ من فی زماننا من اھل الفرنج فھم یزعمون ان الارض تتحرک بالاستدارۃ حول المرکز من المغرب الی المشرق وھی الحرکۃ الیومیۃ التی بسببھا تری الکواکب طالعۃ وغاربۃ فیظھر من جانب المشرق من الکواکب ما کان محجوبا عنا بحدبتھا الی ان قال وھذا الرای ایضا باطل بوجوہ۔» الخ

(ہدیہ سعیدیہ)

حاشیۂ شرح سلّم قاضی مبارک کی اہمیت اس کے معرکۃ الآراء مباحث کی فہرست سے کیجئے:۔

① تحقیق لفظ سبحان
② علم باری میں تمام مذاہب پر تنقید اور احقاقِ مذہب صوفیہ۔
③ جعل بسیط کا احقاق۔
④ تحقیق معنیٰ بحث و اتفاق۔
⑤ بحث مقدمۃ العلم و مقدمۃ الکتاب:
⑥ تحقیق مقسم تصور و تصدیق۔
⑦ بیان حصول الاشیاء بانفسہا، و باشباحہا۔
⑧ علم کے تیرہ مذاہب کا بیان۔
⑨ تحقیق متعلق تصدیق۔
⑩ بحث اجتماع مثلین۔
⑪ بارہ مذاہب معلوم کا بیان۔
⑫ بداہت و نظریت کے صفت علم و معلوم ہونے کی تحقیق۔
⑬ تحقیق موضوع علم
⑭ معقول ثانی کی لاجواب بحث۔
⑮ تحقیق ظرف اتصاف۔
⑯ تحقیق حیثیت موضوع۔
⑰ بیان امہات مطالب۔
⑱ تحقیق ہل۔
⑲ تحقیق قضیۂ زید معدوم۔
⑳ نسبت تامہ کے علاوہ قضیہ میں دوسری نسبت کا بیان۔

(۲۱) تعداد اجزاء قضیہ ۔
(۲۲) بیان مورد قسمت ۔
(۲۳) بحث مفصل بابت متعلق تصدیق ۔
(۲۴) بحث وجود ذہنی اور شبہات کے جوابات ۔
(۲۵) جاعل کی طرف احتیاج کی علت امکان ہے یا حدوث ۔
(۲۶) بحث کلی طبعی ۔

جزیرۂ انڈمان میں بعض اسیر فرنگ علماء نے دریافت کیا کہ ہندستان میں کیا یادگار چھوڑی ہے ؟ فرمایا دو یادگاریں چھوڑ آیا ہوں۔ ایک حاشیہ شرح سلم[1] قاضی مبارک اور دوسری یادگار برخوردار عبدالحق ۔

اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساری تصانیف میں حاشیۂ قاضی پر علامہ کو کتنا فخر تھا اور ساری اولاد میں مولانا عبدالحق پر کتنا ناز تھا۔ کامل باپ کے کامل بیٹے کا اندازہ بھی دیکھ لیجئے۔ علامہ کے حاشیۂ قاضی کے بعض مسائل کی تشریح کے لئے مولانا عبدالحق سے اصرار کیا گیا۔ مولانا نے ایک ضخیم حاشیہ از سر نو لکھ ڈالا (جو مدت ہوئی مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی نے چھپوایا تھا) لیکن علامہ کے حاشیہ پر قلم اٹھانا سوء ادبی میں داخل سمجھا۔ اسی طرح نواب صاحب رامپور کے شدید اصرار پر علامہ کے ناکمل حاشیہ افق المبین کی تکمیل سے گریز کرتے ہوئے فرمایا ۔

> "یہ ہو سکتا ہے کہ حاشیۂ قاضی کی طرح دوسرا حاشیۂ افق المبین بھی لکھ دوں۔ لیکن اس میں اضافہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگانا ہے۔"

ویسے تو مولانا عبدالحق کی قابلیت کا اندازہ اس سے لگائیے، مولوی حاجی ظہیر احمد فاروقی خیرآبادی کا بیان ہے کہ میں نے مولوی عبدالعزیز اور لالو ملازم مولانا عبدالحق سے سنا ہے کہ جب علامہ قاضی کا حاشیہ تصنیف فرما رہے تھے۔ تو ایک روز کسی ضرورت سے اٹھ کر کاغذات یوں ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ مولانا عبدالحق جن کی عمر اس وقت ۱۳ سال تھی۔ باپ کے کمرے میں داخل ہوئے اور عبارت کے آگے ایک صفحہ اپنے قلم سے تصنیف

---

[1] یہ حاشیہ اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ جب چھپا تھا تو دو روپیہ قیمت تھی۔ جنگ سے قبل پندرہ بیس روپیہ میں ملتا تو بھی غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ خود میں نے اطلاع ملنے پر ۵۵ھ میں دہلی سے بذریعہ تار پچیس روپیہ میں منگایا تھا۔ اور اب تو ملنا ہی دشوار ہے۔ ۱۲ شاہد شروانی۔

کر گئے۔ جب علامہ نے آکر دیکھا تو دریافت کیا کہ کیا ابن میاں کمرے میں آئے تھے؟ معلوم ہوا کہ آئے تھے وہ صفحہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اس صفحہ کو بجنسہٖ رہنے دیا۔ (یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس مقام کی عبارت ہے) اس حاشیۂ قاضی سے حضرت الاستاذ مولانا اجمیری مرحوم کو عشق تھا۔ سفر و حضر ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا حکیم احمد علی خیر آبادی فرماتے ہیں کہ ایام طالب علمی میں قاضی مبارک کا جتنا سبق ہم پڑھتے تھے اس کے متعلق پورا حاشیہ دیکھ ڈالتے تھے۔ خواہ کتنا ہی وقت صرف کرنا پڑتا۔ بعض دن آٹھ آٹھ ورق دیکھنا پڑتے تھے۔

اس حاشیہ کی خوبی یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب سے فلسفۂ یونان کو اپنایا ہے۔ اس وقت سے لے کر علامہ کے عہد تک، متقدمین و متاخرین و معاصرین کے درمیان جو مسائل، مناظرہ و مکالمہ و مباحثہ کا اکھاڑا بنے رہے ہیں۔ ان پر مجتہدانہ انداز میں تبصرہ فرمایا گیا ہے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و تحقیق کا دریا موجیں مار رہا ہے بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ حاشیہ، علوم معقولات کا فتاویٰ ہے۔

مولانا عبد الحق فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد ماجد (علامہ) اور مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی بن ملا نظام الدین سہالوی صاحب درس نظامیہ کے درمیان "عام خاص من وجہٍ" کی نسبت ہے۔ معقولات میں تو مادۂ اجتماع ہے۔ فقہ اور ادب میں مادۂ افتراق پایا جاتا ہے۔ اول کے ماہر مولانا بحر العلوم اور ثانی کے والد ماجد تھے۔

علامہ کی تصانیف سے خاندانی طرق تعلیم اور طرز تدریس صاف نظر آتا ہے۔ عام طور سے اساتذہ کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ طالب علم سے عبارت پڑھوا کر تحت اللفظ ترجمہ کرا دیا۔ پھر کچھ مطلب توضیح کے لئے بتا دیا گیا۔ حضرت العلامہ مفتی محمد لطف اللہ پلکھنوی علی گڈھی کے متعلق مشہور رہے کہ ترجمہ ایسا کراتے تھے، کہ مطلب سبق ادا ہونے کے ساتھ ساتھ سارے اعتراضات و شبہات بھی دور ہو جایا کرتے تھے۔

مولانا عبدالحق ایک بار حیدرآباد میں مفتی صاحب کی ملاقات کو پہنچے تو سلسلۂ درس جاری تھا۔ مفتی صاحب کے اس کمال کو دیکھ کر بیحد تعریف کی۔ سلسلۂ خیرآباد میں عبارت پڑھوا کر خلاصۂ مطلب بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ترجمہ کرا کے لفظی مباحث کے بجائے تحقیق مسائل پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ نافع اور باعث تسکین خاطر طلبہ ہے۔ اسی طرز تعلیم اور شفقت کا یہ نتیجہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کا عاشق و فدا کار نظر آتا ہے۔ ایک جاں نثار مرید کو اپنے پیر سے اتنی ہی عقیدت ہو سکتی ہے۔ جتنی سلسلۂ خیرآباد کے تلامذہ کو اپنے اساتذہ سے ہوا کرتی ہے۔ علامہ کے شاگرد رشید مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوریؒ[1] (استاذ مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و مولانا امجد علی اعظمی) کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ استاد زادہ مولانا عبدالحق کا ملازم و خادم لالو جب کبھی جونپور پہنچ جاتا تھا۔ اور مولانا اس کی آواز سن پاتے تھے تو پیرانہ سالی اور ضعف بصارت کے باوجود تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ کھانا ساتھ کھلاتے اور سفر خرچ وغیرہ دے کر عزت و مسرت کے ساتھ رخصت فرماتے۔

مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی طبیب خاص ریاست ٹونک (استاذ حضرت الاستاذ مولانا معین الدین اجمیری) کو زمانۂ تعلیم و قیام خیرآباد میں اپنے استاد گرامی مولانا محمد عبدالحق کے خدام کو بسا اوقات پورے مہینے کے مصارف کی رقم نذر کر دینی پڑتی تھی۔ اور ٹونک سے دوسری بار روپیہ منگانا پڑتا تھا۔ مولانا حکیم دائم علی صاحب بہاری ریاست کے طبیب خاص تھے۔ اور سو روپیہ ماہانہ مصارف کے لئے بیٹے کو روانہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر رقمیں آتی رہتی تھیں۔

---

[1] مولانا ہدایت اللہ خاں بن رفیع اللہ خاں حنفی رامپوری افغانی النسل تھے آبائی وطن سوات تھا۔ رامپور میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی اور صرف و نحو مولانا حافظ غلام علی سے اور دیر تک معقولات مولانا جلال الدین سے پڑھی جب علامہ فضل حق خیرآبادی رامپور میں قیام پذیر ہوئے تو علامہ سے اکتساب فیض کیا صحاح ستہ کا دور مولانا سید عالم علی حسینی نگینوی سے کیا علامہ فضل حق خیرآبادی کے بڑے جاں نثار تھے مختلف مقامات پر استاد کے ساتھ رہے ایک زمانہ تک علامہ کے حلقہ بگوش رہے۔ جب علامہ گرفتار کر کے جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے تو بڑے دل گرفتہ رامپور واپس آ گئے اور مدرسہ عالیہ میں مدرس ہو گئے پھر ۱۸۷۰ء میں جونپور جا کر مدرسہ حنفیہ میں صدر مدرس ہو گئے وہیں آخر عمر تک فیضان علم

علامہ خیر آباد کے رؤساء میں سے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی شورش میں بغاوت کے الزام میں سزائے عبور دریائے شور کے ساتھ ضبطی جائداد بھی ہو چکی تھی۔ مولانا عبدالحق چونکہ رئیس بن رئیس بن رئیس تھے۔ اور ناز و نعم کی گود میں پرورش پائی تھی۔ ہاتھی اور پالکی پر بیٹھ کر تحصیل علم کی تھی۔ شاہزادگان دہلی کے ساتھ قلعۂ معلیٰ میں کھیلے کودے تھے۔ بے سرو سامانی کے باوجود شاہانہ ٹھاٹ اور امیرانہ شان باقی تھی۔ خدام اور حلقہ بگوشوں کا اجتماع رہتا تھا۔ خادم جس طالب علم سے ناراض ہو جاتے مولانا سے شکایت کر دیتے مولانا مغلوب الغضب بھی تھے فوراً حلقۂ درس سے نکال دیتے تھے اور شرکت درس کی اجازت، معافی تک نہ ہوتی تھی۔ عرب و عجم کے قدر دان اور شوقین طلبہ جو ایک سبق کی آرزو میں ہفتے اور مہینے گذار دیتے تھے، یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ اس نعمتِ عظمیٰ سے ایک دن بھی محروم رہیں۔ حسب استطاعت خادم متعلق کو خوش کرتے۔ وہ سفارش کر کے عفو تقصیر کراتا۔ مولانا برکات احمد چونکہ امارت میں دوسرے طلبہ سے ممتاز تھے۔ اس لئے ان کے لئے یہ مصیبت آئے دن آتی رہتی تھی۔

یہ ایک دو مثالیں یہ سمجھانے کے لئے پیش کی ہیں کہ اس خاندان کا طریقۂ تعلیم ہی ایسا تھا کہ شاگرد گرویدہ اور اسیر بے دام ہو جاتا تھا۔ قدر دانانِ علم ہزار ذلتوں کے باوجود بھی اس آستانۂ عالیہ سے روگردانی کفر تعلیمی سمجھتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دوسری جگہ یہ تسکین خاطر اور اطمینان قلب حاصل ہو بھی نہ سکتا تھا۔

بحث و مناظرہ:۔

ایرانی مجتہد سے علامہ کے صغر سنی میں مباحثہ کا حال مختصراً گذر چکا ہے۔ قدرت کی طرف سے ذہن رسا اور طبع وقاد لے کر دنیا میں آئے تھے جس نے تیرہ برس کی عمر میں تمام علوم درسیہ اور حفظ قرآن مجید سے فارغ ہو کر مسندِ درس کو رونق بخشنا شروع کر دیا ہو اس کی ذہانت اور مافوق العادة

(بقیہ ص۱۸۶ کا) جاری رہا۔ اور بڑی تعداد میں لوگ فیضیاب ہوئے۔ منطق و فلسفہ میں اپنے وقت کے امام تھے۔ ۱۳۱۶ھ میں ماہ رمضان المبارک میں دہلی میں رحلت کی۔ مولانا عبدالرشید مصنف رشیدیہ کی درگاہ میں دفن ہوئے "مغفور" تاریخ وفات ہے۔ یار محمد الفندیالوی، مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا عبدالاول جونپوری وغیرہم مشہور تلامذہ ہیں ان میں ہر ایک استاذ الاعصار کا درجہ رکھتا تھا۔

طباعی کا کیا ٹھکانہ ہو سکتا ہے۔ یہ عمر تو بچوں کے کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ غلامستانِ ہند میں اس عمر کے بچے گلی کوچوں میں شور مچاتے، گالیاں بکتے اور کیچڑ اچھالتے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً نونہالان قوم مسلم کی حالت ہر مقام پر دیدنی ہے۔ اس قسم کی تمام بیہودگیوں میں اختراع و ایجاد کے وہ جوہر دیکھنے میں روزانہ آتے رہتے ہیں۔ کہ توبہ ہی بھلی۔

ان نونہالان عزیز کو کیا معلوم کہ اسی غلام ملک میں دورِ اقبال و عروج میں نہیں عہد زوال و پستی میں ایسے بچے بھی پیدا ہو چکے ہیں جو تمام سامانِ عیش و عشرت اور جاہ و حشم کی موجودگی میں بھی اسلامی شان اور آبائی آن بان کو چار چاند لگاتے رہے۔ اور فلک علم و عمل پر شمس و قمر بن کر چمکا کئے۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یکے انائے راز آید بروں

علامہ کا دور، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا دور تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج قائم ہو چکا تھا۔ ہندوستان بیرونی طاقت کا غلام بن چکا تھا۔ بادشاہ دہلی کی حالت کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتی تھی۔

قوموں کے عروج و زوال کی یہ داستان بھی کتنی المناک ہے۔ کہ زمانۂ اوج و بلندی میں بے شمار خوبیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ اور دورِ زوال میں خوبیوں کا پیدا ہونا تو درکنار جو محاسن مذہبی و قومی و ملکی خصوصیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ یا تو فنا ہو جاتے یا ان کی شکل و صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ برائیاں بن کر چمٹ جاتی ہیں۔

دو جلیل القدر پیغمبروں کی امت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ قوم موسیٰ، اور قوم ابراہیم علیہما و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے اعمال و کردار عہد نکبت و ذلت میں کتنے بدل چکے تھے۔ ان دونوں برگزیدہ ہستیوں نے اپنی امتوں کے دماغوں میں خدا پرستی کی تعلیم راسخ کر دی تھی۔ بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا کر، آلام کا شکار ہو کر فرعون و نمرود جیسے دعویداران الوہیت اور جابر و ظالم بادشاہوں کا مقابلہ کر کے قوموں کے سامنے زندہ مثال اور نمونہ بنے تھے۔ جو چیز تکلیف و دشواری سے حاصل ہو قابل وقعت اور مستحق عزت ہوا کرتی ہے۔ جب عہد اقبال ختم ہو کر بنی اسرائ

قوم ابراہیم پر دور ادبار مسلط ہوا تو خدا پرستی کی جگہ گوسالہ پرستی اور بت پرستی نے لے لی۔ محاسن اخلاق کے بجائے بدکرداری اور سوء اعمالی نے قبضہ جمایا۔ خدائی خطاب انی فضّلتکم علی العالمین سلب کر کے ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ کا لقب دیدیا گیا۔ انسان کے لئے سب سے بڑی تباہی غلامی ہے۔ یہ غلامی کسی اسی جیسے انسان کی ہو یا شہوت رانی و ہوس پرستی کی۔ عالمگیر اورنگ زیب نور اللہ مرقدہ کے بعد شاہان مغلیہ بھی عیش و ہوس پرستی کے غلام بن چکے تھے۔

اس مجاہد و متقی بادشاہ کے پوتے جہاندار شاہ کا تخت سلطنت پر بیٹھ کر سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ اپنی آشنا رنڈی کے بھائی کو ——— دہلی کا کوتوال بنا کر شرفاء کے دلوں کو چھلنی کر ڈالا۔ پر پوتے محمد شاہ رنگیلے کی رنگ رلیوں سے سارا زمانہ واقف ہے۔ بسنہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں۔

"شامتِ اعمال ما این صورت نادر گرفت"

نادر شاہ درانی کا قتل عام بھی اس کا شاہد ہے۔

ان سب سے مجاہدانہ جذبہ اور جفاکشی کا حوصلہ جاتا رہا تھا عیش و عشرت کی گرم بازاری نے امور سلطنت سے غافل بنا دیا تھا۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو جانا قدرتی امر تھا ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیّروا ما بانفسہم کا فرمانِ صریح اپنا رنگ لایا۔ ایک غلامی برضا و رغبت اختیار کر لی تھی دوسری انسانی و غیر ملکی غلامی اس کے پاداش میں بجبر و اکراہ سر پر مسلط کر دی گئی۔ اس طرح صوبوں کی جمی جمائی سلطنت اور حاکمانہ عزت و سطوت کا ۱۷۵۷ء میں خاتمہ ہو گیا جب کہ انگریزوں نے پلاسی کا میدان عیاری یا بہادری سے جیت کر بنگالہ میں قدم جما لئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شاہزادہ عالی گوہر عرف شاہ عالم سے صوبۂ بہار و بنگال کی دیوانی بمعاوضہ اکیس لاکھ روپیہ سالانہ حاصل کر لی جس کی رو سے الہ آباد سے بنگال و آسام کے آخری کنارے تک انگریزی تسلط باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا۔ میر جعفر نے بھی اس سلسلے میں اپنا پارٹ خوب ادا کیا۔

سنہ ۱۸۰۳ء میں رہی سہی عزت و شان بھی ختم ہو گئی۔ جب کہ لارڈ لیک نے دہلی

حملہ کر کے شاہ عالم کو گرفتار کرنے کے بعد ایک شرمناک معاہدہ کیا جس کی رو سے شاہ دہلی کی حکومت شہر و قلعہ اور اطراف دہلی تا قطب صاحب میں محدود کر کے مسلمانوں کے حقوق (فارسی زبان، تقرر قاضیان وغیرہما) کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔ شاہ عالم کے قتل و جلاوطنی میں اشتعال کا اندیشہ تھا اس لئے معاہدہ ہی کو مناسب سمجھا گیا۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کے انتقال اور اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے موقع پر شہر و قلعہ پر ہی نمائشی حکومت باقی رکھی گئی۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے زماں شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ مگر ایران کی بغاوت کی وجہ سے لدھیانہ ہی سے کابل کو پلٹنا پڑا۔ جاتے جاتے رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر بناتا گیا۔ بعد میں اس نے مستقل حکومت کا اعلان کر کے ملتان، کشمیر اور سرحد کے تمام اضلاع پر قبضہ جمایا۔

اس طرح اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں چار طاقتیں نمایاں رہیں۔

مرہٹے۔ صوبہ بمبئی، گجرات، صوبجات متوسط، اور راجپوتانہ پر قابض تھے دہلی بنگال اور آسام پر حملہ بھی کرتے رہتے تھے۔

فرانسیسی طاقت ـــــ مدراس میں۔
نظام حیدر آباد ـــــ دکن میں۔
ٹیپو سلطان ـــــ میسور میں۔

۱۷۶۱ء میں جنگ پانی پت نے مرہٹوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے اور ۱۷۹۹ء میں میر صادق نے جنگ میسور کا پانسہ پلٹ کر شیر ہندوستان سلطان ٹیپو کو شہید کرا ڈالا تھا۔ اٹھارویں صدی کے خاتمہ تک صرف ایک طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوس "انا و لا غیری" بجنے لگا تھا۔ ۱۸۰۳ء و ۱۸۰۶ء میں یہ کمپنی بالکل ہی قسمت ہندوستان کی مالک بن گئی۔

یہ تھی آخری تاجداران مغلیہ کی عیش پرستی اور کفران نعمت کی شرمناک داستان جس کا خمیازہ نہ صرف مسلمان قوم بلکہ پورے ہندوستان کو ڈیڑھ صدی سے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

الغرض غلامی بری بلا ہے۔ اس سے قوموں کی خصوصیات ان کے خصائل، و عادات یا تو فنا ہو جاتے ہیں یا مسخ ہو جاتے ہیں، ہندوستان کے مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔

زوال پذیر اور مردہ اقوام میں عزم و جہاد کی جگہ، گوشہ نشینی و بزدلی لے لیتی ہے۔ خدا پرستی کے بجائے نفس پرستی گھر کر لیتی ہے۔ اوہام باطلہ اپنا قبضہ جما لیتے ہیں۔ خود اعتمادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

برائے نام بادشاہوں کی عیش پرستیوں نے قوم پر ادر جمود طاری کر دیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور علامہ فضل حق بن مولانا فضل امام خیرآبادی نے اسی پر آشوب دور میں آنکھیں کھولی تھیں۔

حال و ماحول دیکھ کر شاہ اسماعیل دہلوی نے وعظ و تبلیغ پھر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا، پہلے عربی میں پھر اردو میں تقویۃ الایمان لکھی۔ اس میں حدِّ اعتدال سے تجاوز کیا گیا۔ اس کا خود مصنف کو بھی احساس تھا۔ جب حج کو جانے کا ارادہ کیا، تو اپنے پیر و مرشد سید احمد بریلوی، مولانا عبدالحئی، مولانا شاہ محمد اسحٰق، مولانا محمد یعقوب حکیم مومن خاں مومن، مولوی فریدالدین مرادآبادی، مولانا عبداللہ خاں علوی (استاد امام بخش صہبائی شہید) کو جمع کر کے ایک مبسوط تقریر کی۔ آپ نے کہا:-

"میں جانتا ہوں کہ اس (تقویۃ الایمان) میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرک خفی ہیں شرک جلی لکھ دیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ شورش ضرور پھیلے گی۔"[1]

اس افراط و غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کے جذبۂ اصلاح اور وعظ و ارشاد کی قدر کرنے والے اور پرانے ساتھی بھی مولانا کی مخالفت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھیں میں سے علامہ فضل حق خیرآبادی بھی تھے۔ علامہ کی دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ یہ تو آسمان سے گر کر کھجور پر اٹکا ہوا۔ تفریط ہو گئی تو افراط پیدا ہو کر رہے گا۔ ایسے مواقع پر پہلو تہی اور خاموشی گناہ عظیم ہے۔

---

[1] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۳۵۲۔

علامہ ریزیڈنسی میں سررشتہ دار تھے۔ اپنے استاد بھائی مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور کی طرح حکام و رعایا میں مقبول خاص و عام اور ڈپٹی کمشنر کے برابر با اقتدار تھے۔ قلعہ معلّٰی میں بھی بادشاہ و شاہزادگان کی نظر میں باوقعت تھے۔ (جس کا مختصر حال اوپر گذر چکا ہے) علامہ نے پہلے تو یہی کوشش کی کہ دونوں طرف کے اس ہنگامہ اور مسلمانوں کی باہم جنگ و جدال کو قانونی طور پر روک دیا جائے تاکہ ایک طرف عوام بھی مطمئن ہو جائیں اور دوسری جانب شاہ صاحب کے لیے بھی بارِ خاطر نہ ہو۔ اس میں مستقل طور پر کامیابی نہ ہو سکی تو ایسے اختلافی مسائل کو علمی طریقہ پر باہمی طے کرنا مناسب سمجھا تاکہ عوام میں علمی مسائل کھلونا بن کر مزید گمراہی کا سبب نہ بنیں۔ چنانچہ میدان قرطاس پر اشہبانِ قلم نے دوڑنا شروع کیا۔ سمندہائے خامہ نے وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ مخالف و موافق سبھی دادِ روانی دیے بغیر نہ رہ سکے علمی موشگافیاں فنّی باریکیاں، منصّہ شہود پر جلوہ گر ہونے لگیں۔ رفعِ یدین، آمین بالجہر وغیرہما پر خامہ فرسائی ہونے لگی۔ موافق و مخالف علما بھی میدان میں اتر آئے۔ بڑا مسئلہ امکان نظیر اور امتناع نظیر کا چھڑ گیا۔

اس مسئلہ میں شاہ اسماعیل صاحب کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے۔ علامہ ممتنع بالذات مانتے تھے (اس مسئلہ پر علامہ کی مستقل کتاب مناظرانہ انداز پر امتناع النظیر کے نام سے ۱۹۰۵ء میں موصوف کے تلمیذ التلمیذ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری مرحوم سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے) علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصلی مسودہ کتاب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر کے ممتنع بالذات ہونے پر جو دلائل و براہین قائم کئے ہیں۔ انھیں دیکھ کر بے ساختہ مرحبا و احسنت زبان پر آتا ہے۔ علمی و فنی حیثیت سے وہ وہ گلکاریاں کی ہیں کہ صفحاتِ کتاب تختۂ چمنستان بن گئے ہیں۔ اسی ایک کتاب پر کیا موقوف ہے۔ تمام مصنفات کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے: ؎

ولیس علی اللہ بمستنکر ÷ اَنْ یجمع العالم فی واحد

یہ تو پہلے گذر ہی چکا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے علامہ کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ علامہ کا رجحانِ طبع دیکھ کر اسی موضوع پر ایک مثنوی لکھ ڈالی جو کلیاتِ غالب میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے۔ غالب کے انداز بیان کا یہ کچھ کم کمال نہیں کہ ایسے مشکل مسئلہ کو ایسی روانی اور خوبی سے سمجھا دیا۔ علامہ اور دوسرے اہل فضل وکمال کی صحبت نے غالب کو فی الواقع غالب بنا دیا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است　　قدرت حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے،　　ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود،　　رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرت ابداعِ عالم خوب تر　　یا بیک عالم دو خاتم خوب تر
در یکے عالم دو تا خاتم مجوئے　　صد ہزاراں عالم و خاتم بگوئے
غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمی　　خردہ ہم بر خویش می گیرم ہمی
اے کہ ختم المرسلینش خواندہٗ　　دانم از روئے یقینش، خواندہٗ
ایں الف لامے کہ استغراق راست　　حکم ناطق معنیٔ اطلاق راست
نشأ ایجاد ہر عالم یکے است　　گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
منفرد اندر کمال ذاتی است　　لاجرم مثلش "محال ذاتی" است
زیں عقیدت برنگردم والسّلام
نامہ را در می نوردم ، والسّلام

غالب نے ان اشعار میں ابتدائی پانچ شعروں میں اپنی قابلیت سے ایک حل نکالنے کی کوشش کی جس میں دونوں طرف کی بات رہ جاتی تھی۔ اور وہ یہ کہ خاتم النبیین، اللہ جل شانہ نے اس عالم کے لئے بنایا ہے۔ اس عالم میں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر پیدا ہونا محال اور ممتنع بالذات ہے۔ لیکن خدا دوسرا عالم بنا کر آدم سے عیسیٰ تک اس عالم کے لئے پیغمبر پیدا کر کے آخر میں محمد رسول اللہ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسّلام کو خاتم النبیین بنا سکتا ہے۔ اس طرح امکان نظیر کی صورت نکل سکتی ہے۔ آخری چھ اشعار میں اس خیال

کو رد کرتے ہوئے علامہ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا ہے۔ اور اسی رائے سے اپنی موافقت ظاہر کرتے ہوئے جس مدلل طریقہ پر اسے ثابت کیا ہے یہ غالب ہی کا حصہ ہے۔

سوانح نگاروں نے اپنی نادانی اور جانب داری کی بنا پر اس علمی بحث کو افسانہ بنا دیا۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

مرزا حیرت دہلوی، صاحب حیوۃ طیّبہ نے تو محو حیرت ہی بنا دیا۔ نہ صرف علامہ، بلکہ علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام کو بھی پڑھا لکھا ماننے میں تامل کیا ہے۔ جن کے تلامذہ میں علاوہ علامہ کے مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی وغیرہ جیسے گرامی قدر فضلائے عہد بھی موجود ہوں کہ جن کے ادنیٰ حلقہ بگوش و شاگرد، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی اور سر سید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جیسے اکابر و مشاہیر وقت نظر آتے ہوں۔ حیرت ہوتی ہے کہ انسان معاندانہ روش اختیار کرتے وقت نابینا کیوں ہو جاتا ہے۔

سر سید احمد خاں نے مولانا فضل امام کے متعلق جن تاثرات کا اظہار آثار الصنادید میں کیا ہے۔ وہ مولانا کے حالات میں پیچھے گذر چکا ہے۔ علامہ کے متعلق بھی چند سطریں ملاحظہ کرتے چلیے:۔

> "مستجمع کمالات صوری و معنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی، بنّا ربنا فضل و افضال، بہار آرائے چمنستان کمال، متکی ارائک اصابت رائے، مسند نشین دیوان افکار رسائے، صاحب خلق محمدی، مورد سعادت ازلی و ابدی، حاکم محاکم مناظرات، فرمانروائے کشور محاکمات، عکس آئینہ صافی ضمیری ثالث اثنین بدیعی و حریری، المعی وقت، ولوذعی اوان، فرزدقِ عہد و لبیدِ دوراں، مبطل باطل و محق حق، مولانا محمد فضل حق، یہ حضرت خلف الرشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام غفر لہ اللہ المنعام کے اور تحصیل علوم عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمت بابرکت میں کی ہے۔ زبان قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخر خاندان لکھا، اور فکر دقیق نے جب سرکار کو دریافت کیا فخر جہاں پایا۔

جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں۔ اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سر گروہ اہل کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے یک حرف سنا، دعوائے کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ باایں ہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علم سر فرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندیٔ مدارج ہے۔

سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایۂ خوش بیانی اور امرأ القیس کو ان کے افکار بلند سے دستگاہ عروج معانی، الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب اور معانی رنگین ان کے غیرت لعل ناب، سرو ان کی سطور عبارت کے آگے پابہ گل اور گل ان کی عبارت رنگین کے سامنے خجل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں:۔

در علوم منطق و حکمت و فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر فائق الاقران و استحضارے فوق البیان داشت [1]

منشی امیر احمد مینائی انتخاب یادگار میں تحریر فرماتے ہیں:۔

افضل الفضلاء، اکمل الکملاء، فضائل دستگاہ، فواضل پناہ جناب مولانا مولوی فضل حق صاحب فاروقی برد اللہ مضجعہ، فنون حکمیہ میں مرتبۂ اجتہاد، بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی، طلیق و ذلیق، انتہا کے صاحب تدقیق و تحقیق ۔ ۔ ۔ ۔ جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہاں آباد میں اگرچہ عدالتین کے سر رشتہ دار تھے مگر بڑے ذی اقتدار اور صاحب اختیار رہتے۔ جھجھر میں مشاہرۂ جلیلہ پر نوکر رہے — اور الور سہارنپور اور ٹونک سب جگہ معزز و موقر رہے۔ لکھنؤ میں صدرُ الصدور تھے اور اس دار الریاست رامپور میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر

---

[1] تذکرہ علمائے ہند۔

مرافعۂ عدالتین پر مامور تھے۔ جناب مستطاب نواب فردوس مکان کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے۔ اور بندگان حضور (نواب خلد آشیاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ پھر یہاں سے تشریف لے گئے۔[1]

مفتی انعام اللہ خاں بہادر شہابی گوپاموی سر رشتہ دار سر ایڈورڈ کوبرک ریزیڈنٹ دہلی متوفی ۱۲۷۱ھ لکھتے ہیں:۔

"برادرم مولوی فضل حق خیرآبادی از فحول علمائے زماں و یگانۂ دوراں است خصوصاً در علوم عقلیہ گوئے سبقت ربودہ و بوفور علم و دانش در اطراف عالم بغایت دریں وقت مشہور است[2]"

مولوی اکرام اللہ شہابی گوپاموی نے شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی سے پوچھا بھائی صاحب! دنیا میں حکیم کا اطلاق کن کن پر ہے۔ مولانا کہنے لگے بھیا! ساڑھے تین حکیم دنیا میں ہیں:۔

"ایک معلم اول ارسطو، دوسرے معلم ثانی فارابی، تیسرے والد ماجد مولانا فضل حق اور نصف بندہ[3]"

سنہ ۱۲۵۶ھ مطابق سنہ ۱۸۴۰ء میں نواب سید محمد سعید خاں بہادر، مسند نشین ریاست جب انتظامی امور سے فارغ ہوئے۔ اور سرپرستیٔ علم و ادب کی طرف قدم اٹھایا تو مولانا فضل حق خیرآبادی، ملک الشعراء ذکی مرادآبادی، حکیم احمد خاں فاخر رامپوری، وغیرہم کو تالیف و ترجمۂ کتب پر مامور فرمایا لیکن یہ پودا پروان نہ چڑھنے پایا تھا۔ کہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں نواب جنت آرامگاہ نے وفات پائی[4]"

مولانا عبدالحئی لکھنوی لکھتے ہیں:۔

"شیخ امام، عالم کبیر علامہ فضل حق بن فضل امام بن محمد ارشد العمری الحنفی الماتریدی الخیرآبادی کا مشہور اساتذہ میں شمار ہے۔ فنون حکمیہ اور علوم عربیہ میں اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ حدیث مولانا عبدالقادر بن ولی اللہ العمری سے پڑھی۔

---

[1] انتخاب یادگار صفحہ ۲۶۱ [2] خزینۃ الاولیاء [3] ذکر علماء مولوی اکرام اللہ شہابی (قلمی)

[4] دیباچۂ مکاتیب غالب صفحہ ۷ از بشیر حسین زیدی۔

حفظ قرآن ۴ ماہ میں کیا۔ اور تمام علوم مروجہ سے ۱۳ سال کی عمر میں فارغ ہوئے۔ مناظرہ وجدل، منطق و فلسفہ اور لغت و ادب میں سب پر فائق تھے۔ چار ہزار سے زیادہ اشعار کہے۔ زیادہ تر قصائد مدح نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم میں ہیں اور کچھ کفار کی سرزنش میں۔ دور، دور سے طلبہ حصول علم کے لئے ان کی خدمت میں آتے تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بڑا نام پیدا کیا۔" (نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۲۷۴-۵)

مولوی جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:۔

"مولوی فضل حق معقولی خیرآبادی، جو اس زمانے میں حاکم اعلیٰ شہر دہلی کے سررشتہ دار، اور علم منطق کے پتلے اور افلاطون و سقراط و بقراط کی غلطیوں کی تصحیح کرنے والے تھے۔" (حیات سید احمد شہید ص ۳)

مشہور استاذ الشعراء مولوی منشی امیر احمد مینائی رقم طراز ہیں:۔

"افضل الفضلاء، اکمل الکملاء، فضائل دستگاہ، فواضل پناہ، جناب مولٰنا محمد فضل حق صاحب فاروقی برد اللہ مضجعہ۔ وطن اصلی آپ کا خیرآباد۔ فنون حکمیہ میں مرتبہ اجتہاد، بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی طلیق و ذلیق، انتہائی صاحب تدقیق و تحقیق، اپنے والد ماجد مولانا فضل امام غفر اللہ المنعام کے شاگرد رشید تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ میں جناب کی خدمت سراپا برکت سے مستفید، تلامذہ مولوی صاحب کے حساب سے باہر ہیں۔ کتب مفصلہ ذیل آپ کی تصانیف سے مشہور ہیں:۔

شرح تہذیب الکلام، تحقیق حقیقۃ الاجسام، حاشیہ قاضی مبارک، حاشیہ افق المبین، حاشیہ تلخیص الشفاء، ہدیہ سعیدیہ فی حکمۃ الطبیعہ، روض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود، رسالہ بحث قاطیغوریاس، رسالہ تحقیق علم و معلوم، تاریخ احوال ایام غدر۔ اور ان تصنیفات کے علاوہ خطب اور قصائد عربی شمار میں سو سے زائد ہیں۔ اور ان سب میں گوناگوں مضامین و مقاصد ہیں جس شہر میں رونق افروز ہوئے۔ صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ الخ

(انتخاب یادگار ضیائی)

مولوی محمد الدین لکھتے ہیں :۔

"مولوی فضل حق بن مولوی فضل امام خیر آبادی عالم اجل اور فاضل بے بدل، حاوی فروع و اصول و جامع معقول و منقول تھے . . . . .

اساتذۂ وقت آپ کی شاگردی کو فخر جانتے تھے . . . . .

مولانا کو علم فلسفہ و ادب میں ید طولیٰ تھا . . . . .

قصائد غرّا آپ کے امرأ القیس اور لبید کے قصائد پر فوقیت رکھتے ہیں نظم و نثر میں آپ کو اس قدر مہارت تھی کہ بلا مبالغہ شاید سلف و خلف میں چند آدمی آپ کے ہم پلہ ہوئے ہوں گے . . . . .

دہلی میں آپ عہدۂ جلیلہ اور منصب عظیمہ پر مقرر تھے ! در سرکار انگلشیہ کی قید میں جزیرۂ انڈیمان میں جس کو کالا پانی کہتے ہیں جا کر ۱۲۷۸ھ میں فوت ہو گئے"[1]

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :۔

مرحوم (مولانا فضل امام) کے جانشین، صاحبزادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی تھے جن کے دم عیسوی نے معقولات میں روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے۔ دیار و اطراف سے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا۔ اور منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرۂ انڈیمان بھیجے گئے۔ اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی ــ مولانا فضل حق خیر آبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی اور بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے۔"[2]

مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :۔

"مولانا فضل حق اور مرزا خانی نے دیوان غالب سے مشکل اشعار خارج کر دیے اور دو ثلث کے قریب حصہ نکال دیا۔ اور ان کی رہنمائی سے غالب نے اس روش پر چلنا ترک کر دیا۔"[3]

"اگر مولوی فضل حق اور ان کے رفقا کی صحبت کا فقط اتنا ہی اثر ہوتا کہ

---

[1] روضۃ الادبار ص۱۳۸ [2] حیات شبلی ص۲۲ و ۲۳ [3] آب حیات ص۵۱۲ ۔

وہ (غالب) شاعری میں اپنی روش کو چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آجاتے تو یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ قابل قدر کام غالب کی اصلاح کا ہوا۔" ۱؎

"مولوی فضل حق غالب کے سب سے بڑے محسن اور محب تھے۔ انھوں نے نہ صرف مرزا کی، شعر و سخن میں رہنمائی کی جو ان کا اصل دائرۂ عمل تھا۔ بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی۔" ۲؎

"مرزا غالب مولانا خیرآبادی کے ارتحال پر شیخ لطیف احمد بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔
"کیا لکھوں اور کہوں، نور آنکھوں سے جاتا رہا۔ اور دل سے سرور، ہاتھ میں رعشہ طاری ہے۔ کان سماعت سے عاری ہے۔ ؎

عتاب عروساں در آمد بجوش۔
صراحی تہی گشت و ساقی خموش

فخر ایجاد و تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مرجائے غالب نیم مردہ، نیم جاں رہ جائے ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ٭ موت آتی ہے، پر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی ٭ اب کسی بات پر نہیں آتی ۳؎

ان مشتے نمونہ از خروارے، اکابر معاصرین کی شہادتوں کے بعد مرزا حیرت کی جرأت و جسارت پر حیرت ہوتی ہے۔ اور غور کیجئے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ جو واقعۂ کربلا اور حادثۂ شہادتِ امام حسین رضی اللہ عنہ سے انکاری ہو وہ فضل و کمال فضل حق کا منکر بن جائے، تو حیرت کیوں ہو۔ کیا شہرت خانۂ خدا میں پہنچ کر داد و دہش، خیرات و مبرات سے ہی حاصل ہوتی ہے۔؟ چاہ زمزم میں نجاست ڈالنے سے مشہور نہیں ہو سکتا؟

مرزا حیرت کی علمی قابلیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے سیرۃ النعمان صفحہ ۴۱ و ۵۰ پر امام اعظم ابو حنیفہ کی فوقیت دوسرے ائمۂ مجتہدین پر ثابت کرتے ہوئے کچھ اختلافی مسائل نقل کئے ہیں۔ جن سے امام اعظم کی ذہنی رسائی اور ارتقاء دماغی کا اچھی طرح حال

۱؎ ذکر غالب از مالک رام ص ۴۳ ۲؎ غالب نامہ شیخ محمد اکرام ص ۵۲ ۳؎ اردوئے معلیٰ علی گڑھ دسمبر ۱۹۰۲ء ص ۳۲

معلوم ہوتا ہے۔ انھیں میں سے مسائل نصاب سرقہ اور عدم قطعِ یدِ نبّاش بھی ہیں۔ مرزا جی نے حیوٰۃ طیبہ (سیرت مولانا اسماعیل) میں اس بحث کو چھیڑ کر ان دونوں مسئلوں پر بلا ضرورت خامہ فرسائی بھی ضروری سمجھی ہے۔ مولانا شبلی کے ساتھ امام اعظم کو بھی نہیں بخشا گیا ہے۔ پھر خیرآبادی بزرگان کرام پر طبع آزمائی کا شکوہ کیوں ہو؟

مردہ قوموں اور بدطینت گروہوں کا خاصہ یہ بھی رہا ہے کہ اسلاف پر نکتہ چینی اور بہتان تراشی شعار بنا یا گیا ہے۔ خلفاءِ راشدین میں کیسا خلوص واتحاد تھا۔ تاریخی واقعات اس کے شاہد اور سِیَر کی روایات اس پر گواہ ہیں۔ صحابۂ کرام میں باہمی اخلاص ومحبت ضرب المثل تھا۔ حضرت امیر معاویہ کا جنگ صفّین کے موقع پر بادشاہ روم کو جواب رہتی دنیا تک سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جنگ جمل میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے اونٹ اور ہودج کی حفاظت ونگہداشت کبھی نہ بھولنے والا واقعہ ہے ان حضرات کا اختلاف بھی ذاتی مخالفت سے بالاتر ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کا ادب و احترام پورا ملحوظ رکھتا تھا۔

اس کے باوجود بھی تیرہ سو سال سے روافض وخوارج باہم دست وگریباں ہیں وہ کونسا الزام ہے جو ایک گروہ دوسرے کے بزرگوں پر نہیں لگاتا۔ اور وہ کونسا بہتان وافترا ہے جو ان اصدقاءِ رسول پر نہیں تراشا جاتا۔ العیاذ باللہ!

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۴ ر جون ۱۹۳۶ء کی صبح کو بوقت ملاقات، اپنے استاذ مکرم نظیر الحسن امیٹھوی (تلمیذ مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی) کی نسبت سے یہ روایت بیان کی کہ علامؒ نے وحدۃ الوجود پر جب رسالہ لکھا تو اہل علم وصاحبِ عرفان حضرات شدِّ رحال کر کے علامہ کی زبان سے اس کو سننے کے لئے حاضر خدمت ہوتے تھے۔ اور اس معرکۃ الآراء مسئلہ کے حقائق ودقائق سن کر ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس رسالہ کے آخر میں جو وصیت فرمائی ہے اس سے خشیتِ الٰہی اور قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"ان خیر ما یتواصی بہ ان یتقی اللہ فی العلانیۃ والسرّ، وان کنت فی ھٰذہ التوصیۃ ممن نسی نفسہ وامر غیرہ بالبرّ فیا لھفی علی امرا تلفتہ وزمن فی الھویٰ اسلفتہ وسو عمل

اظفته وقد ربالخلاعة وضعته وقد رمن البضاعة اضعته وريعان فى الزهو وتبفته وعيش لباب فى اللهو امضيته عفا الله عنى وعنك واذهب عنا بواسعة رحمته الضيق والضنك ووفقنا لصالح الاعمال وجميل الفعال توفيقا وجعلنا مع الذين انعم عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا.

اس کا لفظ لفظ اعتراف قصور اور خشیت رب غفور پر دلالت کر رہا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"بہترین وصیت یہی ہو سکتی ہے کہ خدا سے ظاہر و باطن دونوں حالتوں میں ڈرتا رہے اگرچہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ کو بھول کر دوسروں کو نیکی کی، ہدایت کرتا ہے۔

کس قدر افسوس ہے کہ میں اپنی عمر، خواہشات میں برباد اور اپنی زندگی بداعمالی میں تباہ کرتا رہا۔ اپنی عزت و توقیر، واہیات باتوں کی وجہ سے گراتا اور اپنی پونجی کی بڑی مقدار مٹاتا رہا۔ حیات کے خوشگوار دن اترانے میں اور بہترین ایام لہو و لعب میں گذارتا رہا۔ خدا مجھے اور تمہیں معاف کرے اور اپنی رحمت کاملہ سے ان لغزشوں سے درگذرے۔ ہم سب کو اعمال نیک کی توفیق دے اور اپنے مقبول بندوں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا رفیق بنائے۔ یہی بہتر رفیق ہیں۔"

علامہ کے ردّ و مناظرہ کی مہارت کا اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ جب لکھنؤ میں صدر الصدوری کے فرائض انجام دے رہے تھے تو منشی نولکشور نے بکمال ادب عرض کیا کہ اوقات فرصت میں عربی کتب کی کاپی ملاحظہ فرما کر مطبع کی عزت دوبالا فرمائیں تو عین بندہ نوازی ہوگی۔ از راہ اخلاق منظور کرنا پڑا۔ مجتہد العصر کی ایک کتاب مناظرہ مطبع میں طبع ہونے آئی۔ اس کی کاپیاں ملاحظہ کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ آپ تصحیح عبارت کے ساتھ ہی ساتھ حاشیہ پر اعتراضات کے جوابات بھی لکھتے جلتے تھے۔ جب کتاب چھپ کر ان مجتہد صاحب کے پاس پہنچی تو اسے دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ کہ تمام عمر کی محنت برباد

گئی۔ دریافت پر منشی نولکشور نے اصل حقیقت ظاہر کر دی۔ آخرش کتابوں کے انبار میں آگ لگوا دی گئی۔ [۱]

بیعت

علامہ عقیدۃً سنی حنفی ماتریدی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا شاہ اسماعیل سے "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" "امکان نظیر و امتناع نظیر" پر مناظرہ چھڑ گیا تھا جو عرصہ تک جاری رہا۔ دونوں طرف سے تحریروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ [۲] کتب خانہ مولوی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی میں موجود ہے اس میں شفاعت و امتناع نظیر پر بحث ہے۔ یہ پہلی تحریر ہے اور رسالہ امتناع النظیر جواب الجواب ہے۔ سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں حضرت مولانا شاہ دھومن دہلوی سے بیعت ہوئے مرید شاہ دھومن دہلوی بود [۳]

مولوی فیض الحسن کہتے تھے کہ میرے استاد مولوی فضل حق رامپوری کا بیان ہے کہ علامہ فرماتے تھے کہ میں حضرت مجدد صاحب کے سلسلے کا زیادہ معتقد نہ تھا لیکن جب سے میں نے شاہ عبدالقادر صاحب کو دیکھا اس سلسلہ کا بہت معتقد ہو گیا۔ کیونکہ اگر وہ سلسلہ فی الواقع ناقص ہوتا تو ایسے لوگ اس سلسلے میں داخل نہ ہوتے [۴]

علامہ باایں ہمہ علم و فضل و ریاست و امارت، شریعت و طریقت پر کس درجہ عمل پیرا تھے۔ مولانا عبداللہ بلگرامی کے الفاظ میں سنئے:۔

"ولا یشغلہ ما رزقہ اللہ من الافیال والجلاد، والصافنات
من الجیاد عن طاعۃ اللہ فیما امرہ ونہاہ فکان من رجال
لاتلہیہم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ وکان مواظبا علی ختم
القرآن من کل اسبوع من الایّام والصلوٰۃ النافلۃ فی جوف
اللیل والناس نیام، فمن کان مواظبا علی المتطوعات، فما ظنک بہ

---

[۱] تذکرہ فضلائے ہند۔ نیز اس کے راوی علامہ کے پرپوتے مولوی حکیم ظفر الحق خیرآبادی بھی ہیں۔ "غالب نام آورم" کے مولف نادم سیتاپوری کی تغلیط مسلک کے اختلاف کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ شاہد شروانی [۲] یہ ۱۹۷۹ء میں لاہور سے اردو ترجمہ کے ساتھ چھپ گئی ہے" شاہد شروانی [۳] تذکرہ علمائے ہند۔ [۴] امیر الروایات صفحہ ۳۸۔

فی المکتوبات، وکان رحمہ اللہ رؤفا بالطلاب، حریصا علی تدریس اولی الافہام والالباب، وکان دیدنہ الافہام بالفاظ سہلۃ الانفہام ولا یستفہم مہما یستفہم عن التفہیم، ویسوّی بین ولدہ وفلذۃ کبدہ وبین احد من الطلبۃ فی الارشاد والتعلیم۔" لہ

"اللہ کے دیے ہوئے ہاتھی، اونٹ اور عمدہ قسم کے گھوڑے اوامر ونواہی میں اطاعت خداوندی سے نہ روک سکتے تھے۔ آپ ان میں سے تھے کہ تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر میں حارج نہ ہو سکتی تھی۔ ہر ہفتہ ختم قرآن پاک فرماتے۔ تہجد کی نماز کی پابندی فرماتے جو نوافل پر اس درجہ مواظبت کرتا ہو۔ اس کے فرائض کا حال خود سمجھ میں آسکتا ہے۔ طلبہ پر شفیق، اور ذہین تلامذہ کے، پڑھانے پر حریص تھے۔ آسان اور سہل الفاظ میں سمجھاتے، کسی کے سمجھانے سے بات نہ سمجھتے بلکہ خود تہ تک پہنچتے۔ تعلیم وتدریس میں اپنے جگر گوشہ اور عام طالب علم میں ذرہ برابر فرق نہ کرتے۔"

اخلاق وعادات

علامہ بڑے فیاض اور رحمدل واقع ہوئے تھے۔ دوسروں کی تکلیف دیکھ نہ سکتے تھے۔ داد ودہش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔ دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ ایک بار حکیم مومن خاں مومن شطرنج کھیلنے سے کسی بات پر ناخوش ہو کر اٹھ کر چلے گئے۔ تو دوسرے وقت ان کے یہاں جا کر انھیں منا لائے۔ مومن اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

سو جان سے بلائیں تو جائیں نہ ہم کبھی
مومن نہیں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

شاہ غوث علی صاحب شاگرد مولانا فضل امام خیرآبادی ایک مرتبہ دوران قیام

لہ مقدمہ ہدیہ سعیدیہ۔

رامپور میں نظر پڑ گئے۔ سرائے میں قیام تھا۔ علامہ نے بے انتہا اصرار سے اپنے پاس ٹھہرانے کی کوشش کی۔ لیکن شاہ صاحب جو اکثر استغراق میں رہتے تھے۔ اور تخلیے کے خوگر تھے۔ آمادہ نہ ہوئے تو مالک سرائے سے کہلا بھیجا کہ شاہ صاحب کے تمام مصارف کا بل ہمارے پاس آئے اور جس قدر بھی خرچ ہو ان سے کچھ طلب نہ کیا جائے[1]۔

علامہ دوستوں کے فائدے کی نئی نئی صورتیں پیدا کیا کرتے۔ مخلص احباب میں مرزا اسد اللہ خاں غالب سب سے زیادہ فرد و تمند تھے۔ مولوی امتیاز علی خاں عرشی رامپور ناظم کتب خانہ ریاست، مکاتیب غالب میں غالب نوازی کا حال لکھتے ہیں:-

"حسنِ اتفاق سے مولانا فضل حق خیرآبادی رامپور میں فروکش تھے۔ انھوں نے حق دوستی ادا کیا اور وقتاً فوقتاً سرکار (نواب سید یوسف علی خاں والئی رامپور) کے روبرو مرزا صاحب کی اس قدر تعریف و توصیف کی کہ سرکار ان کے کلام کے مشتاق ہو گئے۔ جب حالات سازگار نظر آئے تو مولانا نے مرزا صاحب کو لکھا کہ سرکار کی خدمت مبارک میں "نامۂ بندگی" اور قصیدۂ مدحیہ ارسال کریں۔ مولانا کا نامۂ گرامی مرزا صاحب کو ۲۷ جنوری ۱۸۵۷ء کو موصول ہوا۔ ۲۸ جنوری کو انھوں نے بہ تعمیل ارشاد، نواب فردوس مکان کی خدمت میں پہلا عریضہ ارسال کیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۵ فروری کو اپنے کچھ اشعار بغرض اصلاح بھیجے۔ اور ان کے ساتھ تحریر فرمایا:-

"نمیقۂ انیقۂ بلاغت آگیں مشعر رسید بخط مولوی صاحب مخدوم محمد فضل حق صاحب، بادیگر مراتب محبت و اشفاق، بعبارت رنگین و دقیق، در عین انتظار سرمہ کش عیون، و وصول نشاط شمول گردیدہ، باطلاع خیریت سرمایۂ سرور نامحصور افزودہ از مزید شفقت و ائتلاف قلبی متصور شد۔

مشفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم اتفاق نشدہ بود۔ لیکن محض بجہت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدرالوصف دل خواست کہ طریق رسل و رسائل جاری شود۔ ......

---

[1] تذکرہ غوثیہ۔

اس فرمان نے میرزا صاحب میں نیا ولولہ پیدا کیا۔ اور انھوں نے ۱۱ فروری کو سرکار کی مدح میں قصیدۂ مدحیہ نظم کر کے بذریعہ ڈاک ارسال کیا۔ اس کی ایک نقل میرزا صاحب نے مولانا کی خدمت میں بھیجی تھی۔ جو انھیں الور میں موصول ہوئی۔ وہاں سے ۱۰ ماہ اپریل کو مولانا نے سرکار کو تحریر کیا:۔

> "بعز عرض میرساند، کہ خیر سگال، بافضال ایزد بیہمال، بصحت و اعتدال، بالور رسیدہ ملاطفۂ مرزا صاحب مشفق، نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں صاحب تخلص بغالب مع قصیدۂ میمیہ کہ در مدح حضور فیض معمور منظوم کردہ اند، از ڈاکخانہ یافت، مرزا صاحب موصوف در ثنا و ستائش موزونی طبع اقدس و توصیف غزلہائے کہ نزد شان شرف ارسال یافتہ بودند، و شکر و سپاس عطائے مبلغ پانصد روپیہ کہ بدو دفعہ بمرزا صاحب موصوف عنایت شدند، اسہاب در تحریر فرمودہ اند۔ حالانکہ طبع اقدس در علوم عقلیہ و فنون حکمیہ آنچناں دقیقہ رس، کہ عدیل آں در مملکت ہندوستان کہ حال علمائے آں تفصیلاً معلوم است، کمتر بلکہ معدوم است۔ نظم شعر و فہم آں و ابداع معانی تازہ و مضامین مبتکرہ، و سرد الفاظ فصیحہ و تراکیب بلیغہ، بحسب اوزان عروض نسبت بعلو طبع اقدس و بلندی افکار صائبہ از ادنیٰ مراتب است۔
>
> مرزا صاحب ازیں حال لاعلم اند۔ طبع عالی و فکر صائب در دقائق حکمیہ و معضلات فلسفیہ بجائے میرسد کہ رسیدن افہام علام اعلام تا آں مقام معلوم الانتفا است۔ دریں سخن ہیچ مبالغہ و اغراق نیست۔ حضور لامع النور بنفس نفیس امتحانات فرمودہ اند و تحریر امتحان ہم سہل است۔ و نظر ہمت والا در جود و سخا بذل آلاف الوف را اقل قلیل تواں پنداشت۔ مرزا صاحب حق سپاس گذاری ادا کردہ اند۔ نظم قصیدۂ مدحیہ در غایت بلاغت و انسجام است غالباً شرف اندوز ملاحظہ باشد۔"

مولانا کی اس تحریر نے مرزا صاحب کے سابقہ تعلقات از سر نو استوار کر دیئے اور ایک مخلص دوست کی کوشش سے میرزا صاحب کی یہ تجویز کہ "آیندہ ریاستوں میں

پھر یا استاد بن کر رسوخ حاصل کرنا چاہیئے۔ ریاست رامپور میں کامیاب ہو گئی۔"[1]

جس قصیدۂ میمیہ کا علامہ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے اس کا مطلع یہ ہے۔ اس قصیدہ میں اہم، اشعار ہیں:۔

ہمانا اگر گوہر جاں فرستم — بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

آگے چل کر علامہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

بتوقیعِ فضل حق آں عین معنی — کہ آباد بروے فراواں فرستم
گذشت اندر اندیشہ کز خامہ رشح — بداں قلزمِ فیض و احساں فرستم

دو ہفتہ تک ڈاک سے جواب نہ ملنے پر ۱۱ فروری کو ایک عریضہ اور ارسال کیا اسی روز شام کو نواب صاحب کا گرامی نامہ مع دو سو پچاس روپیہ برائے شیرینی بمطابق دستور شاگردی ملا۔ ۱۲ فروری کو دوسرا خط لکھتے ہیں:۔

"...... سہ شنبہ ۲۷ جنوری نامۂ مولانا و بالفضل اولٰنا (علامہ فضل حق) بمن رسید۔ چہار شنبہ ۲۸ جنوری عرضداشت رواں داشتم۔"[2]

علامہ کی تعریف و توصیف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا صاحب سے ریاست کے پشتینی تعلقات قائم ہو گئے۔ بشیر حسین زیدی چیف منسٹر ریاست رامپور دیباچہ مکاتیب غالب میں لکھتے ہیں:۔

"...... نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغاز ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی وساطت سے نواب فردوس مکان نے انھیں فن سخن میں اپنا مشیر خاص مقرر فرمایا تھا ابتداءً نواب فردوس مکان (نواب یوسف علی خاں) وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے۔ لیکن غدر کے بعد ان کی پنشن بند ہو گئی تو نواب صاحب نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ جاری فرمادی تھی جو ان کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کے خزانے سے ملتی رہی۔ اور مرزا صاحب کی وفات پر ان کے متبنّیٰ حسین علی خاں شاداں کے وظیفہ کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔"[3]

---

[1] دیباچہ مکاتیب غالب ص۶۴،۶۵ [2] مکاتیب غالب ص۷ [3] دیباچہ مکاتیب غالب ص۸۔

سیاست

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و جگر کی آزمائش ہے

یہ تو مختصراً گذر ہی چکا ہے کہ علامہ کا دور مسلمانوں کے لئے پرفتن دور تھا۔ سات سو سال سے ہندوستان جنت نشان پر مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت سے مستقلاً، حکمرانی کرتے آرہے تھے۔ تین سو سال سے سلاطین مغلیہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مسلمانوں کی آنکھوں دیکھتے یہ تقریباً ہزار سالہ پرشان و شکوہ سلطنت، کلی طور پہ نذرِ اغیار ہو رہی تھی۔ ۱۷۵۷ء جنگ پلاسی کے بعد سے اسے گھن لگ چکا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں جنگ میسور اور سلطان ٹیپو کی شہادت نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں فتح دہلی کے موقع پر لارڈ لیک کے معاہدہ سے اس کے خاتمہ کی نوبت آہی چکی تھی۔ رہی سہی شان و عزت ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی کی برائے نام تخت نشینی پر جاتی رہی۔ علماء و اولیاء اسلام اپنی روحانیت اور علم و عمل کے ذریعہ استحکامِ سلطنت اور رفع ضلالت و غوایت میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ اس وقت سر برآرائے سلطنت علم خاندان ولی اللہی تھا نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند بھی اس کا سکہ چل رہا تھا۔ جس فتوے پر اس خاندان کی مہر تصدیق ثبت نہ ہوتی تھی وہ زیادہ باوقعت نہ سمجھا جاتا تھا۔ ادھر نشۂ حکومت میں چور، انگریزوں کی قومِ مغرور، مسلمانوں کی تباہی و بے عزتی پر تلی ہوئی تھی۔ سلبِ اختیاراتِ بادشاہ، انہدامِ مساجد، اور تذلیل و تحقیر مسلماناں اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حضرت شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جو علامہ کے استاد بھی تھے انھیں حالات کی بنا پر درج ذیل فتویٰ لکھ چکے تھے۔

> "دریں شہر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست۔ و حکم رؤسا نصاریٰ بے دغدغہ جاری است۔ و مراد از اجرا احکام کفر این است کہ در مقدمہ ملک داری، و بند و بست رعایا و اخذ خراج و عشور اموال تجارت، و سیاست قطاع الطریق و سراق، و فصل خصومات، و سزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند گو کہ اگر بعض احکام اسلام را مثل جمعہ و عیدین و اذان و ذبح بقر تعرض نہ کنند۔ نکردہ باشند لیکن اصل الاصول این چیزہا نزد ایشاں ہبا و ہدر است،

زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند، و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و در نواح آں نمی تواند آمد۔ برائے منفعت خود از واردین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثل شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد، و ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ جاری است[1]"۔

یہ تو گذر ہی چکا ہے کہ علامہ دہلی سے مستعفی اور بددل ہو کر جھجر، الور، ٹونک، سہارنپور اور رامپور میں باعزت عہدے سنبھالتے ہوئے ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں حضور تحصیل کے مہتمم و صدر الصدور ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے انحطاط و بے بسی پر آنسو بہانا پڑ رہے تھے۔ ساری ریاستوں میں والیانِ ریاست کے امراء پر پہنچنے سے بھی غرض، یہی تھی کہ ان مسلمان اور ہند و والیوں کی نبضوں کی حرارت کو ٹٹولیں۔ انھیں تاریک مستقبل اور بھیانک ظلمت کا صحیح اندازہ کرائیں۔

لکھنؤ پہنچنے پر کچھ دن کے بعد ہی ہنومان گڑھی (متصل اجودھیا فیض آباد) کا حادثہ فاجعہ پیش آ گیا۔ وہاں کے مہنتوں نے مسجد میں اذان دینا روک دیا۔ مسجد کے ایک حصہ کو نقصان بھی پہنچایا۔ کوئی بھولا بھٹکا مسافر مسجد میں جا نکلتا اور وقت ہونے پر اذان دیدیتا تو مار پیٹ کر نکال دیا جاتا۔ ہنومان گڑھی لکھنؤ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھی۔ نوابی میں اطلاعیں پہنچائی گئیں مگر صدائے بر نخاست[2]۔

۱۳، ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ مطابق جولائی ۱۸۵۵ء شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد پر آمادہ ہو کر ایک جمعیت کے ساتھ ہنومان گڑھی پہنچے۔ بیراگیوں سے مقابلہ ہوا۔ مسجد ہی میں سب کے سب ذبح کر دیئے گئے۔ قرآن شریف پرزہ پرزہ کر کے پاؤں سے مسلا گیا۔ جوتے پہن کر داخل مسجد ہو کر سنکھ بجائے گئے۔ ۲۶۹ مسلمان شہید ہوئے۔ کسی نے تاریخ لکھی:-

پئے سالش کمر چوں ہمت بست
ملہم غیب گفت "یافت شکست"
۱۲۷۱ھ

اس خونیں حادثہ اور ہتک ناموس اسلام کے بعد، مولانا شاہ امیر علی ساکن

---

[1] فتاویٰ عزیزیہ جلد ۱ صفحہ ۲، مجتبائی۔ [2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۱۲۔

امیٹھی سے نہ رہا گیا۔ تقریریں کر کے مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا۔ جب قوم میں ہیجان پیدا ہوا اور پانی سر سے اونچا نکل چکا تب واجد علی شاہ والئی لکھنؤ کو ہوش آیا۔ ۱۸۴۷ء میں عنان حکومت سنبھالی تھی۔ ۱۸۴۸ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل ہند کی تنبیہ پر حضور کونسل قائم کی گئی تھی جس کے صدر مہتمم علامہ فضل حق بنائے گئے تھے حکام کے مظالم اور رعایا کی ابتری کی ایسے ہی شکایت تھی اس عزم جہاد اور شاہ صاحب کے اعلان پر مسلمانوں کے جوش و خروش نے ہوش و حواس گم کر دئے شاہ صاحب کے سمجھانے کے لئے علماء و امراء کو بھیجا۔ علامہ نے بھی عہدے کی ذمہ داری اور بسہولت مطلب براری کی بنا پر گفتگو میں حصہ لیا۔ تحقیقات و بنا مسجد کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن شاہ صاحب نے ایفاء وعدہ بادشاہ پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ اور کئی ہزار کی جمعیت سے کر ہنتوں کی سرکوبی کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ردولی جاتے ہوئے راہ میں ۲۶ صفر ۱۲۷۲ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۵۵ء بروز چہار شنبہ نوابی فوج اور گوروں کی پلٹن نے گھیر کر نماز ظہر با جماعت ادا کرتے ہیں۔ توپ کے گولوں سے ۱۸۰، افراد کو شہید کر دیا۔ جو بچ رہے تھے ان کا تعاقب راجہ شیر بہادر سنگھ کے آدمیوں نے دس بارہ کوس تک کر کے بارلو صاحب کے حکم سے ۶۰۰ آدمیوں کا سر اڑا دیا۔ صرف ایک میر عباس کوتوال لشکر بہزار خرابی اپنے گھر بچ کر پہنچے۔ لڑائی سے چار گھنٹہ پیشتر شاہ صاحب یہ مصرع بار بار پڑھتے تھے:۔

سر میداں کفن بر دوش دارم

شہادت کے بعد حساب لگایا گیا تو یہی مادۂ تاریخ تھا۔ کسی نے تین مصرعے لگا کر قطعہ کر دیا:۔

بذکر حق سراپا گوش دارم   مئے حب علی در جوش دارم
شدہ تاریخ او قبل شہادت   سر میداں کفن بر دوش دارم[1]

رسولی کے ایک مجذوب نے "وانہ علیٰ ذالک لشہید" سے تاریخ نکالی مولوی امام بخش صہبائی شہید نے ۱۸۰، اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہیں:۔

چوں ز قتل سید مسکیں کہ خلدش باد جائے   شد لکد کوب مطاعن اعتبار لکھنؤ

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۲۵ تا ص ۱۲۸

ازپئے نفرین او ہاتف زروئے درد دل   گفتہ بادا فتنہ مقروں باد یارِ لکھنؤ
آنچہ درادنی شرار کلک صہبائی فگند   تاابد مثلش نیابی درد یارِ لکھنؤ[1]

کپتان بارلو اور مرزا شیخ حسین علی کیدان بٹالین گلابی، کی فوجوں نے مقابلہ کیا۔ فوج سلطانی کے ۱۲۵۰، آدمی مقتول و مجروح ہوئے۔ یہ مرزا حسین علی، شاہ صاحب کے سالے تھے۔ ایک صاحب نے تاریخ کہی:۔

گفت از روئے ہمت ازلی   قتل شد مولوی امیر علے
۱۲۷۲ھ

دوسری تاریخ یوں نکالی،

" سر بجا و تنش بجائے دگر "[2]
۱۲۷۲ھ

"اسلامی" حکومت میں خالص اسلامی مسئلہ پر مسلمانوں کی اس بیدردی سے خوں ریزی ! ع آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

آسمان تھرا اٹھا، زمین کو زلزلہ آگیا۔ خدا کا قہر لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کی شکل میں نمودار ہوا۔

دوشنبہ ۴، فروری ۱۸۵۶ء کو جنرل اوٹرم ریزیڈنٹ، کپتان ہیز، اور جنرل، ویلا کمان افسر فوج، گورنر جنرل کا عہد نامہ لے کر بادشاہ اودھ واجد علی شاہ اختر کے پاس آئے اور معزولی کا حکم سنا کر عہد نامہ پر دستخط کرنے کا حکم دیا۔ اس عہد نامہ میں سلطنتِ اودھ بخوشی سرکار کمپنی کے حوالہ کر دینے کا ذکر تھا۔ بادشاہ نے دستخط کرنے سے انکار کرتے ہوئے ہزار منت و سماجت کی، ایک پیش نہ گئی۔ لندن تک کوششیں کیں، سب بے سود ثابت ہوئیں۔ کلکتہ لے جا کر مٹیا برج میں نظر بند کر دیا گیا۔ "لکھنؤ شد خراب وا ویلا" ۱۲۷۲ھ تاریخ نکالی گئی۔ رائے پورن چند عاجز نے ۲۹ اشعار قطعہ تاریخ کے لکھے۔ آخری دو شعر یہ ہیں:۔

دل عاجز از شورش ناگہاں   زفرط الم بود غوغا کناں،
چو از دست شہ رفت تاج و کلاہ   بگفتم شدہ منتزع ملک شاہ
۱۲۷۲ھ

پانچ اشعار میں تاریخ عیسوی لکھی:۔

---

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۲۶۴
[2] ایضاً صفحہ ۲۳

رقم بنود عاجز: عیسوی سال سعادت رفتہ از نجم سعادت[1]
۱۸۵۶ء

حادثۂ شہادت سے تین ماہ کے اندر ہی "اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ" کا منظر سامنے آگیا۔ دیوانِ حافظ سے فال نکالی گئی تو یہ شعر نکلا۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

یہ بھی روایت ہے کہ جس دن واقعۂ شہادت ہوا ہے اسی دن پارلیمنٹ لندن میں شاہِ اودھ کی معزولی کے فرمان پر دستخط ہوئے تھے۔ سچ ہے خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اس طرح والیان اودھ کی مدت وزارت ۱۳۴ سال ۳ ماہ ۲۴ دن اور مدت بادشاہت ۳۱ سال رہی۔ اور اپنے پیچھے ہزاروں عیش پرستیوں کی داستانیں چھوڑ گئی۔

سید کمال الدین حیدر حسینی عرف میرزا کر نے قیصر التواریخ جلد دوم میں چشمدید راویوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کئی دن تک شہداء کے لاشے یونہیں پڑے رہے۔ لیکن نہ پرندوں نے ان کو چھوا نہ درندوں نے۔ بخلاف اس کے دوسرے مقتولین کے جسموں کو جانوروں نے کھا لیا تھا۔ گنّے کے کھیت کو وہاں کے زمین دار نے دو ماہ بعد کٹوایا تو ایک مجاہد تمام ہتھیار لگائے بندوق ہاتھ میں لئے بیٹھا نظر آیا۔ قریب جاکر دیکھا تو گولی سے جاں بحق ہو چکا تھا۔ اس کے دیکھنے کے لئے میلہ لگ گیا۔ بعد میں انھیں دفن کر دیا گیا۔ اس دو ماہ میں جسم ذرا بھی خراب نہ ہوا تھا۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لاتشعرون۔ ۝

سلطنت اودھ کی بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ نواب میر علی نقی وزیر اعظم سلطنت اور خسر بادشاہ کا تھا۔ میر جعفر اور میر صادق کی طرح انگریزوں سے ساز باز رکھ کر مسلمانوں کی حکومت کو تباہ کرنے کی مسلسل سازش جاری رکھی۔ یہ امین الدولہ کی معزولی کے بعد ۱۹ رجب ۱۲۶۳ھ مطابق ۹ جولائی ۱۸۴۷ء کو وزیر اعظم بنایا گیا تھا۔ اس کی اندرونی سازش ہی کی بنا پر واجد علی شاہ کو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ ریزیڈنٹ نے بلا کر اس سے کہا کہ بادشاہ سے عہد نامہ پر دستخط کرا دئیے، تو قصبہ مچھر ہٹہ نسلاً بعد نسل تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا۔

---

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۳۔

اس کے علاوہ انعام واکرام کے علٰحدہ مستحق ہو گے۔ ورنہ سرکاری مجرم قرار دیے جاؤ گے[1] وزیر" باتدبیر" نے لاکھوں جتن کیے لیکن بادشاہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اس طرح دونوں طرف سے منھ کالا ہوا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندستان کی اسلامی سلطنتوں کی تباہی انھیں "میروں" کی بدولت ہوئی ہے۔ جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد میر جعفر نے شاہ عالم کے ساتھ یہی ڈرامہ کھیلا تھا۔ اور اس طرح صوبہ بنگال ہاتھ سے نکلا۔ دکن میں میر صادق نے ۱۷۹۹ء میں شیر میسور سلطان ٹیپو کو دغا دیکر شہید کرایا۔ اور ہندستان کی غلامی کا دائمی پٹہ انگریزوں کو لکھ دیا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن،
ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن،

خدا جانے میر علی نقی کو حکیم مشرق اقبال مرحوم اس موقع پر کیوں بھول گئے۔ مسلمان مدت ہوئی سلطنت وحکومت سے محروم ہو چکے تھے۔ ان کا وجود "ناسعود" ہندستان میں ضرور باقی رہ گیا تھا۔ اس کا بھی خدا حافظ ہے۔ کیونکہ پھر بھی البتہ ریش ہے۔

علامہ نے حادثۂ بالاکوٹ اور واقعۂ ہنومان گڑھی، دیدۂ عبرت سے دیکھا۔ اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ظفر کی بے بسی اور واجد علی شاہ اختر والئی اودھ کی معزولی وبے کسی کی علت پر نظر، جمائی۔ دہلی اور لکھنؤ کے ان حالات سے ایک حق آگاہ وحساس انسان کو اثر پذیر ہونا ہی چاہئے تھا۔

دوسری طرف عمال حکومت ہندستانی تہذیب وکلچر اور ہندستانیوں کے مذہب کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تبلیغ عیسویت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ عیسائی مشنریاں، مدارس، ہسپتال، اور دوسرے پبلک اداروں سے مذہبی اشاعت اپنا فرض منصبی سمجھ رہی تھیں۔ ان کی دریدہ دہنی کا شکار مقامی مذاہب بن رہے تھے۔ مذہب اسلام پر خصوصیت سے نظر توجہ تھی پادری فنڈر اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی وغیرہم کے مناظروں سے ہل چل مچی ہوئی تھی۔ عوام کو خیال ہونے لگا تھا کہ حکومت تو گئی ہے اب مذہب پر بھی ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے۔ ہندستانیوں کی اصل متاع مذہب ہی ہے یہ تمام نقصان اور مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے لیکن مذہب پر آنچ نہیں آنے دیتا۔

---

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۲۵۴ ۔

سرسید احمد خاں، اسباب سرکشی ہندوستان میں لکھتے ہیں:۔

"۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے پادری صاحبان ای ایڈمنڈ نے تمام سرکاری ہندوستانی عہدیداروں کے نام گشتی چٹھی بھیجی تھی کہ:

"برٹش راج میں تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہئے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہوجاؤ۔"

علامہ کا بچپن، جوانی اور کہولت دہلی میں گزرے۔ آخر میں لکھنؤ پہنچے وہاں کی حالت دہلی سے بھی بدتر پائی۔ بادشاہ دہلی اور والی اودھ برائے نام حکمراں تھے آخرالذکر نے تو لٹیا ہی ڈبو دی تھی۔ مسجد ہنومان گڑھی شہید ہوئی۔ مسلمان مجاہدین کفار کے ہاتھوں خاک و خون میں لتھڑے۔ امیر علی شاہ توپ دم ہوئے۔ مجاہدین سرکاری فوج کے ہاتھوں کشتہ ہوئے۔ ناموسِ اسلام کی بے عزتی اور اسلامی شعائر کی بربادی پر بھی واجد علی شاہ کو عیش و عشرت کی پڑی تھی۔ علامہ صدر الصدور تھے۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر لکھنؤ چھوڑ کر ۱۹۵۶ء میں الور چلے گئے، مگر دل بے چین رہا کہ اتنے میں کچھ شورش اٹھتی نظر آئی۔ دربار دہلی سے راجاؤں کے نام خطوط بھی روانہ ہوئے۔ علامہ نے راجہ الور سے بھی گفتگوئیں کیں۔ وہ رام نہ ہوا۔ وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ راہ میں زمینداروں کو تلقین کرتے ہوئے چلے اس سے قبل مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ مدراسی سے سرگوشیاں ہوچکی تھیں۔ دلاور جنگ فیض آباد چلے گئے تھے۔ اور ہنگامہ ہوتے ہی لکھنؤ پر آکر قابض ہوگئے۔

شاہ اودھ کی معزولی، بادشاہِ دہلی کی نام نہاد خطابات سے منصوبہ محرومی اور مذہب عیسوی کی بجبر نشر و اشاعت نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔

کارتوسوں کی چربی سے دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ پڑا۔ اس نے بارود فلیتہ کا کام دیا۔ لکھنؤ میں ۱۲ر ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ر جولائی ۱۸۵۷ء بروز یکشنبہ مرزا رمضان علی عرف برجیس قدر بن واجد علی شاہ کو حضرت محل کی منظوری سے ممو خاں کی سرکردگی میں فوجی سالاروں نے باقاعدہ تخت نشین کر دیا[1]۔ احمد اللہ شاہ (مدراسی دلاور جنگ) پہلے قابض ہو کر شہر کا بندوبست کر چکے تھے۔ اب تلنگے جا بجا متعین ہوئے۔ شاہ

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صہ ۲۲۵۔ مصنفہ میر محمد زائر۔

جی سخت سست کچھ کر چپ ہو گئے۔ بیلی گارڈ پر انگریزوں سے چھ روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ ۱ر جولائی کی شام کو جمعہ کے دن پسپا ہو کر ہٹ آئے۔ [1]

علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔ میرٹھ، اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ زور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سؤر کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے تھے۔ روٹی کی ٹکیا کی تقسیم کسی خاص اسکیم کے ماتحت گاؤں گاؤں پہلے سے ہو ہی چکی تھی۔

میرٹھ سے دہلی پر "باغی" فوج نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا۔ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے۔ علامہ بھی شریک مشورہ رہے۔ منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:-

۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء:- بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبد الحق آداب بجا لائے۔

۶ر ستمبر ۱۸۵۷ء مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے۔ اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء بادشاہ دربار خاص میں رہے حکیم عبد الحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدر الدین خاں، اور دیگر تمام امراء و رؤسا شریک دربار رہے۔ [2]

اس روزنامچہ سے علامہ کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ موجودہ صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔ بادشاہ سراسیمہ تھے۔ شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخت شاہی کی تمناؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ عمائد شہر میں دو گروہ تھے۔ ایک بادشاہ کا ہمنوا اور دوسرا حکومت کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجوں میں طمع اور لالچ نے گھر کر لیا تھا۔ دو ایک جماعتیں مقصد اعلیٰ کو سامنے رکھے ہوئے تھیں۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد ۲ صہ ۲۳ [2] غدر کی صبح و شام، روزنامچہ منشی جیون لال صفحہ ۲۳۰، ۲۳۶، ۲۴۷،

ایک جماعت مجاہدین کی تھی۔ دوسری روہیلوں کی۔ یہ جنرل بخت خاں کی سرداری میں داد شجاعت دے رہی تھی۔ علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہونچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علمار کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی، مولوی عبدالقادر قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کر دیے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ۹۰ ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی[1]

جنرل بخت خاں کی اسکیموں میں مرزا مغل آڑے آتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے سرکار میں معافی کا خط بھی بھجوا دیا تھا۔ کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مرزا مغل کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی۔ جنرل بخت خاں سے لوگ بگڑ گئے۔ کمپنی کی فوج نے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی پر حملہ کر دیا۔ اور ۱۹ ستمبر کو مکمل طور پر انگریز قابض ہو گئے۔

بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو چکے تھے مع متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیے گئے۔ تین شاہزادوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے، بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ انھیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپ خانہ کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے، آمادہ نہ ہوئے۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد وغیرہم سب لکھنؤ چلے گئے۔

یہ سب لوگ لکھنؤ پہنچ کر احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ خوب خوب مقابلے رہے۔ بالآخر شکست کھا کر شاہجہاں پور روانہ ہو گئے۔ محمدی پور میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ نانا صاحب پیشوا، مولوی عظیم اللہ کانپوری، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم سب یہیں جمع ہو گئے۔ آخری جنگ انگریزوں سے شاہجہاں پور میں ہوئی۔ یہاں بھی شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ اور یہ سب لوگ نیپال چلے گئے۔

---

[1] تاریخ ذکاء اللہ۔

دلاور جنگ کو راجہ پوائیں بلدیو سنگھ نے دعوت کے بہانے سے بلا کر دھوکہ سے ۱۵ ار جون ۱۹۵۸ء مطابق ۲ ر ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ کو شہید کر دیا۔ دریا پار محلہ جہان آباد متصل احمد پورہ مسجد کے پہلو میں سپرد فن ہوا۔

علامہ دہلی سے ۲۴ ر ستمبر کو روانہ ہو گئے[1] اس طرح ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی، اور

---

[1] علامہ نے الثورۃ الہندیہ میں لکھا ہے کہ "انگریزوں کے قبضے کے بعد پانچ دن تک بھوکے پیاسے مکان کے اندر بند رہے۔ پانچویں روز اہل و عیال اور ضروری سامان لے کر شب میں چھپ کر نکلے، دریا عبور کئے، میدان قطع کئے۔" نواب صدر یار جنگ بہادر محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا بیان ہے کہ علامہ مع متعلقین بھیکن پور ضلع علی گڑھ آ کر ۸ ار روز رہے صاحبزادہ مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ ۸ ار دن کے بعد عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے ۸ میل دور، اور موصوف کے عزیزوں کی عملداری میں واقع تھا، اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروا دیا تھا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے مجھے وہ کمرہ بھی بتایا جس میں علامہ فروکش ہوئے تھے۔ گڑھی میں برج پر جانب مشرق واقع تھا۔ (۵۷ء کے بعد پوری گڑھی ویران ہو چکی ہے) نواب صدر یار جنگ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ علامہ کے ورود بھیکن پور کے ۹ سال بعد بچپن میں والد ماجد و عم محترم سے یہ واقعات سُنے اور فطرت خداداد کی بنا بالنص یاد رکھا۔ موصوف نے یہ بھی بیان کیا کہ والد ماجد (محمد تقی خاں) اور مولانا عبدالحق میں کافی تعلقات بھی ہو گئے۔ جو بعد میں خط و کتابت کی شکل میں جاری رہے۔ موصوف ہی کی یہ بھی روایت ہے کہ علامہ صاحبزادہ کو سبق بھی پڑھاتے رہے۔ بھیکن پور نواب صدر یار جنگ بہادر اور راقم السطور کا مولد و منشا طفولیت بھی ہے

نواب صدر یار جنگ بہادر ۲۸ ر شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء و ۱۲۷۴ف اپنے آبائی قلعہ بھیکن پور میں بوقت صبح پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی محمد تقی خاں ہے۔ آپ کے عم محترم، محمد عبدالشکور خاں عرف منجھلے خانصاحب، شروانی خاندان کے نامور فرد تھے۔ جود و سخا اور مسافر نوازی میں نزدیک و دور مشہور تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ بازخاں شروانی سارے خاندان میں آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضافات علی گڑھ و ایٹہ پر قابض تھے۔ جاٹ گردی کے زمانے میں ساری جائداد چھوڑ کر پورے خاندان کو گنگا پار جانا پڑا۔ ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ شروع عملداریٔ انگریزی میں اپنے بابئیں اور جو اسی کے علاقے پر مستقل قابض ہوئے۔ شروانی خاندان عرصہ دراز سے افغانستان سے آ کر ہندستان میں آباد ہے۔ جو لودھی کے زمانے میں [illegible] تا [illegible] میں سرخیل شروانی با اقتدار تھے۔

۱۷۹۹ء کی جنگ میسور کی طرح ۱۸۵۷ء کی یہ جنگ آزادی بھی ہندستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر ختم ہوئی۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

۱۹ ستمبر کے بعد ہندستانیوں پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یوں تو دہلی نے بہت سے ہنگامے دیکھے تھے۔ نادر شاہ درّانی کا ایام عید الاضحیٰ میں قربانی کے جانوروں کی جگہ انسانوں کا ذبح عام اور شہر کی نالیوں میں پانی کے بجائے خون کی روانی دیکھی تھی۔ "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کے مطابق شہر کا اجڑنا اور دوسری جگہ آباد ہونا، دارالسلطنت پر حملہ آوری، اور "اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً" کے بموجب شرفا کی ذلت و خواری بھی نظر سے گذری تھی[1]

(بقیہ صفحہ کا) سکندر لودھی کے وزیر ہوئے۔ تاریخ فرشتہ وغیرہ میں دوسرے شروانی عہدیداروں کا بھی تذکرہ ہے۔ اکبر کے عہد میں پیر محمد خاں شروانی جونپور کے صوبہ دار تھے علی گڑھ کا مشہور و معروف قلعہ جو اب مٹ کر محلہ بالائے قلعہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ محمد خاں شروانی نے ۱۵۲۵ء میں ابراہیم لودھی کے زمانے میں بنایا۔ اسی خاندان کے معزز فرد نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی ہیں۔ مولانا مفتی محمد لطف اللہ علی گڑھی، مولانا عبد الغنی خاں فرخ آبادی اور مولانا حسین عرب بھوپالی سے تکمیل درسیات کی۔ میٹرک تک انگریزی بھی پڑھی۔ ۱۸۸۳ء سے ہندستان کے مشہور علمی و ادبی رسالوں میں مضامین لکھنا شروع کئے۔ اپنے علمی ذوق کی بنا پر ایک بیش بہا کتبخانہ قائم کیا۔ ۱۹۰۵ء سے ریاست کا کام سنبھالا۔ ۱۹۱۸ء میں حیدر آباد میں صدر الصدور ہوئے وہیں ۱۹۲۳ء میں صدر یار جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڑھ جیسے اداروں کے رکن رکین و صدر نشین رہے (۱۱ اگست ۱۹۵۰ء مطابق ۲۶ شوال ۱۳۶۹ھ بروز جمعہ بعمر ۸۶ سال رحلت کی)

[1] دہلی اصل میں دہلو ہے۔ حضرت امیر خسرو نے ایک شعر میں جلال الدین فیروز شاہ کو شکارگاہ میں طلب کرتے ہوئے لکھا تھا ؎

یا کرا سپم بخش یا زاخور بفرما دستگیر
یا بفرماں دہ کہ گردوں شینم در دہلو روم

سب سے پہلے اس شہر کو راجہ جدہشٹر نے سنہ ۱۴۲۵ ق۔م آباد کیا۔ اور اندر پت کے نام سے شہرت دی

(بقیہ ف ۲۱۷ کا) اب اس کے آثار بھی مفقود ہو چکے ہیں۔ جہاں شہر تھا اب کاشت ہوتی ہے جسے ۳۲۰ ق م راجہ فتوج دہلو نام نے از سر نو شہر آباد کر کے اپنے نام سے مشہور کیا۔ سنہ ۵۷ھ میں راجہ انگپال تنور نے تعمیر قلعہ کرایا جو دہلی سے جانب جنوب "پرانا قلعہ" کے نام سے مشہور ہے۔ (ہمایوں بادشاہ نے سنہ ۹۴۲ھ میں اس کی مرمت کرا کے شہر دین پناہ نام رکھا! اور شیر شاہ نے اپنے زمانے میں اس کی ترمیم کر کے شیر گڑھ نام رکھ دیا) راجہ رائے پتھورا نے سنہ ۳۰ھ میں بارہ دروازہ کا قلعہ بنایا۔ ایک دروازہ کا نام "دروازہ غزنی" تھا قطب الدین ایبک نے سنہ ۶۰۲ھ میں اس قلعہ میں قصر سفید اور غیاث الدین بلبن نے سنہ ۶۵۶ھ میں لال محل بنوایا! اسی بادشاہ نے ایک قلعہ بنایا جس کا نام غیاث پور رکھا جہاں آجکل سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی آسودۂ خواب ہیں۔ سلطان معز الدین کیقباد نے سنہ ۶۸۶ھ میں کیلوکھری (جسے قصر معزی بھی کہتے تھے۔ اور اب جس جگہ مقبرہ ہمایوں ہے) کی بنیاد ڈالی۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے سنہ ۶۸۸ھ میں لال محل اور اس میں سبز مکان بنوایا جسے نیا شہر کہا جانے لگا۔ علاء الدین خلجی نے سنہ ۷۰۳ھ میں دہلی علائی، قلعۂ علائی، کوشک سیری اور قصر ہزار ستون بنوایا۔ غیاث الدین تغلق شاہ نے سنہ ۷۲۱ھ میں تغلق آباد آباد کیا۔ اور محمد عادل تغلق نے سنہ ۷۲۵ھ میں عادل آباد بنایا جسے محمد آباد اور عمارت ہزار ستون بھی کہا جاتا تھا۔ جہاں پناہ (درمیان دہلی علائی و دہلی کہنہ) اور بدیع منزل بھی تعمیر کرائی۔ فیروز شاہ نے سنہ ۷۵۵ھ میں کوٹلہ فیروز شاہ بنایا۔ شہر فیروز آباد متصل کوٹلہ اور کوشک شکار بھی بنائی۔ بادشاہ خضر خاں نے سنہ ۸۲۱ھ میں خضر آباد، قطب الدین مبارک شاہ نے مبارک آباد، اور اسلام شاہ نے اسلام گڑھ سنہ ۹۵۳ھ میں بنایا جس کو نور الدین جہانگیر نے اپنے زمانے میں اس کے سامنے ایک پل تعمیر کرا کے نور گڑھ کے نام سے موسوم کر دیا۔ شیر شاہ نے سنہ ۹۴۸ھ میں دہلی شیر شاہ تعمیر کرائی۔ آخر میں شاہجہاں بادشاہ نے سنہ ۱۰۴۹ھ میں شاہجہاں آباد آباد کیا۔ جو اب تک دہلی کے نام سے تمام دنیا میں مشہور اور اپنی حالت پر قائم ہے! اس کی سر بفلک لاجواب مسجد اور عالیشان و بے نظیر قلعہ مغلیہ دور سلطنت کی شان و شکوہ پورے آن بان سے ظاہر کر رہا ہے۔ دیوار شہر پناہ بھی ایک لاکھ پچاس ہزار صرف کر کے تعمیر کرائی جو بارش کے سبب اکثر جگہ سے گر گئی پھر سنہ ۱۰۶۹ھ میں چار لاکھ روپیہ میں اس کی عمارت جدید بنوائی جس کا طول چھ ہزار چھ سو چونسٹھ گز، عرض چار گز، اور بلندی ۹ گز اور ستائیس برج رکھے گئے۔ انگریزی عملداری میں اسکی مرمت کی گئی۔ اب سنہ ۱۹۱۳ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل ہند کے دور نیابت میں شاہجہاں آباد سے تین میل جانب جنوب نئی دہلی کی بنیاد رکھی گئی۔ جو رائے سینا کے نام سے سنہ ۱۹۳۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ وائسریگل لاج، کونسل چیمبر اور فوارہ وغیرہ قابل دید ہیں۔ اس طرح ساڑھے تین ہزار برس میں اس خطۂ دہلی نے ۱۳۲ ہندو راجہ اور ۷۶ مسلمان بادشاہوں کا

مگر ایسے مظالم!

"لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر" نہ آنکھوں نے دیکھے، نہ کانوں نے سنے۔ نہ انسان کے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی گذرا۔ الامانُ الحفیظ۔

سر کنم گریہ اگر تابِ شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقتِ دیدن داری

ان مظالم کو لکھتے ہوئے دل لرزتا ہے، سینۂ قلم شق اور جگر قرطاس پارہ پارہ ہوا جاتا ہے، انتقام کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر ہندستانی فوجیوں نے مذہبی جوش اور ملکی جذبے میں مجنوں بنکر اپنی جہالت وحماقت سے کچھ یورپین بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ تو یہ کوئی نئی چیز نہ تھی عوام جوش میں آکر ہمیشہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

ابھی ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی جانب سے ڈائرکٹ ایکشن (براہ راست اقدام) کا دن منانے پر کلکتہ میں کیا کچھ نہ ہوا مسلم وزارات کے ہوتے ہوئے ہزارہا ہندو مسلمان باہمی، جنگ وجدال کی نذر ہو گئے۔ سینکڑوں عورتیں اور بچے سڑکوں پر اعضا بریدہ پڑے ملے۔ وحشت و بربریت، درندگی و شیطنت کا وہ کونسا مظاہرہ تھا جو نہ کیا گیا۔ ایک ہفتہ تک غدر مچا رہا مقتولین ومجروحین کی تعداد چوتھائی لاکھ سے متجاوز ہو گئی۔ یہی "مہذب" ملکوں میں بھی ایسے ہنگامی مواقع پر ہوتا رہتا ہے۔ کلکتہ کے بعد نواکھالی (بنگال) گڑھ مکتیشر (یو۔پی) اور پٹنہ (بہار) میں جو کچھ ہوا۔ اس درندگی و بہیمیت کی مثال نہیں مل سکتی۔ اور ۴۷ء کا یہ خونی ڈرامہ تاریخ ہندوستان میں اپنی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدارِ تمدن وتہذیب قوم نے یہ شرمناک اور انسانیت سوز حرکات جوش میں نہیں، ہوش میں کیں۔ غلامی کی لعنت سے متاثر ہو کر نہیں، فاتح وقابض ہونے کے بعد کیں۔ جہالت وحماقت سے نہیں، بزعم خود دانشمندی و فرزانگی کے ماتحت کیں۔ غفلت و نادانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت آمیز اور جگر خراش برتاؤ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔

زندہ مسلمانوں کو سوئر کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا، سکھ

(بقیہ ۲ کا) دورِ سطوت وجبروت دیکھا۔ بار بار شہر و الیان شہر کی تباہی بربادی دیکھی اور پانچ سلاطین برطانیہ کا عہد حکومت بھی دیکھا۔ (ارمغان ہندوستان وآثار الصنادید)

رجمنٹ سے علی رؤس الاشہاد اعلام کرانا، فتحپوری مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکنا، مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا، عبادت کی جگہ دفاتر قائم کرنا اور حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کی لید ڈالنا، ناقابل معافی اور غیر ممکن التلافی جرم ہے۔

منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے تفصیل کے لئے دیکھئے۔
"انقلاب ۵۷ء کا دوسرا رخ" مرتبہ شیخ حسام الدین بی اے امرتسری سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسلمان قوم کو بھی فتح وظفر کے ایسے مواقع پیش آئے ہیں لیکن ان کا دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک رہا۔ اپنوں کا نہیں غیروں کا بیان سنئے۔ دوستوں کی نہیں دشمنوں کی تحریریں دیکھئے۔

کون نہیں جانتا کہ چودہ سو سال قبل ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو خدا کے آخری برگزیدہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دشمنوں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار فرمایا جنہوں نے ذلت ورسوائی اور مصائب وآلام پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ تالیاں بجائی تھیں پتھر مارے تھے۔ دھول اڑائی تھی، آوازے کسے تھے۔ بڑی سودائی، مجنوں اور دیوانہ خطابات دیئے تھے۔ راستے میں کانٹے بچھائے تھے، پشت پر اونٹ کا اوجھ لادا تھا۔ گردن میں چادر کا پھندا ڈال کر کھینچا تھا، قتل کے منصوبے باندھے تھے۔ اور سب سے آخر یہ کہ وطن سے نکال کر بے گھر اور بے در بنایا تھا۔ اس شاہ دوجہاں نے فتح کے بعد اعلان کیا جو ہتھیار رکھ دے اسے امان، جو معابد میں مشغول عبادت ہو وہ محفوظ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ مامون، جب دشمنوں کا سامنا ہوتا ہے دریافت فرماتے ہیں مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو۔

یک زبان ہو کر کہتے ہیں۔ شریف بھائی اور شریف بھتیجے سے جو توقع ہو سکتی ہے وہی ہم بھی رکھتے ہیں۔

جواب ملتا ہے۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کئی سو سال کے بعد اسی قسم کا واقعہ اس شاہ دوسرا کے ادنیٰ غلام سلطان صلاح الدین ایوبی کو بیت المقدس میں پیش آتا ہے۔ اس خطۂ پاک (فلسطین) پر خلیفہ دوم حضرت

امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خود بہ نفسِ نفیس صلح و آشتی کے ساتھ قبضہ فرمایا تھا۔ اس وقت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال تک پرچم اسلام لہراتا رہا۔ ۱۰۹۹ء عیسوی میں عیسائیوں نے اس پر تسلط قائم کر لیا مگر کس شان سے؟ ایک انگریز مورخ ہی کے قلم کے رشحات دیکھئے:۔

"جب گوڈفرے اور ٹنکرو، یروشلم کے کوچہ و بازار میں گذر رہے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جاں بہ لب زخمی لوٹتے تھے جبکہ بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو، ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے وہیں ان صلیبیوں نے اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا۔"[1]

۹۰ برس کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۱۸۷ء مطابق ۲۷ رجب ۵۸۲ھ کو سلطان نے فوج کشی کر کے اور شاہ رچرڈ وغیرہ سے لڑائیاں لڑ کر فلسطین پر علمِ اسلام لہرا دیا۔ مدتوں کی جنگ کے بعد اس عظیم الشان فتح پر اعلان عام کر دیا کہ دس اشرفی زرِ فدیہ دے کر ہر عیسائی اپنا ساز وسامان لے کر امن و امان کے ساتھ شہر چھوڑ سکتا ہے۔ چالیس دن کی مہلت بھی دی گئی۔

جو لوگ غریب تھے ان میں سے سات ہزار کو شاہ انگلستان کی رقم سے فدیہ ادا کر کے رہا کرایا گیا۔ کوکبری نے شہر الرہا کے ایک ہزار آرمینیوں کو فدیہ دے کر آزاد کرایا۔ برادر سلطان ملک العادل نے شاہ رچرڈ کی دوستی کی بنا پر سلطان سے ایک ہزار غلام مانگ کر اپنی طرف سے آزاد کر دیئے۔ بطریق اعظم اور بلیان سفیر نے بھی جرأت کر کے سلطان سے ملک العادل کے برابر غلام مانگے جو اجازت ملنے پر آزاد کر دیئے گئے۔ باقیماندہ عیسائیوں کو سلطان نے اپنی طرف سے آزاد کر دیا۔ امراء اور شہسواروں کی بہو بیٹیوں نے فریاد کی کہ ہمارے شوہر اور سرپرست یا تو مارے گئے یا قید و بند میں ہیں۔ ہماری دستگیری کی جائے۔ سلطان نے ان کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر قیدیوں کو رہا کیا اور جو مارے گئے تھے ان کے پسماندگان کو خزانے سے اس قدر روپیہ دلایا کہ سب مطمئن اور خوش خوش واپس گئیں۔[2]

---

[1] اردو ترجمہ سلطان صلاح الدین ایوبی ص ۲۰۲ مصنفہ انگریز مورخ سٹینلے لین پول

[2] ایضاً ص ۲۰۲ تا ص ۲۰۵

یہ تھا مسلمانوں کا انتقام! اور یہ تھی بدترین دشمنوں کے ساتھ رواداری!

”غیر متمدن“ دنیا کے ان تاریخی حقائق کے بعد دورِ تہذیب و تمدن کے علمبردار یورپ کے ان کرتوتوں پر کون انصاف پسند انسان شرم سے گردن نہ جھکا لے گا۔

علماء و امراء خواص و عوام کی تباہی و بربادی کی داستان بڑی طویل ہے قابلِ ذکر کچھ نام درج کئے جاتے ہیں:۔

غدر ۵۷ء کے بعد پھانسی پانیوالے یا گولیوں سے اڑائے جانے والے

۱۔ نواب عبد الرحمن خاں والیِ جھجر۔
(مع ضبطیِ جائداد)
۲۔ راجہ ناہر سنگھ رئیس بلب گڑھ
۳۔ نواب مظفر الدولہ۔
۴۔ نواب میر خاں پنشن دار و جاگیر دار طبل
۵۔ نواب اکبر خاں بن فیض اللہ خان بنگش
۶۔ احمد مرزا۔
۷۔ میر محمد حسین۔
۸۔ حکیم عبد الحی بن حکیم بخش۔
۹ قاضی فیض اللہ کشمیری سر رشتہ دار صدر الصدور۔
۱۰۔ میر پنجہ کش مشہور خوشنویس۔
۱۱۔ نواب محمد حسین خاں۔
۱۲۔ مشہور شاعر مولوی امام بخش صہبائی۔
۱۳۔ نواب احمد قلی خاں۔
(جیل میں موت واقع ہو گئی)
۱۴۔ نظام الدین خاں بن حکیم شرف الدین
۱۵۔ خلیفہ اسماعیل خلف استاد ذوق
۱۶۔ محمد علی خاں خلف نواب شبیر جنگ خاں۔
۱۷۔ عبد الصمد خاں بن علی محمد خاں رسالہ دار شاہی فوج۔
۱۸۔ دلدار علی خاں کپتان۔
۱۹۔ میاں حسن عسکری صوفی۔
۲۰۔ غلام محمد خاں عم نواب احمد علی خاں رئیس فرخ نگر۔

. . . .

دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے والے

۱۔ میاں غلام نظام الدین۔
۲۔ نواب غلام محی الدین خاں پنشن دار

۳۔ حکیم محمود خاں والد مسیح الملک حکیم اجمل خاں۔
۴۔ حکیم مرتضیٰ خاں۔
۵۔ نواب یعقوب علی خاں (گوجروں نے لوٹ کر قتل کر ڈالا)
۶۔ مرزا فاضل بیگ۔
۷۔ عبدالحلیم خاں نائب کوتوال۔ (مع ضبطی جائداد)
۸۔ منشی آغا جان محرر ایجنسی۔
۹۔ صفدر سلطان بخشی۔
۱۰۔ نواب سید حامد علی خاں رئیس کست
۱۱۔ مرزا معین الدین خاں۔ تھانیدار پہاڑ گنج۔
۱۲۔ محمد حسین خاں تھانیدار بدرپور۔
۱۳۔ لالہ رامجیداس گڑ والے۔
۱۴۔ ضیاء الدولہ خلف حکیم رکن الدولہ۔
۱۵۔ موسیٰ خاں بن حافظ عبدالرحمٰن، خاں مختار مرزا نیلی۔
۱۶۔ عبدالصمد خاں خسر نواب ججر۔
۱۷۔ حکیم امام الدین خاں بن حکیم غلام رضا خاں۔
۱۸۔ نواب حسن علیخاں برادر نواب ججر۔
۱۹۔ سعادت علی خاں خلف حسن علیخاں
۲۰۔ میر نواب نائب کپتان۔
۲۱۔ نواب عبدالرحمٰن خاں۔
۲۲۔ نواب علی محمد خاں عم والیٔ ججر۔
۲۳۔ راجہ اجیت سنگھ عم راجہ نریندر سنگھ رئیس پٹیالہ۔
۲۴۔ غلام فخر الدین خاں تحصیلدار کوٹ قاسم۔

ان کے علاوہ حیدر خاں اور اشرف خاں مجران نے ایک سو سات نوجوانوں کو الور سے گرفتار کرا کے دہلی بھیجا۔ آدھے گوڑگاؤں میں قتل کر دیئے گئے۔ باقی کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ اسی طرح کے بیسیوں حادثات ہیں کہاں تک بیان کئے جائیں۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور، مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب مصطفیٰ حسین خاں شیفتہ وغیرہم بھی دھر لئے گئے۔ ان اکابر کو بڑی دشواریوں کے بعد نجات مل سکی۔ پنشنوں اور جاگیروں پر زد پھر بھی باقی رہی۔

سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی وغیرہم کو بجرم بغاوت کالے پانی کی سزا ہوئی۔

علامہ فضل حق کو بھی "باغی" قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ، مطابق ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے۔ چنانچہ پیروکار مقدمہ منشی کرم احمد خیر آبادی نے لکھنؤ سے سید اعظم علی کے نام خیر آباد یہ خط لکھا۔

"مدت یک دو روز است کہ جناب مخدوم والاخوان بحسب تقدیر مبتلائے حبس شدہ از سیتاپور بہ لکھنؤ برائے روبکاری صفائی روانہ کردہ شدہ اند۔ زبانی آیندہ ہرگاہی ہم از تحریرات آنجا ہر روزہ منکشف می شود کہ امروز فردا بفضلہ تعالیٰ رہائی خواہد شد۔ روز بنا برادائے شہادت صفائی، مولوی صاحب مکرم مولوی نبی بخش صاحب مشفقی مولوی قادر بخش صاحب و برخوردار مولوی سید ضامن حسین، بموجب درخواست مولوی عبد الحق (خلف علامہ) بمعیت ایشاں روانہ لکھنؤ شدہ اند، و ہمگیاں را امید از خدائے کریم است۔ دیگر روز بالضرور مخلصی یافتہ، وارد دولت خانہ خواہد شد، او تعالیٰ ہم چنیں کند۔ ہمہ ہا از خورد و کلاں و ذکور و اناث چشم براہ انتظار کشادہ می باشند۔ در رنج و قلق عظیم دارند۔ ایزد جل و علا بر جمیع کساں رحم خود فرمائند۔"

دوسرے روز عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ خط مذکور میں اس کا ذکر اس طرح ہے:-

"برادرمن تا دہ عشرہ بسبب عدم بہم رسی حامل ایں لفافہ افتادہ ماند۔ حالیہ آدمی خاص مقرر کردہ فرستادہ می شد کہ جواب شافی یابد۔ وحال پر ملال جناب مولوی (فضل حق) صاحب از لکھنؤ دریں عرصہ نوشتہ آمد۔ لائق گریستن، و واویلا کردن است۔ یعنی حبس دوام از پیش گاہ حکم صدور یافت۔ فواویلاہ واحسرتا۔ او تعالیٰ رحم فرماید"[1]

محررہ بستم فروری مطابق ۱۷ رجب ۱۲۷۵ھ

آخرش جزیرہ انڈمان روانہ کر دیے گئے۔ ادھر مولانا عبد الحق اور مولوی شمس الحق نے علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ خان شہابی گوپاموی کے داماد، خواجہ

---

[1] سیر العلماء۔

غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹیننٹ مغربی وشمالی کی معاونت سے اپیل دائر کر دی۔

مرزا غالب، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:۔

> "مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا۔ کچھ مجھ سے تم معلوم کرو، مرافعہ حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میاں داد خاں سیاح، سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو مرزا غالب نے انھیں لکھا:۔

> "ہاں خاں صاحب! آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے۔ گذارہ کس طرح ہوتا ہے"۔[1]

علامہ جزیرۂ انڈمان پہنچے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی وکول، مفتی مظہر کریم دریابادی، اور دوسرے مجاہد علماء وہاں پہلے پہنچ چکے تھے۔ ان علماء کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ دارالعلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔ خرابی آب وہوا، تکالیف شاقہ، اور جدائی احباب واعزہ کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔ مفتی صاحب نے علم الصیغہ جیسی صرف کی مفید کتاب جو آج تک داخل نصاب ہے وہیں لکھی۔ سرکاری ڈاکٹر حکیم امیر خاں کی فرمائش سے تواریخ حبیب اللہ ۱۲۷۵ھ بھی تالیف کی۔ (یہی تاریخی نام بھی ہیں)

ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے بن گئے تھے۔ تاریخی یادداشت، ترتیب واقعات، قواعد فنون، ضوابط علوم سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں۔ ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا۔ اور وہی رہائی کا سبب بنا۔

واپسی ہندوستان پر شاگرد رشید مفتی لطف اللہ علیگڈھی نے تاریخ لکھ کر پیش کی:۔

---

[1] اردوئے معلیٰ۔

چو بفضل خالق ارض و سما — اوستادم شد ز قید غم رہا،
بہر تاریخ خلاص آں جناب — بر نوشتم "انّ استاذی نجا"[1]

مفتی مظہر کریم نے میجر جان ہاٹن بہادر کمشنر جزائر دریائے شور کی فرمائش پر مراصد الاطلاع کا ترجمہ کیا۔ سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی نے ۵ اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہے:۔

میر اس کی لکھی تاریخ یوں سال مسیحی میں
یہی سیر جدید بوستان ہفت کشور ہے[2]

علامہ نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں۔ انھیں میں سے رسالہ "الثورۃ الہندیہ" اور قصائد فتنۃ الہند ہیں۔ یہ رسالہ اور قصائد جہاں تاریخی ہیں عربی ادبیت کے بھی شاہکار ہیں۔ علامہ کا کمال یہ ہے کہ اشعار اور جملوں میں ایک مادّہ کے مختلف صیغے متعدد معنوں میں بے تکلف استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں اصناف میں اس کا ظہور برابر نظر آتا ہے۔ مثال کے لیے حسب ذیل عبارت و اشعار کافی ہیں۔

یہ رسالہ مع قصائد علامہ نے مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعہ ۱۲۷۴ھ میں خلف الصدق مولانا عبد الحق کے پاس بھیجا تھا۔ کہ ابّن میاں کو جا کر یہ تحفہ دیدینا۔ پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد درست و مرتب کر پائے تھے:۔

الحمد للّٰہ عظیم الرجاء ⁖ للانجاء من دون الارجاء ⁖ من البلویٰ والبلیٰ والبلاء ⁖ وابلاء حسن البلاء ⁖ بایتاء الآلاء ⁖ لمن دعاہ باسنی الاسماء ⁖ لاسیما لمن ظلم واضطر عند الابتلاء ⁖ بالاسواء والادواء ⁖

ما ناح اورق فی اوراق اشجان — الا وہیّج اشجانی و اشجانی

دائی عضال ولا یجدی لعائدۃ — عود لداء لعود الداء عوّاد

---

[1] استاذ العلماء مؤلفہ نواب صدر یار جنگ بہادر۔ [2] کلیات منیر شکوہ آبادی۔

علامہ اور ان کے ساتھیوں کو کیا تکالیف اٹھانی پڑیں اور انڈمان میں کیسے ذلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا۔ رسالہ وقصائد میں اس کا مفصّل ذکر موجود ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فنِ ہیئت کا بڑا ماہر تھا۔ اس کی پیشی میں ایک سزا یافتہ مولوی بھی تھے۔ اپنے ایک فارسی کی کتاب ہیئت ان کو دی کہ اس کی عبارت صحیح و درست کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام نہ چلا۔ علامہ نئے نئے گئے تھے ایک سال ہی گذرا تھا۔ ان کی خدمت میں وہ کتاب پیش کر کے تصحیح کی گذارش کی۔ علامہ نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کر کے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دئے۔ جب یہ کتاب وہ مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے وہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ کہنے لگا مولوی صاحب! "تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے ہیں اور ان کی جو عبارتیں نقل کی ہیں یہاں کہاں ہیں؟"

مولوی صاحب کر لئے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لے کر بارک میں آیا۔ علامہ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ خستہ حالت میں چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر میر منشی لیفٹیننٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز سے اتر کے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑی تعداد میں لوگ تھے۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیر آبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب سپردِ خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریکِ دفن ہوئے۔ اور بے نیلِ مرام واپس لوٹے۔

قسمت کی بدنصیبی! کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! ہمیشہ کے لئے یہ آفتابِ علم و عمل دیارِ غربت میں غروب ہو گیا۔

اب تک یہ مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اور آج بھی قبر بزبان حال کہہ رہی ہے

تلک آثارنا تدل علینا   فانظروا بعدنا الی الآثار[1]

مزار کے متعلق مندرجۂ ذیل مکتوب قابل توجہ ہے:۔   ۱۴-۶-۱۹۷۶

محترم جناب شروانی صاحب
خدمت میں آداب

یہ خط آپ کی خدمت میں جناب سلیم اللہ صاحب کے توسط سے ارسال کر رہا ہوں امید ہے کہ اس خط کو پڑھ کر آپ محظوظ ہوں گے۔ یوں تو میں آپ کے لئے انجان ہو سکتا ہوں لیکن آپ میرے لئے قطعی انجان نہیں، آپ سے غائبانہ تعارف لٹن لائبریری کے زمانے سے ہی ہے۔ بدقسمتی مری کہ ذاتی طور پر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ کی کتاب۔ "باغی ہندوستان" کو خرید کر پڑھنے کا شرف حاصل رہا اور علماء دین کا رشتہ انڈمان کی سرزمین اور باشندوں سے جان کر از حد مسرت ہوئی۔ کاش کہ پرانے لوگ بھی بحیات ہوتے تو آج آپکے اس حوالہ کا جو عربی میں ہے اور جو علامہ فضل حق سے نسبت ہے کہ:۔

تلک آثارنا ، تدل علینا ،،
فانظروا بعدنا الی الآثار ،،

اس کی تصدیق بھی ہو جاتی تاہم اپنی کوششوں سے کچھ تحقیق کے بعد اور آپ کی تحریر کی امداد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس مزار میں جو دو مقبرے ہیں انمیں سے پہلا فضل حق مرحوم کا ہے اور دوسرا مرحوم لیاقت علی صاحب کا ہے۔ مولوی لیاقت علی کا تذکرہ دو جگہوں سے دستیاب ہو سکا۔ لیکن بہت ہی مختصر جو ناکافی ہے۔ رسالہ "آجکل" کا جنگ آزادی نمبر جس میں نثار احمد فاروقی صاحب کا ایک مضمون ہے جنرل بخت خاں کے عنوان سے انھوں نے حضرت خواجہ حسن نظامی کی کتاب "بہادر شاہ کا مقدمہ" سے اقتباس لیا ہے۔ دوسرا مولوی

---

[1] علامہ کی قبر انڈمان کے ساؤتھ پائنٹ (جسے عرف عام میں نمک بھٹہ کہتے ہیں) ایک بستی میں ہے جس کا ایک سمندری کنارہ Ross جزیرہ سے قریب ہے یہ وہ جزیرہ ہے جہاں علماء وغیرہ کو جہاز سے اتارا جاتا تھا۔ علامہ کی قبر کے ساتھ مولوی لیاقت علی کی بھی قبر ہے جن کا ذکر تواریخ عجیب از جعفر تھانیسری میں ہے۔ اور غدر کے چند علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی میں ہے۔ ۱۲ شاہد شروانی۔

جعفر تھانیسری صاحب کی اپنی خود نوشت سوانح حیات "کالا پانی" اور "تواریخ عجیب" میں ہے۔ میں نے لنڈن لائبریری میں دوران طالب علمی دیکھی تھی۔ اب تو یہ کتاب جمعیۃ العلماء کے جنرل سکریٹری آل انڈیا دینی تعلیمی بورڈ جناب وحید الدین قاسمی صاحب نے دوبارہ شائع کرا کر محترم خاں بادشاہ عبدالغفار خاں کو ہندوستان آنے پر جمعیۃ کی طرف سے بطور ہدیہ پیش کش کی ہے۔ افسوس کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کے یہاں قابض ہو جانے اور ان کی بالا دستیوں کی وجہ سے تمام پرانے ریکارڈ خاکستر ہو چکے ہیں۔ اور تحقیق کیلئے کوئی کاغذ اور کار آمد ثبوت نہیں ملتے۔ میں نے بھی انگریزی میں ایک مقالہ

Two Targetten India Mufuy At Port Blair

عنوان سے لکھا ہے۔ اس مقصد سے کہ دعوے اور غلط قیاس آرائیاں جو اب تک اس مزار سے متعلق جو مروج تھا وہ نئی صورت سے نئی تحقیق کی روشنی میں آجائے اور عوام الناس کو اس کی صحیح نوعیت کا پتہ چلے زیادہ تر باتیں تو آپ کی کتاب باغی ہندوستان سے ہی ماخوذ ہیں۔ کاشکہ اور تفاصیل مل جاتے۔ یہاں پر تو ایسی کوئی لائبریری بھی نہیں کہ جس سے استفادہ کیا جاتا! اور سرکاری ذرائع بھی خاموش ہیں! البتہ علی گڈھ یونیورسٹی لائبریری، یا پھر دہلی آرکائیوز ARCHIVE میں کچھ مزید باتیں شاید مل جائیں۔ اب میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ جناب سلیم اللہ صاحب بھی اتفاق سے تشریف لے آئے تھے! اور مجھے آپ سے ملنے کے بعد یہ شرف ملا کہ ایک صبح میں آپ کو اس مزار کی زیارت کے لئے لے گیا۔ خراماں، خراماں سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے ساؤتھ پائنٹ جو عرف عام میں نمک بھٹہ کہلاتا ہے، زیارت کے لئے پہنچے۔ یہ مزار ساؤتھ پائنٹ کی ایک بستی میں واقع ہے جس کا ایک سمندری کنارہ Ross جزیرہ سے قریب ہے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں پر اول اول مولویان طریقت جہاز سے لاکر اتارے جاتے تھے۔ ان میں سے بہت سے علماء کا تذکرہ تواریخ عجیب میں مولوی جعفر تھانیسری مرحوم نے کیا ہے۔

سلیم اللہ صاحب کل کے جہاز سے روانہ ہو رہے ہیں یہ میرے لئے باعث فخر ہے کہ آپ چند دن ساتھ رہے اور ہمیں اچھی اچھی باتوں سے نوازتے رہے۔ باقی آئندہ۔ خدا حافظ

نیاز مند سید شوکت علی (اپوزٹ نیتا جی کلب ہال۔ نزد جامع مسجد۔ پورٹ بلیر۔ انڈمان۔ آئرلینڈ۔)

مولانا عبد اللہ بلگرامی لکھتے ہیں:۔

"فادرج الفضل فی اثناء اکفانه ودفن العلم باندفانه"۔[1]

فضل ان کے کفن میں مکفون، اور علم ان کے ساتھ مدفون ہو گیا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"تبحّر فی العلوم العقلیة والنقلیة، واناف علی المهرة الکملة بالنفس القدسیة حتی امتلأت الآفاق بصیت کماله، وشحنت الاقطار بفضله وجلاله وکان الغالب علیه من العلوم المعقول، ومن المنقولات العلوم الادبیة والکلام والاصول، اما المعقولات فرزق فیها نفسا قدسیة وملکة ملکوتیة، کان یری الطالبین نظریاتها، ببیانه الصافی کالمحسوسات المرئیة، واما ارتجاله بالخطب والاشعار العربیة مع التجنیس والاشتقاق وحسن البراعة والطباق وغیرها من الصنائع الادبیة، فلم یخلق مثله فی البلاد، ولم یلت عدیله فیما افاد واجاد"۔[2]

ترجمہ:۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے متبحر اور ماہرین کاملین پر نفس قدسیہ کے باعث فائق تھے آپ کے کمال کی شہرت سارے زمانے میں پہنچی ہوئی تھی! اور آپ کے فضل و جلال سے سارا آفاق گونج رہا تھا۔ علوم میں فن معقول کا غلبہ تھا اور منقولات میں ادب، کلام اور اصول پر توجہ خاص تھی۔ معقولات میں نفس قدسیہ اور ملکہ ملکوتیہ حاصل تھا۔ طلبہ ان کے بیان صافی کی وجہ سے نظریات معقولات کو بالکل محسوس مرئی پاتے تھے۔ خطبات و اشعار فی البدیہہ فرماتے تھے۔ تمام صنائع ادبیہ، تجنیس، اشتقاق، حسن براعت اور صنعت طباق کا ارتجال کے باوجود پورا پورا مظاہرہ ہوتا تھا۔ انھیں کمالات کے پیش نظر اپنے علم و فضل میں بے نظیر اور افادہ و حسن تلقین میں بے عدیل تھے۔"

مصائب کا خاتمہ علامہ کی ذات ہی پر نہیں ہو جاتا۔ اولاد و احفاد کو بھی پریشانیوں کا سامنا رہا۔ سب سے بڑی مصیبت ضبطی جائداد و املاک کی تھی۔ علامہ بڑے امیر کبیر تھے دولت دنیا

---

[1] مقدمہ ہدیہ سعیدیہ۔ [2] مقدمہ ہدیہ سعیدیہ۔

و دین دونوں سے بہرہ ور اور صاحب عز و وقار تھے۔ حکام وقت، شاہزادگان عالی تبار، امرا و روسا اور صلحا سبھی عزت کرتے تھے۔ شاہانہ زندگی گذاری، ہاتھی، گھوڑے، پالکی، فینس، اور دوسری شان و شوکت کی سواریاں ہر وقت دروازے پر موجود رہتیں۔ جب مولانا عبد الحق پیدا ہوئے تو دہلی کے خواص و عوام اور برادران وطن نے بھی بطور اظہار خوشی نذرانے اور تحفے لاکھوں روپیہ کے پیش کئے [1]

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر خود علامہ نے قصیدہ ہمزیہ میں اپنی ترفہ و فراغت کا ذکر فرمایا ہے۔

کانت بفضل الحق فضل مثالۃ منها علی الامثال لی استعلاء
وجاهة بین الوجوه وجاهة تعنو لها الاعیان والرؤساء
وبراعة وزلفة و رفاهة ونزاهة و نباهة وعلاء

جرم بغاوت ثابت ہو جانے پر خیر آباد کا سنگین و عالیشان دیوانخانہ اور محل سرا ضبط کر کے بہ صلہ خیر خواہی سردار محمد ہاشم شیعی سیتاپوری (مورث اعلیٰ آغا فتح شاہ مشہور پلیڈر سیتاپور) کو دیدیئے گئے۔ انھوں نے رئیس کمال پور ضلع سیتاپور راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھ پانچ سات ہزار میں کوڑیوں کے مول فروخت کر ڈالے۔ عرصہ دراز تک راجہ جواہر سنگھ اور ان کے بعد ان کے بیٹے راجہ سورج بخش سنگھ نے اپنی جگہ پر قائم رکھے۔ مولوی حکیم ظفر الحق بن مولانا اسد الحق بن مولانا عبد الحق فرماتے ہیں کہ خود راجہ مذکور نے مجھ سے کہا کہ صرف علامہ کی یادگار میں میں نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ جب بارش کی کثرت اور غیر آباد حالت میں پڑے رہنے سے آثار شکست و ریخت نمودار ہونے لگے۔ تو ایک انجینیر کو درستی کے لئے بھیجا۔ تخمینہ درستی، تیس پینتیس ہزار روپیہ بتایا گیا تو راجہ نے مجبوراً پتھر کھدوا کر کمال پور منگوا لئے۔ اور کچھ سامان حکیم سید انوار حسین خیر آبادی مشہور طبیب و معالج خاص تعلقداران اودھ کو دیدیا [2] دروازہ بطور یادگار باقی رہنے دیا۔ جو آج بھی صاحب مکان کی عظمت و جلالت کا مرثیہ زبان حال سے پڑھ رہا ہے اور دیکھنے والوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

---

[1] حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء مولفہ مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی [2] دروازہ کے اندرونی اور بیرونی منظر کا فوٹو دیا گیا ہے جو شامل کتاب ہے۔

یہ مکان[1] موسومہ "نیا محل" منشی نیاز احمد فاروقی بانی مدرسہ نیازیہ و رئیس خیرآباد کے مکان کی نقل تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس میں دو تہ خانے تھے! اور منشی صاحب کے مکان میں ایک ہے۔ آگرہ وغیرہ سے پتھر منگوائے گئے تھے۔ تقریباً بیس سال ہوئے جب یہ مکان کھدوایا گیا تھا۔ مولانا حکیم احمد علی صاحب خیرآبادی فرماتے ہیں کہ علامہ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔

جب خلف الرشید مولانا عبدالحق خیرآبادی کو دلداری کے پیش نظر ۱۶ فروری ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہند کے دستخط سے سند خطاب "شمس العلماء" بلا کسی طلب و کوشش کے ملی تو علامہ کے ضبط شدہ دیہات میں سے کچھ دیہات بھی واپس دیئے جانے کا حکم دیا گیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے، باپ کو کالا پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی۔

مولانا عبدالحق رامپور میں تھے خیرآباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق کا بیٹا بن کر وہ دیہات قبضے میں لے لئے۔ 'اندھیر نگری چوپٹ راج' کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا مل سکے گی۔ مولانا عبدالحق نے عذر داری وغیرہ کسر شان سمجھ کر خاموشی اختیار فرمائی۔ بعد میں یار علی نے مصلحتاً یہ دیہات بیچ ڈالے۔

ان میں سے ایک موضع زین پور ہے جو حضرت مولانا شاہ سید محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین آستانۂ حافظیہ المتوفی سنہ ۱۳۲۰ھ نے ایک ہزار میں خرید کر اپنے پیر و مرشد حافظ سید محمد علی شاہ خلیفہ حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی کے مصارفِ درگاہ کے لئے وقف کر دیا جس کا انتظام سجادہ نشینان درگاہ کرتے رہے ہیں۔ حافظ سید امتیاز حسین سجادہ نشین کے انتقال کے بعد اب میاں سید ماجد حسین حال سجادہ نشین اس کا انتظام کرتے ہیں۔ دوسرا موضع نند و پور وہ لالہ نند و لال نے ایک ہزار میں خریدا۔ اس طرح علامہ کے اخلاف پریشان روزگار رہے۔ آج بھی علامہ کے پرپوتے، مولانا عبدالحق کے پوتے اور مولانا اسد الحق کے صاحبزادے مولوی حکیم محمد ظفر الحق خیرآباد میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سرکار نظام حیدرآباد

---

[1] افسوس کہ ۱۹۶۶ء کی طوفانی بارش میں یہ دروازہ بھی گر گیا۔ ؎

صبح دم وہ بھی نہ چھوڑی تونے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک۔

سے پچاس روپیہ ماہانہ آتے ہیں اور بس۔ ریاست رامپور سے قدیمی تعلقاتِ خاندانی کی بنا پر تیس روپیہ ماہانہ پہنچتے تھے وہ موجودہ والیٔ رامپور نواب رضا علی خاں کے تخت نشین ہوتے ہی بند ہو گئے۔ خلد آشیاں نواب حامد علی خاں مرحوم نے نہ صرف مشاہرہ جاری کیا، بلکہ وقتاً فوقتاً داد و دہش سے بھی نوازا۔ حکیم صاحب کو اکثر طلب فرما کر سرکاری مہمان رکھتے۔ ابتدا میں آپ کے تعلیمی مصارف کے لئے سو روپیہ ماہانہ زمانۂ دراز تک عطا کرتے رہے۔ نواب موصوف خود صاحبِ علم تھے۔ اور اپنے اسلاف کی طرح اسی خاندانِ خیرآباد کے شاگرد اور قدر دان تھے! اسی لئے استاذ زادگان کی قدر و منزلت بھی فرماتے تھے۔ حکیم صاحب خاندانی ذہانت کے مالک ہیں۔ فنِ طب میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ تشخیص مرض و نبض شناسی میں امتیاز خاص حاصل ہے۔ کثیر الاولاد ہوتے ہوئے کساد بازاریٔ فنِ قدیم کے شکار ہیں۔ [لہ]

علامہ کی اس خاندانی شاہانہ زندگی کے ساتھ جب انقلاب ۱۸۵۷ء سے روح فرسا اور صبر آزما حالات کے پیش آنے کا تصور ہوتا ہے تو موصوف کی شخصیت، استقلال ثباتِ قدم اور مجاہدانہ عزم کا اندازہ ہوتا ہے خصوصاً جب اس زمانہ کے عیش و راحت میں پلنے والے "مجاہدوں" پر نظر پڑتی ہے تو علامہ کا مرتبہ کتنا بلند ہو جاتا ہے۔

ہندستان کی صد سالہ مکمل غلامی میں کتنی مرتبہ مسلمانوں پر مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑے گئے۔ اسی حکومت برطانیہ کے ہاتھوں، سرزمین حجاز و شام و مصر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ اسی کے ہاتھوں ٹرکی کا مردِ بیمار گرفتار آزار ہوا۔

اسی نے قبلۂ اول بیت المقدس (فلسطین) جیسے پاکستان کو ناپاکستان بنانے کی تجویز کی! اسی کی بدولت ٹرکی و عرب کے مسلمانوں پر ہندستانی فوجوں نے گولیاں چلائیں۔ موپلہ قوم کی بربادی کی ذمہ دار بھی یہی بدنام حکومت تھی۔ انڈونیشیا (جاوا) اور وزیرستان پر بمباری و فوج کشی کرنے والی یہی سلطنت تھی۔ دولتِ عثمانیہ کی چادر کو ٹکڑے ٹکڑے اسی دولتِ برطانیہ نے کیا تھا۔

ان تمام دردناک مصائب کے باوجود ہندستان کا یہ مسلمان عیش پرست

[لہ] ۲ ستمبر ۱۹۷۰ء کو داغ مفارقت دے گئے۔ ۱۲ شاہد شروانی۔

وجاہ پسند طبقۂ امراء خواب راحت میں سوتا رہا۔ سوتا ہی رہتا تو بھی زیادہ شکوہ نہ تھا۔ جاگا اور مسلمانان ہند و مقاماتِ مقدسہ کے سینوں کو چھلنی کرانے کے لئے رنگروٹوں کی بھرتی کرائی حیثیت سے زیادہ چندے دئے۔ وفاداری کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کئے۔ انعامی جاگیریں پائیں۔ مختصر یہ کہ وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہئے تھا۔ اور وہ کچھ نہ کیا جو کرنا چاہئے تھا۔

آج جب کہ حکومت برطانیہ کا رختِ سفر بندھ چکا۔ پرِ پرواز تُل چکے۔ بین الاقوامی حالات اور ملکی تحریکات نے اسے سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو اس درندہ صفت، انسان نما گروہ نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی یعنی خطابات کی واپسی کو جہاد سے تعبیر کرنا شروع کیا، اور بغلیں بجا بجا کر اپنی بہادری کا ڈنکا پیٹنے لگے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ انسانی لباس میں درندے اور بھیڑ کی کھال میں بھیڑئے ہیں۔ ملک و قوم کے غدّاران ازلی اور مذہب و ملت کے منافقان سرمدی ہیں:۔

من جرّب المجرب حلّت به الندامة ۔

آزمائے ہوئے کو آزمانے سے آخر میں شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔

علامہ کی سیاسی بصیرت اور فطری فہم و فراست کا اندازہ الثورة الہندیہ کی تمہیدی عبارت کے بعد آنے والی عبارت سے لگائیے جسکی ابتدا ان قصتھا کے جملہ سے شروع ہوتی ہے۔ علامہ نے اس میں بتایا ہے کہ ہندوستان پر تسلط کے بعد انگریز بقاءِ سلطنت کے لئے دو اسکیموں پر عمل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

اوّل یہ کہ پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب مٹانے کے بعد اسکولوں کی یکساں تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب و ملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔ دوّم یہ کہ غلّہ پر کنٹرول کر کے خدا کی مخلوق کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جائے علامہ لکھتے ہیں:۔

> " انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر فرقوں کا اختلاف، تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا۔ اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اس لئے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے کر و حیلے

سے کام لینا شروع کیا۔ انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے۔ پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔"

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کئے جائیں۔ اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی اختیار نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح نرخ کے گھٹانے، بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق، مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں میں آپڑے۔ اور خوراک وغیرہ نہ ملنے پر ان کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

پہلی اسکیم کے متعلق لارڈ میکالے کے یہ جملے کافی سند ہیں۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو۔ اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندستانی ہو مگر مذاق اور رائے، زبان اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"

دوسری اسکیم پر جب عمل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن اس چار سالہ زمانۂ جنگ کے کنٹرولی عملدرآمد نے باشندگانِ ہند کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ غلّہ کا ملنا دشوار، کنٹرول کی دکانوں سے لینے میں عزت و آبرو اور وقت عزیز کی بربادی، شہر میں ذرا سی گڑبڑ پر دکانوں اور گوداموں کی قفل بندی، ان سب مصیبتوں کا مستقل ہر کہ و مہ کو سامنا رہا ہے۔

۱۱ر جولائی ۱۹۴۶ء سے پوسٹ مینوں اور کم تنخواہ والے ملازمین پوسٹ آفس کی جائز احتجاجی ہڑتال پر راشن کی سہولتیں چھین لینے کی، مرکزی حکومت کی طرف سے دھمکی نے علامہ کے بیان کو بالکل سچ کر دکھایا۔

کیا سچا ارشاد ہے سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا:۔

اتّقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور اللہ۔

مومن کی فراست سے ڈرتے رہو۔ یہ اللہ کے نور سے سب کچھ دیکھ اور سمجھ لیتا ہے۔

کہاں ہیں اس قول کے قائل کہ "مولوی کو سیاست نہیں آتی" آئیں۔ اور

رسالہ الثورۃ الہندیہ پڑھیں۔ مولوی کی سیاست غلام دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ انگریز سمجھتا ہے سوچو اور غور کرو۔ ۹۰ سال قبل سارے دفاتر پر اسی طبقہ کا قبضہ تھا۔ علماء مشاہیر وقت سرکاری و شاہی محکموں پر قابض تھے۔

مولانا فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دہلی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مفتی عنایت احمد کاکوروی منصف و صدر امین کول و بریلی، مولوی فضل رسول بدایونی، سررشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سہسوان، مفتی انعام اللہ گوپاموی، قاضی دہلی و سرکاری وکیل الہ آباد۔ مولانا مفتی لطف اللہ علی گڈھی سررشتہ دار صدر امین بریلی، علامہ فضل حق خیرآبادی سررشتہ دار ریزیڈنسی دہلی و صدر الصدور لکھنؤ و مہتمم حضور تحصیل اودھ، مولوی غلام قادر گوپاموی ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیلدار کوڑگاؤں، مولوی قاضی فیض اللہ کشمیری سررشتہ دار و صدر الصدور دہلی وغیرہم۔ یہ سب اپنے وقت کے بے نظیر و عدیم المثال اکابر علماء تھے۔ حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی، مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ موقع کا انتظار تھا۔ ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے۔ والیان ریاست و ارکین دولت میں ناقوس حرّیت پھونکنے والے یہی تھے۔ عوام کو ابھارنا اور فتویٰ جہاد جاری کرنا انھیں کا کام تھا۔ اور انقلاب ۵۷ء کے بعد سب سے زیادہ مصائب اٹھانے والے اور آتشِ حرّیت میں جلنے والے یہی شمع شبستان آزادی کے پروانے تھے۔ انگریز نے ان کو جانا اور پہچانا۔ ایک ایک کرکے تمام عہدوں سے اس طبقہ کو سبکدوش اور اس گروہ کے خلاف پورا محاذ قائم کیا۔ اپنی ایک مخصوص جماعت چھوڑی جس کا سب سے بڑا مقصد علماء کی تذلیل و توہین ان کو سیاست سے نابلد بتا کر اور دقیانوسیت کا الزام لگا کر قوم کی زمام قیادت پر قبضہ کرنا تھا۔

اے کاش مسلمان قوم سوچتی کہ وہ انگریز کی صد سالہ اسکیم کو اس پردے میں عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ وہ اپنے مجاہدین و سرفروش علماء کی توہین و تذلیل ان سرکاری ایجنٹوں کے اشاروں پر نادانستگی سے نہیں کر رہی ہے۔ بلکہ اپنے پاؤں میں اپنے ہی ہاتھوں سے کلھاڑی مار رہی ہے۔

وہ وقت دور نہیں جب افق ہندوستان پر آفتاب آزادی طلوع ہوگا۔ اس وقت اس ناسمجھ قوم کو پچھتانا اور کف افسوس ملنا پڑے گا۔ ہمیں فخر ہے کہ آج بھی ہندوستان کی سیاست کے آسمان پر سب سے بلند مقام اسی طبقۂ علماء کا ہے۔

ہمیں نیک شگون بیت المقدس پر قبضۂ نصاریٰ سے ملتا ہے۔ ۱۰۹۹ء سے ۱۱۸۷ء تک ۸۰ سال تسلط رہا۔ جس میں ظلم و تعدی کی انتہا ہو چکی تھی۔ آخر سلطان صلاح الدین ایوبی نے پرچم اسلام لہرایا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۵ء تک بھی ۸۰ سال ہی ہوتے ہیں۔ مظالم و مصائب کا یہاں بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔ پہلی شملہ کانفرنس ۴۵ء میں ہی حکومت برطانیہ ہتھیار ڈال چکی تھی۔ دوسری شملہ کانفرنس ۱۹۴۶ء میں اسے شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔

یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ ۲۷ رجب ۵۸۳ھ کو مسجد اقصائے بیت المقدس میں سلطان نے نماز شکر ادا کی جب کہ اسی تاریخ میں سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے شب معراج میں اسی مقام پر امامت انبیاء فرمائی تھی۔ اسی طرح یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ یروشلم کی طرح، ہندوستان بھی اسی قوم کے ہاتھوں سے اسی مدت میں آزاد ہو رہا ہے۔

اخلاف

انسان کی یادگار دنیا میں مختلف چیزیں ہو سکتی ہیں لیکن نافع یادگار صرف تین ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے:۔

«انسان دنیا سے جاتا ہے، تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ تین عمل نفع بخش اور باقی رہنے والے ہیں۔ علمِ نافع، صدقۂ جاریہ، اور ولدِ صالح۔»

اس فرمان نبوی سے یہ معلوم ہوا کہ نیک اولاد، انسان کی یادگار بن سکتی ہے۔ بد عملی نے پسر نوح علیہ السلام کو ‹انہ لیس من اھلک، انہ عمل غیر صالح› کے حکم کی بنا پر خاندانِ پیغمبر سے خارج کرا دیا تھا۔ بد اعمال اولاد باپ کی زندگی میں باعث ننگ و عار، اور مرنے کے بعد ذلیل و خوار ہوتی ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی نے کہا ہے ؎

میرے اللہ نے بخشی مجھے اولاد سعید میرے اشعار وہ ہیں جن سے مرا نام چلے

علامہ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بی بی وزیرن، دختر منشی فضل احمد بن حسین میاں تھیں ان سے تین صاحبزادیاں بی بی سعید النساء، حرماں والدہ خان بہادر افتخار الملک منشی افتخار حسین مضطر خیرآبادی مرحوم و محمد حسین بسمل خیرآبادی مرحوم۔ بی بی نجم النساء، والدہ منشی ضمیر علی مرحوم فوجدار، ریاست جے پور، محمود النساء، زوجہ منشی طفیل احمد برادر منشی نیاز احمد بانی مدرسہ نیازیہ و رئیس خیرآباد" اور ایک صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی تھے موصوف نے والد ماجد کے نام نامی کو اور گرامی بنایا۔ اور اس لائق شاگرد نے فائق استاد کو مزید بلند و بالا مقام پر پہنچایا۔ ۱۳۱۶ھ میں وفات پائی۔ درگاہ مخدوم شیخ سعد میں مسجد سے متصل فصیل کے نیچے محو خواب ہیں۔ دو سال کے بعد سعادتمند فرزند مولانا اسدالحق ۲ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ کو راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ بادشاہ میاں کے باغ رامپور میں مدفون ہیں۔

اب صرف مولوی حکیم ظفرالحق خیرآبادی بن مولانا اسدالحق اس دودمانِ عالی کے تنہا چشم و چراغ ہیں۔ جو عمر کی تقریباً ساٹھ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ اطباء خیرآباد کی صف اول میں آپ کا شمار ہے[1]

علامہ کی دوسری اہلیہ دہلی کی تھیں۔ یہ شادی غیر کفو میں کی تھی۔ ان سے دو صاحبزادے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق ہوئے۔

اول الذکر کی دختری اولاد، دہلی میں موجود ہے۔ مولوی علاء الحق سے مولوی ضمیر الحق ان سے مولوی فیض الحق موجودہ ممبر مال ریاست بھوپال ہیں۔

تلامذہ

سچ پوچھئے تو اصلی اولاد، روحانی اولاد ہے۔ اسی لئے علماء کرام نے ہر نیک اعمال اور متبع سنت مسلمان کو سرور کائنات علیہ السلام والتحیات کی آل میں شامل مانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درود میں آل کے ساتھ اصحاب کا لفظ نہ بھی آئے جب بھی صحابۂ کرام داخل ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابوعبداللہ مشرف بن مصلح سعدی شیرازی نے خوب کہا ہے:۔

---

[1] ۱۹۷۸ء میں انتقال ہو گیا۔

اولادِ علامہ فضلِ حق

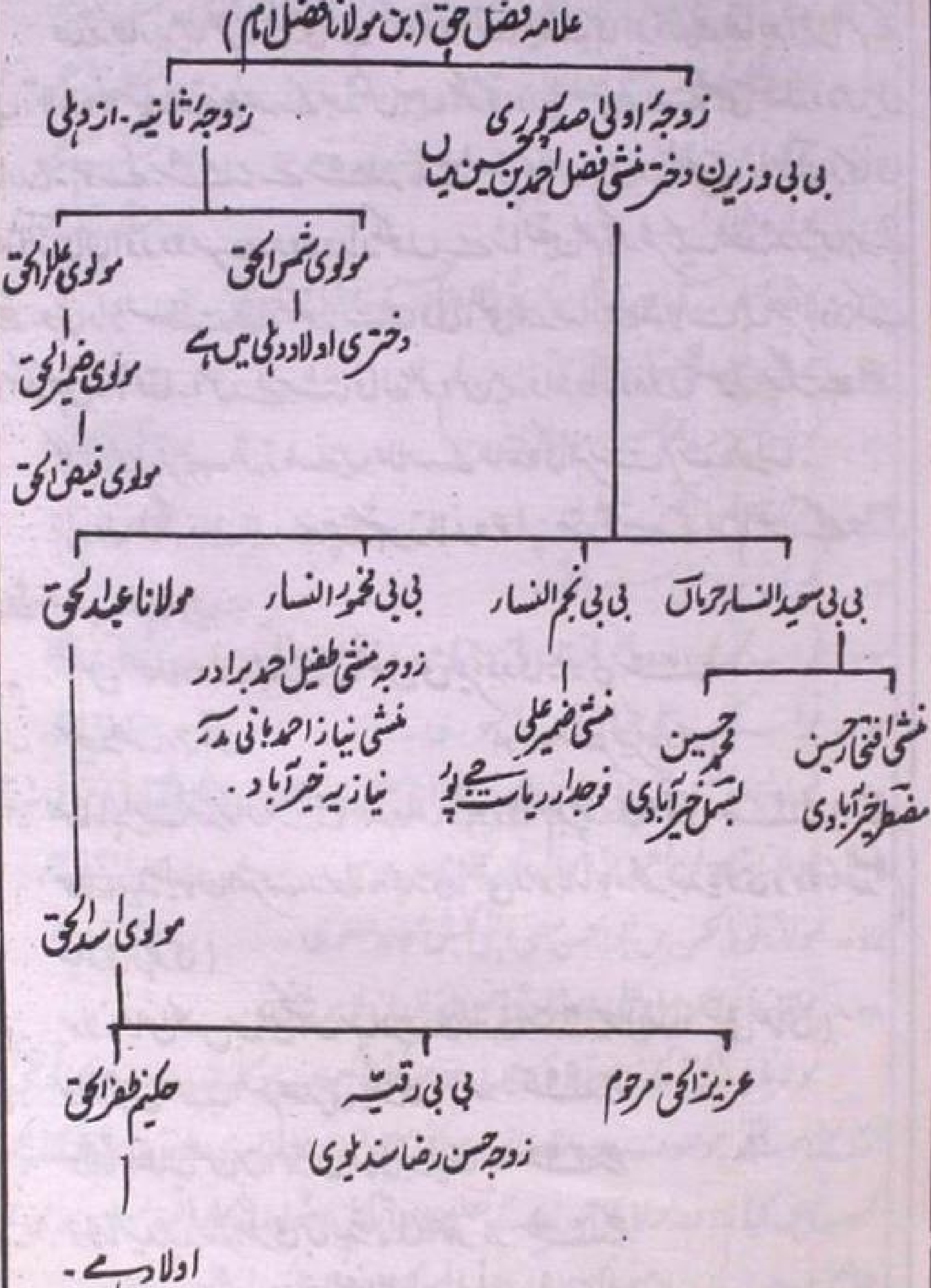

علامہ فضل حق (بن مولانا فضل امام)

زوجۂ اولیٰ صدرپوری
بی بی وزیرن دختر منشی فضل احمد بن حسین میاں

زوجۂ ثانیہ۔ از دہلی

مولوی شمس الحق
دختری اولاد دہلی میں ہے

مولوی علاء الحق
مولوی ضمیر الحق
مولوی فیض الحق

بی بی سعید النساء حرماں
منشی افتخار حسین مضطر خیرآبادی
محمد حسین بسمل خیرآبادی

بی بی نجم النساء
منشی ضمیر علی فوجدار ریاست جے پور

بی بی محمود النساء
زوجہ منشی طفیل احمد برادر منشی نیاز احمد بانی مدرسہ نیازیہ خیرآباد۔

مولانا عبد الحق
مولوی اسد الحق

عزیز الحق مرحوم

بی بی رقیہ
زوجہ حسن رضا سندیلوی

حکیم ظفر الحق
اولاد ہے۔

پسر نوح با بداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد

صدقۂ جاریہ میں علم نافع بھی ہے۔ تلامذہ و تصانیف یہی دو ذریعے بقا و اجرا علم کے ہیں۔ تلامذہ کا شمار اتنے عرصہ کے بعد ممکن نہیں حکومتی و ریاستی عہدے کبھی مشغلۂ درس میں خارج نہ ہوئے ۱۸۰۹ء سے ۱۸۵۸ء تک مسلسل پچاس برس دیار عرب، ایران، بخارا، افغانستان اور دوسرے دور دراز ملکوں سے شائقین علم آکر شریک حلقۂ تدریس ہوتے تھے۔ دہلی دار السلطنت تھا منقولات میں ولی اللہی مدرسہ اور معقولات میں خیرآبادی مکتب کا سکہ چل رہا تھا۔ اس لئے مشتاقان علم و فن پروانہ وار دونوں شمعوں پر گر رہے تھے۔

کاش کوئی قریب تر زمانے میں علامہ کے تلامذہ کی فہرست مرتب کر لیتا۔

ہزاروں شاگردوں میں سے چند مشہور تلامذہ جو اپنے وقت کے امام الفن سمجھے جاتے تھے، حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ شمس العلماء مولانا عبدالحق بن فضل حق خیرآبادی۔ متوفی ۱۳۱۶ھ
۲۔ سعید النساء حرماں (والدہ مضطر خیرآبادی)
۳۔ مولانا ہدایت اللہ خاں بن رفیع اللہ خاں رامپوری ثم جونپوری۔ متوفی ۱۳۲۶ھ (استاد مولانا سید سلیمان اشرف و مولانا امجد علی اعظمی و مولانا یار محمد بندیالوی و مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی)
۴۔ مولانا فیض الحسن بن علی بخش سہارنپوری متوفی ۱۳۰۴ھ (استاذ شبلی نعمانی)
۵۔ مولانا جلیل احمد بن اسلم صدیقی بلگرامی ،، ۱۲۹۴ھ
۶۔ مولانا سلطان حسن بن احمد حسن عثمانی بریلوی ،، ۱۲۹۶ھ
۷۔ مولانا سید عبداللہ بلگرامی بن سید شاہ آل احمد ،، ۱۳۰۵ھ
۸۔ مولانا شاہ عبدالقادر بن شاہ فضل رسول بدایونی ،، ۱۳۱۹ھ
۹۔ شمس العلماء عبدالحق بن شاہ غلام رسول کانپوری ،، ۱۳۱۲ھ
۱۰۔ مولانا ہدایت علی بریلوی (استاد مولانا فضل حق رامپوری) متوفی ۱۳۲۴ھ
۱۱۔ مولانا غلام قادر گوپاموی، (سبط مولانا فضل امام)

۱۲۔ مولانا خیرالدین بن محمد ہادی (والد مولانا ابوالکلام آزاد)[لہ] متوفی سنہ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء

۱۳۔ مولانا عبدالعزیز سنبھلی۔

۱۴۔ مولانا عبدالعلی خاں (الریاضی) رامپوری (استاد مولانا احمد رضا خاں بریلوی) ” سنہ ۱۳۰۳ھ

۱۵۔ مولانا حکیم محمد فیاض خاں۔ ” سنہ ۱۲۷۲ھ

۱۶۔ مولانا موسیٰ خاں۔ ” سنہ ۱۳۳۳ھ

۱۷۔ مولانا ملا نواب۔ ” سنہ ۱۳۰۹ھ

۱۸۔ مولانا قلندر علی زبیری (استاد مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی) ”

۱۹۔ مولانا قلندر بخش پانی پتی۔

۲۰۔ مولانا حکیم سید محمد حسن امروہوی۔ ” سنہ ۱۳۲۳ھ

۲۱۔ مولانا دادار بخش پنجابی۔

۲۲۔ مولانا سید علی سسوانی۔

۲۳۔ نواب محمد یوسف علی خاں رامپوری۔ ” سنہ ۱۲۸۲ھ

۲۴۔ نواب کلب علی خاں۔ رامپوری۔ ” سنہ ۱۳۰۴ھ

۲۵۔ مولانا محمد احسن گیلانی بن شجاعت علی الواسطی (جد مولانا مناظر احسن گیلانی) متوفی سنہ ۱۳۰۱ھ

۲۶۔ مولانا شاہ نور احمد بن مولانا محمد شفیع۔ ” سنہ ۱۳۰۱ھ

۲۷۔ مولانا نورالحسن بن ابوالحسن مفتی الٰہی بخش کاندھلوی۔ ” سنہ ۱۲۸۵ھ

۲۸۔ مولانا ابواحمد مراد علی (استاد قاضی ظفرالدین لاہوری) ”

مولانا عبدالحق کے نامور تلامذہ میں سے مولانا حکیم سید برکات احمد بہاری ٹونکی المتوفی سنہ ۱۳۴۷ھ تھے۔ موصوف سے علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری المتوفی سنہ ۱۳۵۹ھ نے کسب فیض کیا۔ اور مولانا اجمیری کے نعلین مبارکین اٹھانے کا راقم السطور کو بھی فخر حاصل ہے۔ ”پہنچا کہاں سے ہے کہاں سلسلۂ دراز علم“

[لہ] مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:- والد مرحوم (مولانا شاہ خیرالدین) نے معقولات کی تکمیل مولانا فضل حق کی خدمت میں کی تھی۔ اثنائے درس میں اکثر ان کا ذکر خیر کیا جاتا تھا فرماتے تھے میں نے ایسا خوش تقریر انسان عمر بھر میں کوئی نہیں دیکھا۔ مجلس کی تقریر اور درس علوم کی تقریر دونوں میں بے مثل تھے۔ ان کی ایک تقریر وحدۃ الوجود پر اس درجہ مشہور ہوئی کہ دور دور سے اہل علم اس کی سماعت کے لئے شد رحال کرکے آتے تھے۔ (مقالہ عربی، ڈاکٹر عمر الانصار بیلم حیدرآباد دکن)

تیرھویں اور چودھویں صدی کے اکثر فضلاء ہند خیرآبادی شجر علم کے خوشہ چیں ہوئے ہیں۔ موجودہ دور کے صفِ اوّل کے مشاہیر علماء کو نسبت تلمذ علامہ کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ سے حاصل ہے۔ دنیا میں اہل کمال بھی زوال سے نہیں بچے، عالَم کی ہر چیز کو فنا ہے۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اور پھر تماشا یہ ہے کہ جو جاتا ہے پھر مڑ کے نہیں دیکھتا۔ ابوطالب کلیم ہمدانی ملک الشعرا[1] دربار شاہجہاں نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وضع زمانہ قابل دیدن، دوبارہ نیست
رو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

قطعات تاریخ

قد توفّیٰ الالٰہ فضلَ الحق   عالماً جیّداً بلا ریب
ان نفاہ الولاۃُ من بلدہ   بجفاءٍ فلیس من عیب
قال تاریخہ "لَاَدْرَکَہ   فضلُ حقٍّ" ھواتف الغیب
۷۸ ۱۲ھ

ولہ

مولوی فضل حق چو رحلت کرد   جنتی گشت نیست ریب مرا
گفت تاریخ " لادرکہ   فضل حق" سروش غیب مرا
۷۸ ۱۲ھ

باعمل تھے حضرت فضل حق   کر دیا نیرنگ نے جینا محال
انڈمن کو لے گئی قید فرنگ   ہوگیا آخر وہیں پر انتقال
سال ہے مسعود بے " ہادی ہند"   فضل حق خیرآبادی باکمال[2]
۷۹ —— ۱۹۴۰
۱۸۶۱ء

---

[1] قسطاس البلاغۃ۔ محمد سعید حسرت ص۲۱ [2] عندلیب تواریخ ص۱۱۰

مرثیہ

مولانا فیض الحسن سہارنپوری (تلمیذ رشید علامہ) نے ۱۵ اشعار کا مرثیہ لکھا۔ جس کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

عِمِیَ دارَ سلمیٰ فاسلَمی ثم اسلمی   وان لم تحرّیبنی وان لم تکلّم
سقاکِ غوادٍ ما بقیتِ ہواطلٌ   وآخر دعوانا انُعمی ثم اَنعمی
عظیمٍ لمولانا نبیل مبجل   کریم رحیب الباع برّ مکرم
طلیق ذلیق بارع ذی فضائل   مد ندس ندب ہمام معمم
ارید بہ مولای الاستاذ الذی   مضی حین امسی عین فضل مسلم
بنفسی ومالی من یکون کمثلہ   وای کریم مثلہ فی التکرم
فکان علینا اذ سمعنا نعیہ   نبکی کما تبکی نوائح ماتم
صبرنا وقلنا للعیون اصبرن ولو   بکینا قلیلا وسال وادمن الدم
بلی قد کبُنا کآبۃ مستکنۃ   ولا ینفع الاغلال من لم یکتم
سئمنا من الدنیا ومن طول عیشنا   ومن یلق منہا ما لقیناہ یسئم
نعیش ولکن رُب عیشٍ منغّصٍ   اَمَرّ من المرئی صاب وعلقم
رضینا بما یقضی الالہ وما قضی   بصرنا بما لا یبصر العامہ العمی
رضینا ولم نہلک اسیً وتاسّفا   ومن یرض طوعا بالمقادیر یسلم
جزی ربہ عنا نعیماً وجنّۃ
ومن لم یقل یارب آمین یاثم

عکس نامہ گرامی

خاتم الحکماء علامہ فضل حق خیر آبادی بنام مولانا سلطان حسن خاں صدر الصدور (خسر قاضی محمد خلیل رئیس بریلی) مورخہ ۱۲۷۲ھ عطیہ قاضی موصوف القدر بہ جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی سابق صدر الصدور مملکت حیدر آباد دکن۔ آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صدر دار المصنفین اعظم گڈھ رئیس حبیب گنج ضلع علیگڈھ

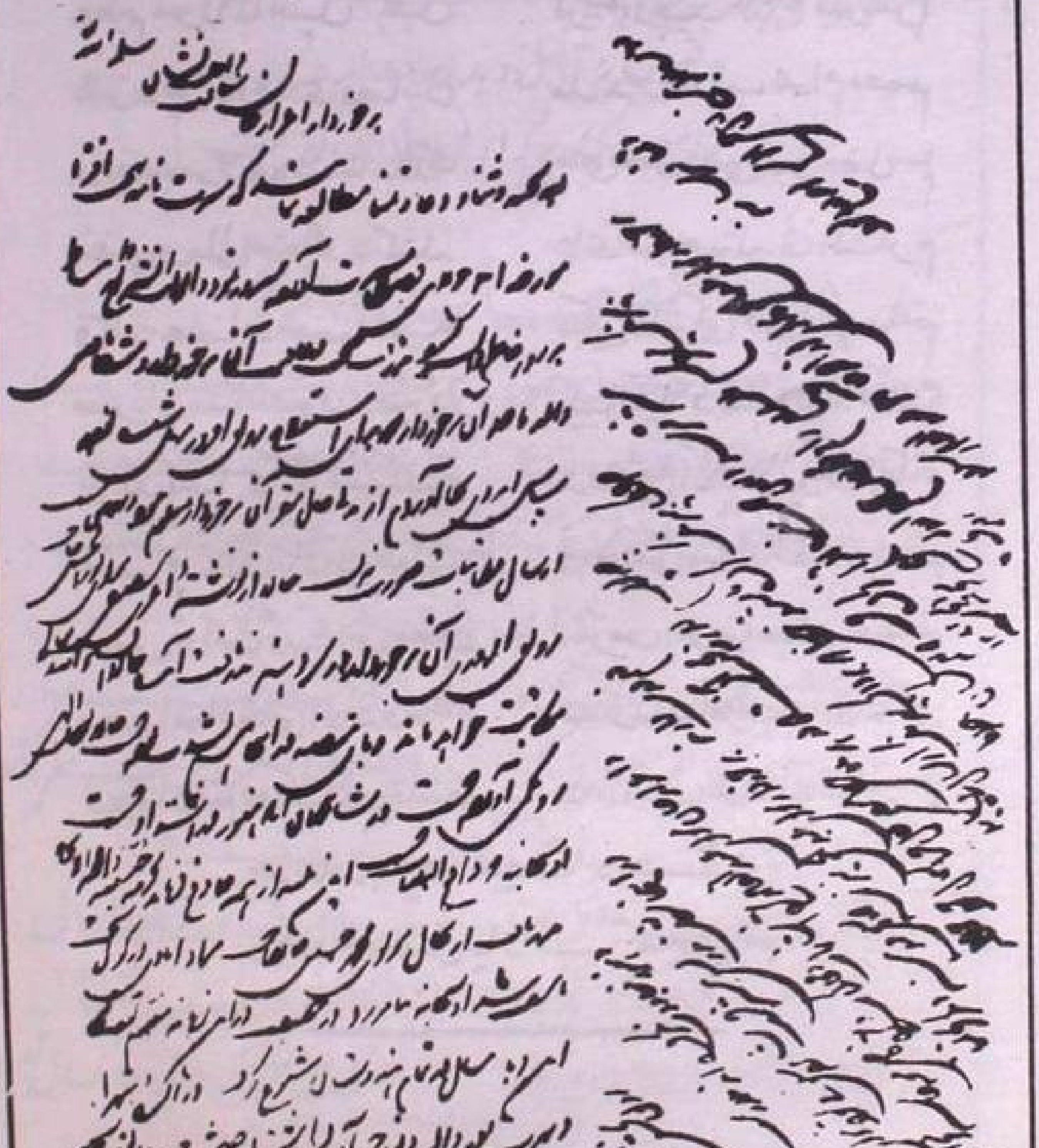

نقل خط

نامہ گرامی خاتم الحکما علامہ فضل حق خیر آبادی

برخوردار اعز از جان سعادت و اقبال نشان سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد تحیۃ و ثناء و دعا و تمنا مطالعہ نمایند کہ مسرت نامہ بہجت افزا مورخہ ۳۱ رجولائی وصول مسرت آوردہ سرور نمود ابواب انشراح و انبساط بر روئے خاطر وابستہ کشود بدریافت صحت و عافیت آں برخوردار و شفا یافتن والد ماجد آں برخوردار کہ برائے استعلاج رونق افروز بریلی شدہ بودند۔ سپاس ایزدی بجا آوردم از مدتے حال صحت آں برخوردار معلوم نبود۔ و ہمیں سبب ارسال مکاتبات صورت نہ بست حالا از نوشتۂ اعزی شفیقی مولوی نور الحسن صاحب رونق افروزی آں برخوردار در مرشد آباد بدریافت آمدہ۔ حالا انشاء اللہ تعالیٰ مکاتبت خواہ ماند و بلائے ہیضہ درایں جا ہم بشدت بودہ است۔ حالا بفضل الٰہی رو بکمی آوردہ است۔ در شاہجہاں آباد ہنوز در اشتداد است۔ او سبحانہ کہ دافع البلیات است ایں بلیہ از ہمہ جا دفع فرماید بحرمۃ حبیبہ و آلہ الامجاد بدریافت ارتحال مولوی محمد حسین خاں صاحب مرادآبادی در کول سخت تاسف شد او سبحانہ بیامرزد در حقیقت درایں زمانہ مغتنم بودند ایں وبا امسال در تمام ہندوستان شیوع کردہ در آگرہ و متھرا و بھرت پور و الور و نواحی آں بسیار اشتداد داشت۔ حالا بفضلہ سبحانہ تخفیف است۔ والحمد للہ۔

امروز روز پانزدہم است کہ برخوردار نور الابصار مولوی عبد الحق سلمہ اللہ تعالیٰ نزد من رسیدہ اند۔ چوں مہاراؤ راجہ بہادر از چندے رونق بخش راج گڈھ دوازدہ کروہے الور اند و ہنوز معاودت نکردہ اند۔

ملازمت برخوردار صورت نبستہ است دریں جا شغل تدریس پیش تر است۔ شانزدہ سبق می شود۔ مولوی نور احمد صاحب افق المبین مع حاشیہ و اعز از جان مولوی عبد القادر شرح اشارات و محاکمات و شرح قاضی مع حاشیہ می خوانند فہم درست دارند۔ برخوردار مولوی عبد الحق نیز سہ چہار سبق داشتہ دیگر۔ بجز۔ تمنا چہ نویسم لازمہ محبت آنست کہ در ہر ماہ خطے متضمن حال خیر اشتمال خود حوالہ ڈاک بیرنگ کردہ باشند خطے کہ بر ڈاک بیرنگ مے یابد بیشتر مے رسد و بہمیں جہت بندہ التزام کردہ است کہ ہمہ یکساں خطوط بیرنگ می فرستم۔ والسلام۔

راقم محمد فضل حق ختم اللہ لہ بالحسنیٰ پنجم ذی حجہ ۱۲۷۲ھ روز پنجشنبہ

برخوردار مولوی عبد الحق و مولوی نور احمد صاحب و مولوی عبد القادر سلام و تمنا برسانند در لالہ بنسی حتی الوسع توجہ دریغ نشود۔

مستقل اضافہ طبعِ چہارم

ابحاثِ جدیدہ

مقدمہ اور اس کے متعلقات

بقلم عبدالشاہد خاں شروانی۔

چند اغلاط کی تصحیح

از:۔ حکیم محمود احمد برکاتی۔

تعارفِ تصانیف

از:۔ مفتی سید نجم الحسن خیرآبادی

مُرتّب

مولانا عبدالشاہد خاں شروانی

مقدمہ اور اس کے متعلقات

ڈاکٹر اطہر عباس رضوی جب "سوتنتر دہلی" تالیف کر رہے تھے تو اس کی ترتیب کے سلسلے میں سرکاری مواد بھی مہیا کر رہے تھے۔ اسی ضمن میں علامہ فضل حق خیرآبادی کے مقدمہ کی مسل بھی میسر آگئی۔ موصوف سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ وہ غالباً ۱۹۴۲ء میں کتابخانہ حبیب گنج میں اپنے موضوع کی تحقیق کے سلسلے میں پہنچے تھے! اور میں وہاں کام کرتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی میں بہ حیثیت اورینٹل اسسٹنٹ میرا تقرر ہو گیا۔ کچھ دن کے بعد رضوی صاحب بھی شعبۂ تاریخ میں لیکچرر ہو کر آگئے۔ پھر تو مسلسل ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ یوپی سرکار میں اچھے عہدے پر چلے گئے۔ اسی دور میں "سوتنتر دہلی" کی تالیف کی۔ اب آسٹریلیا کی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اور وہیں کے باشندے ہو گئے ہیں۔ مگر تقریباً ہر سال علی گڑھ آتے ہیں۔

میری استدعا پر موصوف نے اس مسل کی دو کاپیاں ٹائپ کر کے مجھے دیں۔ پھر میری استدعا پر اس کا اردو ترجمہ بھی کر کے دیا۔

اس مسل میں سے کچھ کاغذات سرکاری طور پر نکال لئے گئے ہیں۔

علامہ کو ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو گرفتار کیا گیا۔ اور لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا۔ گرفتاری سے تین ہفتے کے اندر کیپٹن ایف۔ اے۔ وی تھربرن کی عدالت میں ۲۱ فروری ۱۸۵۹ء کو مقدمہ شروع ہوا۔ استغاثہ اور صفائی کے پانچ پانچ گواہوں کے بیانات کے بعد ۲۸ فروری ۱۸۵۹ء کپتان تھربرن نے فرد جرم مرتب کر کے مقدمہ جوڈیشل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ جوڈیشل کمشنر مسٹر جارج کیمبل اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت سے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو قتل پر انگیخت اور بغاوت کے الزام میں بطور شاہی قیدی حبس بعبور دریائے شور اور تمام جائداد کی ضبطی کی سزا سنا دی گئی۔

مقدمہ فوجداری نمبر ۲ (۷۱) ۱۸۵۹ء خیرآباد ڈویژن۔

سرکار۔ بنام فضل حق۔

الزام۔ بغاوت۔

سزا۔ عمر قید (موت ۲-۸-۶۱) ضبطی کل جائداد۔

۱۔ مسٹر تھامسن کا نیم سرکاری خط مورخہ ۹ر فروری۔

۲۔ کیپٹن ہتھربرن کے ریکارڈ کی شہادت۔

۳۔ مقدمہ فوجداری کیپٹن ہتھربرن کی عدالت میں چلا۔

۴۔ چارج شیٹ۔

۵۔ کلینڈر۔

۶۔ اخبار کا ترجمہ۔ مورخہ ۱۶ر جون ۱۸۵۸ء

۷۔

۸۔ خط از طرف کمشنر مسلم اسٹیٹ نمبر ۷ (۱) مورخہ ۲ر مارچ۔

۹۔ فارسی کے اخبار کے اقتباسات۔

۱۰۔ نقل خط از طرف کمشنر سی، ایس، ایس نمبر، مورخہ ۲ر مارچ ۱۸۵۹ء بنام کمشنر دہلی۔

۱۱۔ کمشنر دہلی کا خط نمبر ۱۳۵ (۱) مورخہ ۲۶ر فروری ۱۸۵۹ء (جس کے ساتھ ایک نوٹ بزبان فارسی نوشتہ فضل حق جس پر G لکھا ہے منسلک ہے)

۱۲۔

۱۳۔ اور مختلف لوگوں کے DEPOSITION بزبان فارسی۔

۱۴۔ جوڈیشل کمشنر کے شہادتی نوٹ۔

۱۵۔ چارج شیٹ۔

۱۶۔ ریمارکس بمعہ ڈاکٹ نمبر ۳۲۲ مورخہ ۷ر مارچ ۱۸۵۹ء بنام ایس۔

۱۷۔ وارنٹ نمبر ۱۴۔

۱۸۔ مولوی فضل حق کی جانب سے عرضداشت (Petition) بزبان فارسی۔

۱۹۔ خط از طرف کمشنر خیر آباد نمبر ۱۵۳ مورخہ ۳۰ جولائی۔

۲۰۔ خط بنام [illegible] کمشنر نمبر ۴۸۰ مورخہ ۳ اگست ۱۸۶۱ء

۲۱۔ خط از طرف [illegible] کمشنر نمبر ۱۹۷۵ مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء

۲۲۔ نقل ایک G.| ایجنٹ کے روبکار ایٹ راجپوتانہ کی مورخہ ۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء۔

۲۳۔ مسٹر ولیم کا میمو۔

۲۴۔ خط بنام ایجنٹ گورنمنٹ جنرل راجپوتانہ نمبر ۱۵۷ مورخہ ۱۶ از طرف سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر (۲۵ اور ۲۶)

۲۵۔ ARYDA K (گم ہے ممکن ہے الگ کر دیا گیا ہو نمبر A مورخہ ۲۴ ۱۱/۹ء)

سب سوائے نمبر ۲۔ ۴۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱ اور ۲۶ کے الگ کر دیئے گئے۔

۲۶۔ وارنٹ۔

۲۷۔ فارسی کی مسل لسٹ پر نشانی لگائی ہوئی۔

۲۸۔ }
۲۹ }

۳۰ } ڈسٹرکٹ جج کے کاغذ نمبری ۲۵۸۵ مورخہ ۱۷ دسمبر ۹۱ء
۳۱ }

۳۲ }
۳۳ } جوڈیشل کمشنر کے کاغذ نمبری آر ۷۱ ۱۸۵۹ء مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۹۱ء

یہ مقدمۂ فوجداری نمبری ۲ (۷۱) کیپٹن ایف۔ اے۔ وی تھربرن کی عدالت میں ۲۱ فروری ۱۸۵۹ء کو لکھنؤ میں شروع ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہ پیش ہوئے۔ (۱) عبدالحکیم اکسٹرا اسسٹنٹ دریاباد (۲) تجمل حسین۔ (۳) فضل حسین (۴) رام دیال (۵) مرتضیٰ حسین۔ ان گواہوں نے اپنے بیانات میں مولانا فضل حق کو بوندی میں ممو خاں باغی کا مشیر اودھ کی بغاوت میں شریک کار، اور عبدالحکیم و مرتضیٰ حسین کے قتل کے لئے فتویٰ دینے

کا مرتکب ثابت کرنے کی کوشش کی۔

استغاثہ کے گواہوں کے بعد مولانا فضل حق کا بیان ہوا۔

بیان مدعا علیہ

"میں الور کے راجہ کی ملازمت میں تھا۔ میں ان کے ساتھ ۵ سال رہا۔ اور بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجہ بنے سنگھ کی موت کے ایک ماہ بعد تک میں الور میں رہا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں، میں نے الور چھوڑ دیا۔ میں نے دہلی کیلئے کوچ کیا وہاں ۱۵ دن رہا اور پھر الور لوٹ آیا۔ میں نے اپنا خاندان الور ہی میں رہنے دیا تھا۔ اور ستمبر ۱۸۵۷ء میں خیر آباد کے لئے چل پڑا۔ میں اپنے گھر رہا تھا۔ اور میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا۔ میرے گواہان میر فتح حسین، محمد حسین اور احمد علی خاں ہیں۔ نبی بخش، قادر بخش، امام علی، آل محمد اور ممتو خاں میرے رہنے سہنے کی شہادت دے سکتے ہیں۔ میں نے خیر آباد اس لئے چھوڑا کیونکہ سب ہی لوگ بیگم کے ساتھ بھاگ لئے تھے۔ میں خیر آباد سے ہٹنے کے بعد کچھ وقفہ کے لئے کھیری۔ ہرگاؤں، تنبول اور سہور پور میں بھی ٹھہرا تھا۔ میں کچھ دن دوریہ میں بھی رہا۔ ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو میں کرنل کلارک سے سبیہا کے مقام پر ملا۔ اس سے پہلے میں بریگیڈیر ٹروپ سے مل چکا تھا۔ بریگیڈیر ٹروپ ہی نے مجھے کرنل کے پاس بھیجا تھا۔ کرنل کلارک نے ایک روبکار لکھی اور حکم دیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ میں ۳۰ر دسمبر کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے پہنچا پھر اپنے مکان پر رہا۔ ۳۰ر جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے مجھے بلایا اور لکھنؤ بھیج دیا۔

فضل حق ایک دوسرے شخص کا نام ہے۔ اس کے بدلے میں مجھے گرفتار کیا گیا ہے وہ آج کل فیروز شاہ کے ساتھ ہے۔ وہ آنولہ کا تحصیلدار تھا۔ اور خان بہادر خاں اور بیگم کی ملازمت میں تھا۔ وہ سید ہے اور شاہجہاں پور کا رہنے والا ہے۔"

مولانا کے بیان کے بعد ۵ گواہانِ صفائی قادر بخش، نبی بخش، علی محمد خاں، ممتو خاں اور احمد علی خاں کے بیانات ہوئے جن میں قیام خیر آباد اور باغیوں سے بے تعلقی پر

زور دیا گیا تھا۔ اور مولانا پر قائم کئے گئے الزامات کو دوسرے فضل حق شاہجہاں پوری سے متعلق بتایا گیا تھا۔

کیپٹن ایف۔ اے۔ وی تھربرن نے استغاثہ، ملزم اور گواہان صفائی کے بیانات کے بعد ۲۸ فروری ۱۸۵۹ء کو حسب ذیل فردجرم مرتب کر کے مقدمہ جوڈیشل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔

فردجرم بغاوت

نکتہ ۱:۔ ملزم نے بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی ممو خاں کی کونسل میں حصہ لیا۔ اس طرح باغیوں کا خود بھی سردار رہا۔ اور بغاوت پر لوگوں کو آمادہ کرتا رہا۔

نکتہ ۲:۔ بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں جب کہ ممو خاں کے مشیر کی حیثیت سے کام کیا تو سازشِ قتل کی عبدالحکیم جو سرکاری ملازم تھا اس کے قتل کا مشورہ دیا۔

وضاحت:۔ ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو مئی ۱۸۵۸ء میں باغیوں نے گرفتار کر کے بیگم اور ممو خاں کے پاس بھیجا۔ جو ان دنوں قلعہ بوندی اور اس کے گرد و نواح میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ عبدالحکیم کے ساتھ ہی ایک اور شخص مرتضیٰ حسین بھی گرفتار ہوا تھا جو اگرچہ سرکاری ملازم تو نہیں تھا لیکن انگریزوں کا وفادار تھا۔ اس لئے باغیوں میں مبغوض تھا۔ جب یہ دونوں ممو خاں کے سامنے پیش ہوئے تو ملزم نے جو وہاں موجود تھا قرآن کی آیتیں پڑھیں۔ اور یہ رائے ظاہر کی کہ یہ دونوں موت کے مستحق ہیں۔ شہادت سے ثابت ہے کہ ملزم کا ممو خاں پر بہت اثر تھا۔ ملزم اس کا مشیر اور باغی فوج میں گویا سرغنہ تھا۔ اس نے اپنے اثر و رسوخ کو عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین کے خلاف استعمال کیا۔ مگر کہ یہ دونوں قید سے رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے بجز یہ ممکن نہ تھا۔ اگر ممو خاں نے ملزم کو مولوی احمد اللہ شاہ کی جائداد ضبط کرنے کو نہ بھیجا ہوتا۔

لکھنؤ

۲۸-۲-۵۹ء

بعدالت لکھنؤ مورخہ ۱، ۲، ۴، مارچ ۱۹۵۹ء

بہ اجلاس لیفٹیننٹ جی کیمبل جوڈیشل کمشنر آف اودھ و میجر بیرو۔ سی۔ ایم آئی فنانشل کمشنر آف خیرآباد ڈویژن۔

مولوی فضل حق پر مندرجہ ذیل الزامات عائد کئے گئے۔

بغاوت اور قتل کی سازش

نکتہ ۱: ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغی سرکار کی حیثیت میں دہلی، اودھ اور دوسری جگہوں پر بغاوت اور قتل میں مدد دی۔

نکتہ ۲: بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سردار ممو خاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے نمایاں کام انجام دیا۔

نکتہ ۳: بوندی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں ملازم عبدالحکیم سرکار انگلشیہ کے خلاف سازشِ قتل کی۔ قیدی نے خود کو مجرم نہیں مانا۔ مقدمہ کی کارروائی ہوئی۔

عدالت نے قیدی کو مندرجہ ذیل وجوہ پر مجرم قرار دیا

۱۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں بغاوت کی سازش کی۔ اور ایسے اصولوں کی اشاعت کی جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔

۲۔ بوندی میں ۱۸۵۸ء میں باغیوں کی کونسل میں خاص کام انجام دیئے۔ خاص طور پر باغی سردار ممو خاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے اس نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی، جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔

۴ مارچ کو مجرم کو عمر قید بعبور دریائے شور بحیثیت قیدی سرکار انگلشیہ اور ضبطیٔ جائداد کی سزا دی گئی۔

لکھنؤ۔ ۴ مارچ ۱۸۵۹ء

تشریح

اس شخص (فضل حق) کے مقدمہ کو دو حصوں میں منقسم کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ شخص ۱۸۵۸ء میں باغی سردار کے مشیر خاص کی حیثیت سے مانا جاتا تھا۔ دہلی میں اس کے

تعلقات تھے۔ دہلی کے کمشنر کے خط کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقریباً وہی رویہ یہاں بھی رکھا تھا۔ اس مقدمے کا جہاں تک دہلی سے تعلق ہے وہ ثابت نہیں کیا جا سکا کیونکہ گواہیاں نہیں پیش کی جا سکیں۔ اور مجرم کو اس بات کا موقعہ نہیں ملا کہ وہ الزامات کو قبول کر سکے یا انہیں جھٹلا سکے۔ بلکہ چونکہ اس شخص کے خلاف اودھ کے الزامات ثابت کئے جا چکے ہیں۔ اس لئے اس کا رویہ دہلی میں بھی کم و بیش اسی قسم کا اخذ کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل الزامات اس ملزم پہ عائد کئے گئے :۔

(۱) پوری بغاوت کے دوران اس شخص نے عام طور پہ لوگوں کو اکسایا اور

(۲) خاص طور پر اودھ میں ۱۸۵۷ء میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔

پہلے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عدالت کے لئے ملزم کو قتل کے لئے اکسانے کے الزام پر سزا دینا ممکن نہ ہو گا۔ کیونکہ جن لوگوں کے لئے یہ کہا جاتا تھا کہ ملزم نے انہیں قتل کرانے کی کوشش کی۔ وہ واقعتہً قتل نہیں کئے گئے۔ اور یہ بات بھی بالکل واضح نہ ہوئی تھی۔ کہ ملزم نے انہیں کچھ شرائط پر چھوڑ دیا ہو مگر پھر بھی عدالت کا یہ خیال ہے کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ملزم نے اس موقع پر بالکل صریحاً اور اپنی سرکاری حیثیت میں کچھ ایسے اصول کی اشاعت کی جن سے لوگ قتل کے لئے آمادہ ہوئے۔ اس نے قرآن سے اقتباسات پیش کئے۔ اور یہ کہا کہ جو لوگ سرکار انگلشیہ کی ملازمت میں رہ چکے ہوں۔ وہ ملحد ہیں۔ اور یہ کہ اسلامی قانون کے اعتبار سے ان کی سزا موت ہے۔ اور اس نے یہاں تک کہا کہ اگر باغی سردار نے یہ سزا سرکار انگلشیہ کے نوکروں کو نہ دی تو وہ خود خدا کی نگاہ میں گنہگار ہو گا۔

عدالت نے شبہ کی بنا پر ملزم کو اس الزام سے بری کیا۔ کہ ملزم نے سزائے موت کے بدلے سرکار انگلشیہ کی نوکری چھوڑنے کو کہا ہو لیکن یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ ملزم نے جن اصولوں کی اشاعت کی تھی ان سے ایسے خونی مناظر دیکھنے میں آئے جو بغاوت کے جزوِ خاص تھے اور تمام گواہوں کے بیانات سے عدالت یہ سمجھتی ہے کہ ملزم ایک مشیر اور بغاوت کو اکسانے والا شخص تھا۔ اس نے اپنا یہ رویہ دہلی میں بھی رکھا۔ اور یقیناً وہ اودھ

میں اس جرم کا مرتکب تھا۔ اس نے ایک بار اس بات کی بھی کوشش کی کہ وہ یہ بات ثابت کر سکے کہ وہ فضل حق ہیں، جو کہ اودھ کی بغاوت میں منسلک رہے تھے مگر یہ بات بالکل صاف ہے کہ ایک تحصیلدار بریلی تھا، جو کہ بعد کو باغیوں کے ساتھ ایک جتھے کا لیڈر تھا جب کہ ملزم بالکل مختلف شخص ہے۔ یہ شخص کبھی جتھے کے ساتھ نہیں رہا۔ اور کبھی اس نے تلوار ہاتھ میں نہیں لی۔ یہ شخص باغی سردار کے دربار میں تھا، اور باغیوں کی عدالت عالیہ کا سب سے زیادہ با اثر ممبر تھا۔ یہ بات مشتبہ ہے کہ آیا یہ عدالت واقعی کوئی حیثیت رکھتی تھی۔ اور آیا ملزم اس عدالت میں کوئی مستقل مقام رکھتا تھا۔ لیکن یہ بات بالکل ثابت ہو چکی ہے کہ کچھ لوگ بیگم اور باغی سردار کو مشورہ دیتے رہتے تھے، اور باغیوں کے کیمپ میں انھیں اہل شوریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس مجلس کو کبھی کبھی انگریزی نام کچہری پارلیمنٹ بھی کہا گیا ہے۔ اسی مجلس کا ملزم ایک سرگرم اور سربراہ لیڈر تھا۔

براہ راست شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملزم کو ممو خاں کا اعتماد حاصل تھا اور یہ کہ ملزم سے براہ راست ممو خاں مشورہ لیا کرتا تھا، اور اس موقع پر ملزم نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی جن سے قتل کے امکانات ہو سکتے تھے۔

قیدی، ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بہت عقلمند شخص ہے جس نے طاقت اور مشہور ہونے کی ہوس میں یا بے انتہا شدید باتوں سے اثر انداز ہو کر باغیوں کی مجلس میں اپنی اس قدر اثر انداز جگہ بنالی تھی۔ وہ ایک بہت خطرناک ہستی ہے۔

وہ کسی بھی وقت لامحدود نقصانات پہنچا سکنے کا اہل ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کا ہندوستان سے ہٹا دیا جانا انصاف اور امن کے لئے ضروری ہے۔ وہ اودھ کا رہنے والا ہے مگر ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو سب کچھ کے لئے سرکار انگلشیہ کے مرہون منت رہے ہیں۔ اور وہ بذات خود سرکار انگلشیہ میں ایک اچھی حیثیت رکھتا تھا مگر اس نے بہت دنوں سے سرکار انگلشیہ کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اور بالذات جگہوں پر اودھ اور الور کی ریاستوں پہ مامور رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک مشہور انسان رہا ہے اور جن گواہان نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا، انھوں نے بھی مولوی فضل حق کے متعلق پہلے سے بہت کچھ سن رکھا

تھا۔ وہ خود سے دہلی آیا۔ اور اس نے تب ہی سے بغاوت میں حصہ لینا شروع کیا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جسے بہت سخت سزا دینا چاہیئے - اور جسے بہت احتیاط سے ہندوستان الگ کر دینا چاہیئے لیکن اس کی ضعیف عمر اس کی زندگی میں پوزیشن اور اس کے اودھ کے باشندے اور کئی برس تک مختلف دیسی ریاستوں میں کام کرنے کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ مناسب سمجھا ہے کہ وہ ایک سرکاری قیدی تصور کیا جائے نہ کہ ایک معمولی مجرم۔

وارنٹ نمبر ۱۴ - ڈپٹی کمشنر لکھنؤ۔

فضل حق ولد فضل امام کو مجرم گردانا گیا۔ بوجہ اکسانے بغاوت کے۔ اور بوجہ اشاعت ایسے اصولوں کے جن سے قتل کے حالات پیدا ہو سکتے تھے۔ اور بوجہ باغیوں کی کونسل میں حصّہ لینے کے اسے عمر قید بعبور دریائے شور بغیر مشقت کی سزا دی گئی۔ لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مندرجۂ بالا سزا کو فضل حق ولد فضل امام پر عمل میں لایا جائے۔ اور یہ کہ تم اس وارنٹ کو جب کہ اس پر عمل درآمد ہو چکے تو اسے اپنے سرکاری مہر اور دستخطوں کے تحت یہ بتلاتے ہوئے کہ مندرجۂ بالا سزا کس طرح عمل میں لائی گئی واپس کر دو۔

۱۵۳ ۱۸۶۱ء

از طرف کرنل بے کلارک کمشنر و سپرنٹنڈنٹ خیرآباد ڈویژن۔
بنام جی کیمپل اسکوائر جوڈیشل کمشنر اودھ۔
سیتاپور - ۳۰ جولائی ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

مجھے آپ کے حضور میں مندرجہ ذیل کاغذات پیش کرتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے۔ بہ زبان ہندوستانی کمشنر لکھنؤ کی پروسیڈنگ مورخہ ۲۲ جولائی ۱۸۶۱ء معہ منسلکہ کاغذات کیونکہ فضل حق کے مقدمے کا تبادلہ لکھنؤ کر دیا گیا تھا (جنوری ۱۸۵۹ء میں) اس کا مقدمہ کیپٹن ہٹز بمرن کے اجلاس میں پیش ہوا تھا جو میرا خیال ہے آپ کا special assistant تھا۔

آپ کا فرماں بردار خادم
کمشنر و سپرنٹنڈنٹ خیرآباد ڈویژن۔

نمبر ۴۸۰ ۔ بنام سکریٹری چیف کمشنر اودھ لکھنؤ ۔ مورخہ ۳ اگست ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

کنارے پر نوٹ کی ہوئی خط و کتابت کے حوالے سے جو کہ فضل حق کے مقدمے سے متعلق ہیں فضل حق کو میں نے بغاوت کے اکسانے وغیرہ کے جرم میں مئی ۱۸۵۹ء میں عمر قید بعبور دریائے شور (قید بغیر مشقت) کی سزا دی تھی ۔ میں آپ کے حضور میں خیرآباد کے کمشنر سے وصول شدہ ورناکولر کاغذات بسلسلہ مقدمہ ہذا پیش کر رہا ہوں! اور استدعا کرتا ہوں کہ ان کاغذات کو چیف کمشنر کی خدمت میں پیش کیا جائے ۔ تاکہ ان پر احکام دے سکیں جو وہ ضروری اور مناسب سمجھتے ہوں ۔

میں ہوں آپ کا مخلص
جوڈیشل کمشنر ۔

روداد:-

ڈاکٹ نمبر ۳۲۲ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۸۵۹ء سکریٹری کا دفتری کاغذ نمبری ۶۵۶ مورخہ ۲۸ اپریل جو میرے پتے پر بھیجا گیا یمنٹ نمبری ۶۵۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۵۹ء

نمبر ۱۹۷۵ ۔ ازطرف سکریٹری چیف کمشنر اودھ

بنام جی کیمپبل اسکوائر جوڈیشل کمشنر اودھ ۔

لکھنؤ ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

بحوالہ آپ کے خط نمبری ۴۸۰ مورخہ ۳ اگست مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں عرض کروں کہ [illegible] چیف کمشنر نے آپ کے اوپر حوالہ دیئے ہوئے مراسلہ کو دیکھا اور وہ سخت مخالفت کریں گے ۔ اگر منشی فضل حق کے سلسلے میں کچھ بھی رعایت کی گئی

۲ ۔ جو ورناکولر کاغذات آپ کے مراسلے کے ساتھ منسلک تھے وہ واپس کئے جا رہے ہیں ۔

میں ہوں آپ کا فرماں بردار خادم
سکریٹری چیف کمشنر اودھ ۔

گورنمنٹ کے حکم مورخہ ۲۰ر اپریل ۱۸۵۹ء سے اقتباس :۔

فضل حق کے سلسلے میں His Excellency in Council کی یہ خواہش ہے، کہ قیدی کی شخصیت اور عمر کو مدّنظر رکھتے ہوئے کوئی سختی اس پر اس طرح نہ کی جائے جو اس کی عمر کے منافی ہو۔　　　　اصل اقتباس جوڈیشل کمشنر اودھ۔

مندرجہ ذیل قیدی واسطے عمر طبعی مسمّیٰ فضل حق ۳۶۸۷ Penal Settlement پورٹ بلیر پر ۸ر اکتوبر کو بذریعہ اسٹیمر Frir Queen براہ کلکتہ وصول کیا گیا۔

دستخط سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر۔

پوری مسل پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ علامہ خیر آبادی کو دہلی اور اودھ کی سرگرمیوں کی بنا پر پھانسا گیا تھا اور فضل حق شاہجہاں پوری کے الزامات، ہمنامی کی وجہ سے لگا کر مجرم گردانا گیا تھا۔ سوءِ اتفاق سے عبدالحکیم سرکاری ملازم اور مرتضیٰ حسین خیرخواہ برطانیہ سے جو دونوں شیعی تھے علامہ سے کسی وقت قرآنی آیات پر مباحثہ ہو گیا تھا۔ ان کی جھوٹی شہادتوں پر عدالت نے سزا کا فیصلہ کر دیا۔ برطانوی حکومت کی یہ پالیسی آخر عہد تک رہی۔ اور آج بھی ان کے سرکاری شاگرد قانونی گرفت میں لانے کے لئے یہی داؤ پیچ کھیلتے رہتے ہیں جس کی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

اس مباحثہ کے متعلق علامہ الثورۃ الہندیہ میں لکھتے ہیں :۔

"میری چغلی ایسے دو مرتد جھگڑالو اور تند خو افراد[۱] نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودّت و محبت پر مصر تھے انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔"

اس مقدمہ میں علامہ کو ممو خاں کا مشیر اور ربوبندی کے قیام میں اس پر اثر انداز ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ ممو خاں کے متعلق علامہ الثورۃ الہندیہ میں یہ اظہار رائے کر رہے ہیں :۔

"یہ تمام امور مہمہ اور ان کا اہتمام و انصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل[۲] کو سونپا گیا تھا جو

---

[۱] عبدالحکیم شیعی و مرتضیٰ حسین شیعی۔ [۲] ممو خاں۔

کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ وہ صحیح مشوروں سے گریزاں اور جہل سے ہمکنار تھا۔ آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا وہ ذلیل احمق اور بزدل تھا اس نے مکالمت اور مشاورت، مجالست اور منادمت کیلئے احمق جاہل اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا وہ نخوت و غرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب و حاکم بنانا۔ چنانچہ اس ناتجربہ کار نے لشکروں پر کمین، بزدل، ذلیل اور رذیل، لوگوں کو سردار بنا دیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے۔“

غور فرمایئے جس مموخاں کے متعلق علامہ کی یہ رائے ہو اس کے مشیر کیسے بن سکتے تھے۔ علامہ نے اس مقدمہ میں جو بیان دیا ہے اس کا تجزیہ کرنے سے ہمارے اس دعوے کی پوری تائید ہوتی ہے کہ علامہ کا دوران بغاوت دہلی میں موجود ہونا اور بغاوت میں بڑی حد تک سرگرمی سے رہنمائی کرنا کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔

حکومت کا دستور العمل مرتب کرنا، فتوئے جہاد مرتب کرنا اور تقاریر کرنا، ان سب باتوں کا ثبوت اپنے مقام پر ملاحظہ کیا جائے۔

علامہ عدالت کے سامنے اپنے بیان میں فرماتے ہیں:۔

”میں الور کے راجہ کی ملازمت میں تھا، میں ان کے ساتھ ۵ سال رہا۔ اور بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجہ (بنے سنگھ) کی موت کے ایک ماہ بعد تک میں الور میں رہا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں میں نے الور چھوڑ دیا۔ میں نے دہلی کے لئے کوچ کیا۔ وہاں ۱۵ دن رہا۔ اور پھر الور لوٹ آیا۔ میں نے اپنا خاندان الور ہی میں رہنے دیا تھا۔ میں اپنے گھر رہا تھا۔ اور میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا۔“

یہ ملحوظ رہے کہ یہ عدالتی بیان ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کے ساتھ الفاظ کا استعمال ہوا ہے جس سے علامہ کی بے پناہ ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ کہ بات سچی بھی ہو اور مقدمہ پر اثر انداز بھی نہ ہو۔ مثلاً یہ جملہ کہ ”میں ان (راجہ) کے ساتھ ۵ سال رہا۔“ یعنی ان کی ملازمت میں ۵ سال رہا۔ اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ شبانہ روز ان کے ساتھ رہا۔ اور ان سے کسی وقت علیحدہ نہیں ہوا۔ دوسرا جملہ ”بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔“

کتنی سچی بات ہے۔ بغاوت وسط مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی۔ جوں ہی اس کی اطلاع ملی علامہ اہل خانہ کو الور چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ اور سرگرمی سے بغاوت کی رہنمائی اور حکومت کے دستور العمل کی ترتیب شروع کر دی۔ جولائی میں جنرل بخت خاں کے دہلی آنے پر فتوئے جہاد مرتب کر کے علماء کے دستخط کرائے۔ اسی درمیان راجہ الور بنے سنگھ[1] کی خبر رحلت پر الور چلے گئے۔ تقریباً ایک ماہ میں واپس دہلی آ گئے۔ پھر ۱۵ یوم دہلی میں قیام کر کے الور آ گئے۔ اور اپنے اہل و عیال کو لے کر اوائل ستمبر میں دہلی آ گئے۔ وسط ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔[2]

بادشاہ اور اس کے متعلقین مقبرۂ ہمایوں میں اقامت گزیں ہو گئے۔ علامہ بھی دہلی کو خیر اباد کہہ کر خیر آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ الثورۃ الہندیہ میں فرماتے ہیں:۔

"جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکری و شہری باقی نہ رہا۔ غلہ اور پانی دشمنوں کے ظلم و استبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا۔ تو شبانہ روز اسی حالت میں گزار کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں، مال و اسباب چھوڑ کر (بار برداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔"

علامہ اس سفر میں ریاست بھیکم پور ضلع علی گڈھ پہنچ کر نواب عبد الشکور خاں شروانی (عم محترم نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن شروانی) کے کچھ دن مہمان بھی رہے جس کی تفصیل پچھلے صفحے میں دی جا چکی ہے۔ اس طرح وطن مالوف خیر آباد خاصے عرصے کے بعد پہنچے۔

بیان میں فرمایا "میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی" یقیناً اس مدت میں کہیں ملازم نہیں رہے پھر فرمایا "نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا" کتنی سچی بات ہے۔ علامہ تو مجاہدین سے ملے تھے۔ مغلیہ حکومت کے تو انگریز باغی تھے۔ علامہ تو مجاہدین کے سربراہ تھے۔ انگریزوں اور ان کے حواریوں سے ملنے کا سوال ہی کیا تھا۔

جنوری ۱۸۵۹ء میں علامہ کو خیر آباد سے گرفتار کر لیا گیا۔ اور فروری ۱۸۵۹ء میں ابتدائی عدالت سے سزا دیدی گئی۔ اور مارچ ۱۸۵۹ء میں عدالت عالیہ سے اس کی توثیق کر دی گئی۔

---

[1] راجہ بنے سنگھ کا انتقال ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ [2] ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء

یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھئے کہ مقدمہ میں براہ راست عدالتی بیان علامہ کا ذاتی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی درخواستیں یا اپیلیں ہیں وہ سب علامہ کے اخلاف و وکلاء مقدمہ کی کارگزاریاں ہیں جس کی تائید مرزا غالب کے خط بنام یوسف مرزا سے بھی ہوتی ہے:۔

> "مولانا فضل حق کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا، کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کردو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا لڑکا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اپیلوں اور درخواستوں سے علامہ کا ذاتی طور پر تعلق نہ تھا اس لئے یہ کہنا کہ "علامہ رہائی کے لئے آخر دم تک کوشش کرتے رہے اور ہمت نہیں ہارے۔" سراسر الزام اور ناانصافی ہے۔ علامہ نے جو کچھ مانگا اپنے رب سے مانگا جس کی شہادت الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند سے ملتی ہے۔

اب آئیے لائق صد احترام مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور محترم بزرگ جناب مالک رام کے ان مضمونوں پر نظر ڈالیں۔ جو ماہنامہ تحریک دہلی میں اگست ۱۹۵۷ء اور جون ۱۹۶۰ء میں علی الترتیب شائع ہوئے ہیں جن سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ علامہ کا جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہ تھا۔ یہ دونوں بزرگ راقم الحروف کے دیرینہ کرم فرما اور مشفق و مخلص رہے ہیں۔ ان پر قلم اٹھانا یا حرف گیری کرنا شائستگی کے خلاف تھا۔ مگر یہ دونوں بزرگ جب اپنے سے بزرگ تر شخصیت پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"۔

محترم عرشی صاحب نے اپنے ۸ صفحات پر مشتمل مضمون میں علامہ کی جہاد آزادی میں عدم شرکت کی تین بنیادیں قائم کر کے طبع آزمائی فرمائی ہے۔

(۱) علامہ کا اگست سے قبل دہلی میں نہ ہونا۔ (۲) فتویٰ جہاد آزادی مشمولہ سو تنتر دہلی (۳) نواب رامپور کے نام علامہ کی درخواست۔

---

[1] اردوئے معلیٰ۔

(۱) اب پہلی بات یعنی اگست سے قبل علامہ کے دہلی میں نہ ہونے کی بنیاد "باغی ہندوستان" کی اس عبارت کو بنایا گیا ہے کہ :۔

"علامہ الور سے نثر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے"۔

نیز منشی جیون لال کے ۱۶ اگست کی اس خبر کو کہ :۔

"مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔"

میں دیباچہ میں لکھ چکا ہوں کہ باغی ہندوستان کی ترتیب ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ اوائل ۱۹۴۷ء میں مطبع مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوئی۔ اس وقت تک جو مواد میسر آسکا تھا اسی پر انحصار کرنا پڑا تھا۔ آزادی کے بعد جو مواد دستیاب ہوا اس کی بنا پر ثابت ہوتا ہے کہ علامہ "غدر" شروع ہوتے ہی دہلی پہنچ گئے تھے۔ محترم عرشی صاحب جیسے محقق کو تو "باغی ہندوستان" کے نظریہ کی تغلیط کرنی تھی۔ نہ کہ اسی کو بنیاد بنا کر عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔

محترم عرشی صاحب نے باغی ہندوستان کی اشاعت کے پورے دس سال کے بعد مضمون تحریر فرمایا تھا۔ پورا موقع ملا تھا کہ اپنی محققانہ جودتِ طبع کو کام میں لاتے۔

ابر تھا، بجلی تھی، سورج زیرِ کوہِ قاف تھا
زلفِ شبگوں رخ سے سرکائی تو مطلع صاف تھا
داغ

اب ہمارے دعوے کو اس کسوٹی پر جانچئے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں :۔

"مولوی صاحب (فضل حق) عالم متبحر مشہور تھے۔ وہ الور سے ملازمت ترک کر کے دہلی آئے تھے انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا جس کی ایک دفعہ یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عمل داری میں ذبح نہ ہو۔"[1]

جیون لال کا بیان ہے کہ یہ دفعہ ۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو نافذ کر دی گئی۔[2]

ایک انگریز رابرٹ لکھتا ہے :۔

اس خاص موقعہ (عیدالاضحی) پر ہندوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے قربانی ملتوی کر دی گئی

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ جلد ۵ صفحہ ۶۸۷ ۔ [2] غدر کی صبح و شام صفحہ ۱۶۳

اور اس کی جگہ فرنگیوں کو ختم کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں کی زبردست متحدہ کوشش ہو رہی ہے‘‘۔[1]

مولوی ذکاء اللہ کی تحریر اور دوسرے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ علامہ نے حکومت کا دستور العمل مرتب کیا تھا۔ اس دستور العمل کی ایک دفعہ کورٹ کے قیام کی بھی تھی جسکے قواعد بھی علامہ نے بنائے تھے۔ جس کا عکس ”سونتر دہلی“ میں موجود ہے۔ اور ”فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون“ میں بھی، شائع ہو چکا ہے۔

دستور العمل تیار کرنا اصحاب رائے اور بادشاہ کی منظوری حاصل کرنا اور پھر اس کا نفاذ اس کے لئے دو تین ماہ کا عرصہ کچھ زیادہ مدت نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ جولائی سے بہت پہلے دہلی میں موجود تھے۔ نہ صرف بقر عید بلکہ عید بھی دہلی میں ہی کی ہو گی۔ جو اواخر مئی ۱۸۵۷ء میں ہوئی تھی۔

(۲) اب محترم عرشی صاحب کی دوسری بنیاد فتویٰ جہاد آزادی کو لیجئے۔ آپ نے کتاب ”سونتر دہلی“ کے عکس فتویٰ مطبوعہ صادق الاخبار دہلی منقولہ از اخبار الظفر دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو نقل کر کے تحریر فرمایا ہے۔ کہ اس پر مولانا فضل حق کے دستخط نہیں جب کہ دیگر ۳۳ علماء کے دستخط ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

”چونکہ یہ فتویٰ مولانا کے ورودِ دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا۔ اس لئے اس پر مولانا خیر آبادی کے دستخط نہیں ہو سکتے تھے۔“

اس فتویٰ پر تاریخ نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکتا کہ اشاعتِ اخبار سے کتنے عرصے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مئی کے وسط میں ترتیب دیا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی فتویٰ کے متعلق علامہ نے ”الثورۃ الہندیہ“ میں لکھا ہو۔

”یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا۔ کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء و زہاد اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال و قتال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔“

---

[1] جنگ آزادی ص۱۹۱ خورشید مصطفیٰ۔

محترم عرشی صاحب نے اسی ایک فتوے پر انحصار کر کے حکم لگا دیا کہ چونکہ اس فتوے پر علامہ کے دستخط نہیں ہیں اس لئے علامہ خیر آبادی کا فتویٰ جہاد سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

یہ فتویٰ، جہاد کے فرض عین اور فرض کفایہ کے استفسار کے جواب میں ہے۔ غالباً علامہ نے اسی کے متعلق جملہ "جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر" سے اشارہ کیا ہے۔

یہ فتویٰ صادق الاخبار دہلی میں ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو شائع ہوا۔ اخبار الظفر دہلی سے نقل ہوا ہے۔ اخبار الظفر دہلی میں کب چھپا اور کب ترتیب دیا گیا اس کا کچھ پتا نہیں۔ ہمیں محترم عرشی صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "یہ فتویٰ مولانا کے ورودِ دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا" مگر ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں کہ یہی وہ فتویٰ ہے جو جنرل بخت خاں نے مرتب کرایا تھا اور یہ کہ علامہ کا ورود دہلی اگست سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ جب شروع جولائی میں جنرل بخت خاں دہلی پہنچے تو علامہ وہیں موجود تھے۔

یہ فتویٰ جنرل بخت خاں کے ورود دہلی سے قبل لکھا جا چکا تھا۔ بقول مولوی ذکاء اللہ "جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا جہاد کے فتوے کا چرچا بہت کم تھا۔" وہ یہی فتویٰ تھا جو صادق الاخبار میں شائع ہوا ہے۔ اب آپ مولوی ذکاء اللہ کی پوری عبارت پڑھئے:

> "جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا، جہاد کے فتویٰ کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ مساجد میں منبروں پر جہاد کا وعظ کمتر ہوتا تھا۔ . . . مگر جب بخت خاں جس کا نام اہل شہر نے کم بخت خاں رکھا تھا۔ دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہوگی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں ان کی کرالیں لیکن مولوی محبوب علی و خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں[1]

جنرل بخت خاں بڑی سلیقہ مندی اور ہوشیاری سے شروع جولائی میں دہلی آیا۔[2]

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ جلد ۵ ص ۶۷۵ ۔ [2] ایضاً ص ۶۸۱ ۔

مولوی ذکاء اللہ کے مذکورہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ دو فتوے تھے ایک وہ جس کا چرچا شہر میں بہت کم تھا اور جس پر مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین کے بھی دستخط ہیں۔ اور یہ فتویٰ وہی ہے جو جنرل بخت خاں کے دہلی پہنچنے سے پہلے دیا گیا تھا۔ اور جس کا عکس سوتنتر دہلی میں شائع ہوا ہے۔ اسی کا ذکر الثورۃ الہندیہ میں علامہ نے کیا ہے۔

اب باغی ہندوستان کی عبارت پر نظر ڈالیے۔

"علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کر دیئے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔[1]

غور فرمائیے باغی ہندوستان میں جتنے نام دیئے گئے ہیں ان میں سے مفتی صدر الدین کی مہر اور مولوی عبد القادر کے سوا کسی عالم کے دستخط صادق الاخبار کے فتوے پر نہیں۔

علامہ کے فتوے پر مفتی صدر الدین کے دستخط کے بعد شہادت بالجبر[2] کے بھی الفاظ تھے۔ جس کی تائید مولوی ذکاء اللہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ مہر جبر سے کی گئی تھی۔

محترم عرشی صاحب نے اپنے مضمون میں لغوی اعتبار سے اسے غلط قرار دیا ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے عرشی صاحب کی بات مان لیتے ہیں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جہاں "جعلی" مہر کی ہو وہاں یہ جملہ بھی لکھ دیا ہو تاکہ بوقت گریز یہ کہہ سکیں کہ مجھ جیسا فاضل غلط جملہ کیسے لکھ سکتا ہے۔ محترم عرشی صاحب رسالہ تحریک دہلی کے اسی مضمون میں اعتراف کر رہے ہیں "بقیہ نے مجبوراً توثیق کی شکست کے بعد جان بچانے کی صرف یہی ایک تدبیر باقی تھی کہ جبر کی پناہ لی جائے۔ اس بنا پر جس سے باز پرس ہوئی اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ دو فتوے ہیں۔ اخبار الظفر دہلی کا فتویٰ وہ ہے جو جنرل بخت خاں

---

[1] باغی ہندوستان مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ص ۱۵۶، ۱۵۷۔ [2] شہادت بالجبر کے راوی علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری ہیں بیقین درس مولانا مفتی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی بھی بوقتِ روایت موجود تھے۔ جو بفضل خدا بقید حیات ہیں۔

کے ورود دہلی سے قبل لکھا گیا تھا۔ اور بقول مولوی ذکاء اللہ اس کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ اس کے مجیب نور رجال تھے۔ دوسرا فتویٰ وہ ہے جو جنرل بخت خاں کی موجودگی میں لکھا گیا اور جسے علامہ خیرآبادی نے مرتب کیا۔ تیسرے فتوے کا ذکر سر سید احمد خاں نے اسباب سرکشی ہندوستان میں کیا ہے جسے انھوں نے خود دیکھا تھا جو عدم وجوب جہاد کا آئینہ دار تھا۔

"شہادت بالجبر" کے سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی گوپاموی لکھتے ہیں:۔

"پیروی مقدمہ میں جواب دعویٰ یہ کیا۔ میں نے فتوے پر دستخط کئے مگر کچھ عبارت بھی لکھ دی ہے۔ بالجبر لوگ پڑھتے ہیں وہ بالجبر میں نے لکھا ہے۔ مفسدوں نے زبردستی مجھ سے لکھوایا تھا۔ کاغذات برآمد ہوئے تو پڑھا گیا۔ مفتی صاحب کے بیان کی تصدیق ہوئی۔ اس بنا پر چھوڑ دیئے گئے۔[1]

۳۔ تیسری بنیاد عرضی بنام نواب رامپور کو لیجئے۔

یہ عرضی علامہ خیرآبادی کی مہر سے مزین ہے۔ اور ۱۸ فروری ۱۸۵۹ء کی مرقومہ ہے۔ اس عرضی کی بنا پر محترم عرشی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولانا پر حسب ذیل تین الزام عائد کئے گئے تھے:۔

(الف) نواب خاں بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

(ب) جب انگریزوں نے بریلی فتح کر لی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر ادھر پہنچے اور رمضان علی خاں کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار مقرر ہوئے۔

(ج) مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔"

مقدمہ کی پوری کارروائی درج کی جا چکی ہے۔ ان میں سے کوئی الزام علامہ پر عائد نہیں کیا گیا۔ علامہ ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو گرفتار کر لئے گئے۔ بغاوت کے قیدی مجرم تھے الثورۃ الہندیہ میں فرماتے ہیں:۔

---

[1] غدر کے چند علماء ص ۵۲

"میرا جوتا اور لباس اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم و بہتر بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالے کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیے گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالا اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔" انصاف کیجیے۔ ایسی حالت میں مہر رکھنے کی اجازت دے دی گئی ہوگی یا کاغذ اور قلم دوات مہیا کر دیا ہوگا کہ علامہ عرضی لکھ کر مہر لگا کر نواب رامپور کو بھیج دیں۔ اور وہ بھی جب کہ اس کے دو دن کے بعد ہی ۱۲ر فروری کو مقدمہ شروع ہو رہا ہو۔ پھر لکھنؤ سے رامپور تک عرضی پہنچنے میں اس زمانے میں کتنی مدت لگی ہوگی۔

یہ عرضی رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ میری دیکھی ہوئی ہے نہ علامہ کا رسم الخط ہے نہ طرز بیان اور نہ ہی اس پر دستخط ہیں۔ آخر دستخط کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟ اصل چیز دستخط ہوتے ہیں مہر تو تائید میں ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ۱۸ دن میں علامہ نے تابڑ توڑ ۳ عرضیاں روانہ کیں۔ جن میں سے دو بقول عرشی صاحب ضائع ہو گئیں۔ یہ تیسری اور آخری عرضی ہاتھ لگی۔ ریاستی محافظ خانہ کی داد دیجیے کہ اس نے ایک عرضی جناب عرشی صاحب کی تعمیر عمارت کے لیے سنگِ بنیاد بنا کر محفوظ رکھی۔ اس عرضی پر بنیاد قائم کر لینا عرشی صاحب جیسے محقق سے باعثِ تعجب ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کیا گیا۔ کہ دونوں بزرگوں (محترم عرشی صاحب اور محترم مالک رام صاحب) نے علامہ خیر آبادی کی جہاد آزادی میں شرکت سے ہی انکار کر دیا۔

انھیں کو آج میرا ذکر سن کر طیش آتا ہے
ہمیشہ جن کی خاطر کیں چمن آرائیاں میں نے

قدیم و جدید مؤرخین کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں فیصلہ اربابِ نظر خود فرمائیں گے

غمِ زندگی کی حکایتیں بھی شریکِ جرم و خطا نہ ہوں
میں سناؤں قصۂ دردِ دل اگر آپ سن کے خفا نہ ہوں

"مولوی فضل حق جب سے اودھ سے آئے ہیں وہ فوجیوں اور شہریوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں مسلسل مصروف ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے ہیں۔ اور سبزی منڈی کے پل والے محاذ پر صف آرا ہیں"۔ [1]

"مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں"۔ [2]

"مولوی صاحب (فضل حق) جب بھی بادشاہ سے ملتے وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلے میں رعایا کی ہمت افزائی کریں۔ اور ان کے ساتھ باہر نکلیں۔ اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں"۔ [3]

"بادشاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل کنگ کونسل بنائی"۔ [4]

مجلس شوریٰ دس ارکان پر مشتمل بنائی گئی تھی جس میں ۶ فوجی اور ۴ شہری تھے۔ مخبر تراب علی نے خفیہ رپورٹ دی۔

"مولوی فضل حق بھی اس کے ایک رکن ہیں"۔ [5]

"اس کورٹ کا ڈائریکٹر (نگراں) مولانا خیرآبادی کو بنایا گیا"۔ [6]

بادشاہ کی طرف سے حاصل اختیارات کے تحت علامہ نے:

حسن بخش عرض بیگی کو ضلع علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا [7]

مولانا فیض احمد بدایونی کو ضلع بلند شہر کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا [8]

مولانا عبد الحق (خلف علامہ) کا تقرر کلکٹر گوڑگانوہ کی حیثیت سے کیا گیا [9]

میر نواب (عزیز قریب علامہ) کو دہلی کا گورنر مقرر کیا گیا [10]

"جب ہنگامہ برپا ہوا تو مولوی فضل حق آئے۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ نذر پیش کی روپیہ صدقے اتارا۔ انھیں انتظام سنبھالنے کی خواہش تھی"۔ [11]

حکیم احسن اللہ خاں اپنی یادداشتوں[12] میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] اخبار دہلی رپورٹ تراب علی [2] اخبار دہلی ص ۲۴۳ فائل ۱۲۷ رپورٹ از چنی لال [3] میوٹنی پیپرز ص ۲۲ [4] دی گریٹ ریوولیشن آف ۱۸۵۷ء ص ۱۳۰ و ص ۱۸۳ [5] میوٹنی ریکارڈ جلد ۱۱ حصہ ۱۱ [6] بہادر شاہ دوم ص ۱۸۲ [7] غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط ص ۱۲۹ [8] ایضاً [9] جیون لال ص ۲۲۳ [10] ایضاً ص ۱۰۲ [11] روزنامچہ عبد اللطیف مرتبہ خلیق احمد نظامی۔ [12] مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق ص ۲۳۔

"دوسرے روز مولوی فضل حق آئے۔ اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا اب وقت کا تقاضا ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامان رسد کی مدد پہنچائی جائے۔ تاکہ انھیں کچھ سہارا ہو۔ بادشاہ نے کہا رقم کہاں ہے۔ رہا رسد کا تو وہ پہنچی تھی مگر ناکافی تھی۔ اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویّہ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا حضور کے تمام ملازمین نااہل ہیں۔ دور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے۔ میرا لڑکا (مولانا عبدالحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے۔ اور رسد بھی فراہم کریں گے۔ بادشاہ نے جواب دیا آپ تو یہیں ہیں۔ آپ انتظام سنبھالیے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔ میرے لڑکے اور دوسروں کو گوڑگانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانۂ تقرر جاری کیا جائے۔ وہ سب انتظام کریں گے اور الور، جھجر، بلب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی (رقم کے مطالبے کے) پروانے جاری کیجیے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائے گا۔ بادشاہ نے بتایا کہ پیرزادہ عبدالسلام کی درخواست پر بخت خاں نے راجہ پٹیالہ کو ایک پروانہ بھیج دیا ہے مگر ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔ مولوی صاحب نے کہا میں اپنے بھائی (فضل عظیم) کو جو راجہ کے یہاں ملازم ہیں لکھوں گا کہ وہ جلد جواب بھجوائیں۔ مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں۔ اور ان کے ساتھ باہر بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے، نہ صرف خاندان تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔"

بہادر شاہ کے مقدمہ میں حکیم احسن اللہ خاں نے شہادت دیتے ہوئے کہا:۔

"زمین داران گوڑگانوہ نے بادشاہ کو ایک درخواست ارسال کی تھی جس میں

بدنظمی کا ذکر کرکے التجا کی تھی کہ کوئی افسر نظم و نسق کے لئے مقرر کیا جائے۔ مولوی فیض الحق (فضل حق) جو الور سے آئے تھے اپنے بھانجے کا (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کی سفارش کی کہ وہ وہاں مقرر کر دیا جائے۔ کیونکہ گورنمنٹ برطانیہ کے دورِ حکومت میں وہ اس ضلع میں مقرر تھا۔ چنانچہ یہ شخص ضلع دار مقرر کیا گیا۔ مگر میں آگاہ نہیں ہوں کہ وہ گوڑگانوہ گیا یا نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ زوال دہلی کے ۱۵ ار ۲۰ روز قبل یہ تقرر ہوا تھا۔ مولوی فضل حق نے بھی کسی تحصیلدار کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا تھا،،[1]

۱۹ ر اگست ۱۸۵۷ء . . . . . .

"عبدالحق خلف مولوی فضل حق اور مولوی فیض احمد لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑگانوہ گئے،،[2]

اودھ کے چیف کمشنر کا سکریٹری، کلکٹر ہمیر پور کو ۸ ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:-

"باغی بسواں میں جو لکھنؤ سے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر ہے شکست کھاکر ۵ ر دسمبر کو گنگا فرار ہو گئے۔ . . . . . .

ان کی تعداد ۹۰۰ سوار جن میں ۴۰۰ پوری طرح مسلح ہیں اور باقی سپاہیوں کے پاس اسلحہ کافی نہیں ہے۔ ۳۰۰ پیدل وغیرہ تھے ان میں ۱۰۰ عورتیں، ۶ ہاتھی ایک توپ جس کا نام گردہ ہے۔ اس جماعت کے لیڈر فیروز شاہ شہزادہ دہلی، لکڑ شاہ، گلاب شاہ عرف پیرجی، محسن علی خاں ساکن مئو شمس آباد، فرخ آباد (جو خود کو یورپین ظاہر کرتا ہے) اور مولوی فضل حق سابق سررشتہ دار کمشنر دہلی جس کے بہت سے اعزہ اعلیٰ مناصب حکومت پر ہیں اور جس کا بھائی پٹیالہ میں راجہ ہری سنگھ کا ملازم ہے"۔[3]

یہی سکریٹری ۱۱ ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کو لکھتا ہے:-

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ صفحہ ۲۵۶ [2] بیاضِ جیون لال سوانح غدر کی صبح شام دہلی ص ۲۳۲ [3] فریڈم اسٹرگل ان اترپردیش دوم ص ۵۹۳

مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیامِ امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمنِ جان ہے، حالانکہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کئے تھے۔" ۱؎

"کچھ لوگ مولوی فضل حق کی صحیح خبر لانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ جو اپنے متبعین کے ساتھ شاہ آباد کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔" ۲؎

مشہور انگریز مصنف ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اس وقت کے صدر مدرس مولانا عبدالحق خیر آبادی کے متعلق لکھتا ہے:-

"موجودہ ہیڈ مولوی اس عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا۔ اور جنھوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحرِ ہند کے ایک جزیرے میں تمام عمر کے لئے جلا وطن کر دیئے جائیں۔ اس غدار عالمِ دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا، اب کلکتہ کالج میں موجود ہے۔" ۳؎

"ان (فضل حق) کو اس بغاوت کے سبب سے جلا وطنی کی سزا ملی تھی۔" ۴؎

علامہ کے جہادِ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کی معاصرین کی شہادتیں آپ نے ملاحظہ کریں اب جدید حوالے بھی دیکھئے:-

"۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی تو مولوی فضلِ حق نے اس بغاوت میں نمایاں حصہ لیا۔ بغاوت کے الزام میں ان پر مقدمہ چلا اور عمر قید کی سزا پائی۔" ۵؎

(علامہ فضل حق نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف سخت حصہ لیا جس کے نتیجے میں گرفتار کر کے کالے پانی بھیج دیئے گئے جہاں اس فاضلِ اجل، عالمِ بے بدل نے نہایت کس مپرسی، بے بسی اور لاچاری کی حالت

۱؎ فریڈم اسٹرگل ان اترپردیش حصہ دوم ص ۵۶۵ ۲؎ ایضاً ص ۵۱ ۳؎ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۰
(ترجمہ) ۴؎ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ص ۶۸۰ ۵؎ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۱۵ ص ۳۷۵

میں ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا۔ اور علم و دانش اور فضل و ہنر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔"[1]

"جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماء نے جو جہاد کا فتویٰ دیا اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔"[2]

"مولانا (فضل حق خیر آبادی) کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علمائے دہلی کے دستخط لئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انہی نے علماء کے نام تجویز کئے۔ جن کے دستخط لئے گئے۔"[3]

"جب برطانوی استعمار کے خلاف ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بعض شاعروں ادیبوں اور عالموں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور انگریزی حکومت کا اقتدار بحال ہو جانے کے بعد ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مولانا فضل حق کو جہاد کا فتویٰ صادر کرنے کے جرم میں انڈمان بھیجا گیا۔ صہبائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ شیفتہ کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔"[4]

"مولانا فضل حق خیر آبادی علمی قابلیت میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کو فتویٰ جہاد اور جرم بغاوت میں انڈمان بھیج دیا گیا۔"[5]

محمد اسماعیل پانی پتی مضمون "۱۸۵۷ء میں علماء کرام کا حصہ" میں لکھتے ہیں:۔

"جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو (مولانا فضل حق) فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کمانڈر انچیف افواج ظفر سے ملے

---

[1] حاشیہ مقالات سرسید حصہ ۱۶ صفحہ ۳۳۰ [2] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص۵۵ از خورشید مصطفیٰ رضوی [3] ۱۸۵۷ء کے مجاہد ص۲۰۶ از غلام رسول مہر [4] مجلہ خیال لاہور ستاون نمبر ص۳۱ [5] بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص۳۱۵ از رئیس احمد جعفری۔

اور اس کی بڑی اعانت اور امداد کی "۔ ۱؎

"مولانا فضل حق نے ایک دن بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا تو بہتوں کے لئے باعث تشویش بنا۔ اس فتوے پر مفتی صدر الدین آزردہ اور دوسرے پانچ علماء کے دستخط تھے۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جدوجہد نے ایک نیا زور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ تاریخ ذکاءاللہ کے مطابق اس فتوے کے بعد صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی۔" ۲؎

پاکستان میں دیوبندی مکتب فکر کے آرگن خدام الدین لاہور میں مولانا محمد مستقیم احسن حامدی فاضل دیوبند لکھتے ہیں :۔

"مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ کے ان جواں مرد اور رند مجاہدین میں سے تھے جن کی جرأت و ہمت اور حق گوئی و بے باکی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

"مولانا فضل حق خیرآبادی نے "افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر" کا فریضہ ادا کیا۔ اور اپنی عمر عزیز انڈمان میں حبس دوام کی نذر کر دی ۔۔۔۔۔

علامہ فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیکر مسلمانوں کو عدم تعاون پر آمادہ کیا ۔۔۔۔۔

مولانا فضل حق خیرآبادی بھی باغی قرار دئے گئے۔ سلطنت مغلیہ کی وفاداری فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ کر کے سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے "۔ ۳؎

"دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی آگرہ سے لکھنؤ آئے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے خلاف علماء میں سرگرمی عمل پیدا کر رہے تھے۔ مولانا (فضل حق) بھی ان کے ہمنوا ہو گئے! ور سرکاری ملازمت ترک کر کے الور چلے گئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہوا۔ دلی آئے۔ بہادر شاہ سے ملے۔ یہاں جنرل بخت خاں کے ٹھاٹ جمے ہوئے تھے۔ نصاریٰ کے خلاف جہاد کا فتویٰ مولانا نے دیا۔ اور اس پر مفتی

۱؎ مجلہ نیل و نہار لاہور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر ص ۲۸ ۔ ۲؎ سہ ماہی الزبیر بہاولپور تحریک آزادی نمبر ۱۹۷۰ء ص ۹۲ ۔ ۳؎ ہفت روزہ خدام الدین لاہور ۔ ۲۳ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۰۹ ۔

صدر الدین آزردہ، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی وغیرہ کے دستخط کرلیے گئے۔"[1]

"دہلی میں بہادر شاہ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نیز دوسرے علمار دہلی میں موجود تھے۔ ۔ ۔ ۔

"جنرل بخت خاں کے مشورے سے علامہ فضل حق خیرآبادی نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت و ضرورت پر تقریر کی۔ جہاد کا استفتار مرتب کرکے پیش کیا۔ جہاد کے فتوے کی تیاری میں جنرل بخت خاں کی کوشش خاص تھی۔"[2]

"مسلمانوں کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے آخری مرتبہ جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ کرنے کے لئے ایک باقاعدہ فتویٰ جہاد کا جاری کیا گیا جس پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدر الدین آزردہ اور مولوی فضل حق بھی شریک تھے۔ مولانا فضل حق نے فتوے کے بعد جگہ جگہ دورے کئے اور بالآخر دہلی پہنچ گئے۔ ۔ ۔ ۔ مولانا فضل حق کے مشورے صرف قلعۂ معلّٰی کی پوشیدہ مجلسوں تک محدود نہ تھے وہ جنرل بخت خاں سے ملے، مشورے ہوئے۔ اور آخر میں بعد نماز جمعہ دلی کی لال مسجد میں علمار کے سامنے تقریر کی اور فتویٰ پیش کیا۔"[3]

"مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کو جوکہ تحریک کے بہت بڑے رکن تھے اور بریلی، علی گڑھ اور اس کے ملحقہ اضلاع کے دورانِ تحریک میں گورنر تھے۔ آخر ان کو گھر سے گرفتار کیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خدا کے بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں وہ جان کی پروا کئے بغیر سر بکف ہو کر میدان میں نکلتے ہیں۔"[4]

تحریک آزادی کی مشہور تاریخ نگار سیدہ انیس فاطمہ بریلوی رقمطراز ہیں:۔

"خواص میں جنرل بخت خاں، فیروز شاہ، نانا راؤ، نواب تجمل حسین خاں، جنرل محمود خان،

---

[1] علمارِ حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں ص۵۵ از مفتی انتظام اللہ شہابی [2] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد مولانا فیض احمد بدایونی ص۲۱، ۲۲ — از محمد ایوب قادری۔ [3] مجلہ خیال لاہور سن ستاون نمبر ص۲۶۲، ۲۶۳ مضمون از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ [4] تحریک ریشمی رومال ص۶۴، ۶۵ از مولانا مولانا حسین احمد مدنی۔

اور عظیم اللہ خاں تھے۔ اور علماء کے سرگروہ مولوی احمد اللہ، مولوی لیاقت علی اور مولوی فضل حق خیرآبادی قرار پائے۔" [1]

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو گرفتار کر لیے گئے۔" [2]

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے آخر میں گرفتار ہوئے مقدمہ چلا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ .....
انڈمان و نکوبار کے زمانۂ قیام میں علامہ خیرآبادی سے دو چیزیں یادگار ہیں۔ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند۔ یہ دونوں چیزیں تاریخی ہونے کے علاوہ ادب کا بھی شاہکار ہیں .....
یہ رسالہ اور قصیدے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات کے نہایت قابل قدر ماخذ ہیں۔" [3]

پروفیسر خلیق احمد نظامی مرتب روزنامچہ عبداللطیف ص ۹۶، ۹۷ و ۱۲۲، ۱۲۳ پر لکھتے ہیں:۔

"جب زمانے میں شور و شر پھیلا تو مولوی فضل حق خیرآبادی نے دہلی کا عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے اور نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا۔"

"مولوی فضل حق نے مختلف علوم میں خاص مرتبہ حاصل کیا تھا۔ فن منطق میں ان کا علمی سرمایہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔"

مشہور ادیب و مورخ رئیس احمد جعفری اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" ص ۲۸۸ میں لکھتے ہیں:۔

"وہ (فضل حق خیرآبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور انگریزوں کو نکالنے کے لئے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے چنانچہ غدر جب شروع ہوا تو مولانا بے تامل شریک ہو گئے۔ وہ بہادر شاہ کے

---

[1] ۵۷ء کے ہیرو ص ۲ [2] علم و عمل ترجمہ وقائع عبدالقادر خانی جلد اول ص ۲۵۶ [3] سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۵۸ء ص ۶۲ مقالہ از محمد ایوب قادری۔

معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انھیں اہم معاملات ومسائل پر مشورے دیتے تھے۔ اور اس بات کے ساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیش سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجائیں۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرارت کے ساتھ علانیہ حصہ لیا، انھوں نے متعدد والیانِ ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی جس جس والیٔ ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات ومراسم تھے۔"

۔۔۔۔ ۱۸۵۹ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کو مغلیہ حکومت کی وفاداری اور انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شریک ہونے کے جرم میں گرفتار کرلیاگیا۔"[1]

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مولانا فضل حق الور سے دہلی پہنچے اور دہلی سے بعد از خرابیٔ بسیار اودھ پہنچے۔ حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہوئے۔ بعد ازاں مولانا فضل حق گرفتار ہوئے۔ بغاوت کے جرم میں اس یگانۂ روزگار شخصیت پر مقدمہ چلا۔"[2]

"۱۸۵۹ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرم بغاوت عائد کیا گیا۔ اور حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم ہوا۔"[3]

"ہماری پہلی جنگ آزادی کے ہیرو بلاشبہ انگریزی فوجی اور سول افسران سے کسی طرح قابلیت اور حب الوطنی میں کم نہیں تھے۔ جنرل بخت خاں، جنرل محمود خاں بیگم حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ، سید لیاقت علی، مولانا فضل حق، خان بہادر خاں، نانا راؤ، تانتیا ٹوپی، شہزادہ فیروز شاہ، جھانسی کی رانی، محمد علی خاں عرف جیمی گرین وغیرہ مجاہدین کے لیڈر تھے۔ اور اپنی اپنی جگہ بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔"[4]

سوویٹ یونین کی سائنس اکیڈمی کے ادارۂ علوم شرقیہ کی ایک ممتاز رکن مادام پولونسکایا لکھتی ہیں:۔

---

[1] آزادی کے مجاہد صفحہ ۳۵ از محمود الرحمٰن [2] روزنامہ حریت کراچی ۹ جولائی ۱۹۷۷ء مضمون محمد ایوب قادری [3] داستان تاریخ اردو صفحہ ۳۲۹ از حامد حسن قادری [4] مضمون جنگ آزادی کی کہانی انگریزوں کی زبانی از سید مصطفیٰ علی بریلوی ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی جنگ آزادی نمبر صفحہ ۱۰۵ ۔

"مولانا فضل حق الور تشریف لائے جہاں انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پرچار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ زمین دار جو برطانوی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس کی بنیادی طاقت ہوں گے۔ مولانا موصوف کے معاصرین اور ان کے سوانح نگاروں نے ان کے بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو لکھے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ بغاوت کے زمانے میں مولانا انگریزوں کے مخالفوں کی صف میں رہے"....

"مولانا فضل حق خیر آبادی کے سماجی اور سیاسی نظریات سامراجی محکومی کے جوئے سے ملک کو آزاد کرنے کی اس خواہش کے آئینہ دار تھے جو پوری قوم کے سینے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس حیثیت سے ان کی جملہ سرگرمیاں ہندوستان کے قومی مفاد کو پورا کرتی تھیں"۔ [۱]

محترم عرشی صاحب کے مضمون بعنوان "مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد" مطبوعہ ماہنامہ تحریک دہلی بابت ماہ اگست ۱۹۵۷ء نے اہل علم میں کیسی غلط فہمیاں پیدا کیں اس کا اندازہ جناب مالک رام کے مضمون "مولانا فضل حق خیر آبادی"، مطبوعہ ماہنامہ تحریک دہلی بابت ماہ جون ۱۹۶۰ء سے لگایا جا سکتا ہے جو عرشی صاحب کی تائید میں فتویٰ جہاد کے ساتھ مطلق شرکتِ جہاد سے بھی انکار کر بیٹھے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے۔

اسی قسم کی غلط فہمی کی عکاسی مندرجۂ ذیل مکتوب کر رہا ہے۔

۷۸۶

"کامٹی ضلع ناگپور مہاراشٹر
مورخہ ۳ رمارچ ۱۹۸۲ء

معظم و محترم جناب مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی مدظلہ العالی۔ سلام و رحمت۔

بہت برسوں سے جناب سے غائبانہ تعارف ہے۔ اب پہلی بار قلمی تخاطب

---

[۱] پندرہ روزہ سوویٹ دیس دہلی۔ ۱۰ رجولائی ۱۹۵۸ء

کا شرف حاصل کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سہ روزہ دعوت کی ۲۰ فروری ۸۲ء کی اشاعت میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے فتویٰ جہاد پر آپ کا توضیحی مضمون (بجواب مضمون حکیم نجمی سکندر پوری مطبوعہ سہ روزہ دعوت دہلی مورخہ ۱۳/۲/۸۲ء) نظر نواز ہوا۔ ماہنامہ تحریک کا وہ پرچہ میرے پاس بھی محفوظ ہے۔ جس میں مولانا عرشی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون نے علمی حلقوں میں بڑی غلط فہمی پیدا کی ہے۔ اور اس کے اثرات بھی بہت ہوئے ہیں۔ میں بھی اس مضمون سے ذہنی طور پر کشمکش میں مبتلا رہا ہوں۔ اب جناب کے توضیحی مضمون سے اطمینان کی صورت پیدا ہوئی۔ اتنے اہم اور تاریخی معاملہ میں اتنی طویل عرصے تک خاموشی مناسب نہیں تھی۔ بہر حال پھر بھی اب آپ کے ذریعے قلمی طور پر جو کچھ ہوا وہ غنیمت ہے جس کے لئے علمی دنیا آپ کی شکر گزار ہوگی۔"

زیادہ والسلام۔ محتاج دعا، محمد ظہیر وارثی۔
مقام کامٹی ضلع ناگپور۔ مہاراشٹر "

اپنے مٹنے کی ہمیں کچھ نہیں پروا لیکن
تو نے سوچا ہے کچھ اپنا بھی زیاں اے ساقی

مقدمہ کی کارروائی، معاصرین و مؤرخین کی شہادتیں اور انگریزوں کے بیانات کی روشنی میں محترم بزرگ مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری اور جناب مالک رام صاحب کے نظریۂ عدمِ شرکتِ جنگ آزادی پر نظر ڈالیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا ؎

حریف صاف و دردی نہ ای خطا ایں جاست
تمیز ناخوش و خوش می کنی بلا اینجاست

اور اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ؎

تفاوت ست میان شنیدنِ من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

ہمارے یہ دونوں بزرگ ہمیشہ غازی گفتار رہے غازی کردار کبھی نہ بن سکے ساحل پر کھڑے ہو کر شناورانِ بحرِ بیکرانِ سیاست وجہادِ حریت کا تماشا دیکھتے رہے۔ ان کے عنفوان شباب سے ہندوستان کے دریائے جنگ آزادی میں دسیوں تلاطم و مد و جزر آئے مگر یہ اپنی عافیت پسندی اور راحت آشامی کے حصار سے باہر نہ نکل سکے جبکہ ہزاروں جواں مرد اور باہمت خواتین مصائب انگیزی اور جاں سپاری کا مظاہرہ کرتے رہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اس موضوع پر "فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون" مرتبہ مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی ثم کراچوی مطبوعہ برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء اور "امتیاز حق" مرتبہ راجہ غلام محمد۔ شائع کردہ مکتبہ قادریہ لاہور ۱۹۷۹ء والمجمع الاسلامی مبارکپور) خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ہماری بھی ماخذ رہی ہیں۔

* * *

مقدمہ سے متعلق پوری روداد آپ نے پڑھ لی۔ اب الثورۃ الہندیہ کے متعلق مضحکہ خیز شبہات پر بھی نظر ڈال لیں۔

محترم نادم سیتاپوری اپنی کتاب "غالب نام آورم" میں اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند کے کوئلوں اور پنسل سے لکھے ہوئے منتشر پرزے جب مولانا عبد الحق کو مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعے ملے تو وہ اپنے والد ماجد علامہ فضل حق کی رہائی کے لئے کوشاں تھے۔ انھیں خطرہ ہوگا کہ پرزے مرتب ہو کر حکام وقت کے ہاتھ لگ گئے تو رہائی مشکل ہوگی۔ اس لئے اس میں ترمیم کر دی گئی ہوگی۔[1]

اس کا جواب محترم محمد ایوب قادری نے دیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

---

[1] غالب نام آورم ص ۱۲۳۔

(۱) داخلی یا خارجی شواہد پیش کئے بغیر محض ظن وتخمین سے رسالہ وقصائد کو مشکوک قرار دینا درست نہیں ہے۔

(۲) یہ رسالہ وقصائد مولانا عبدالحق کی زندگی میں شائع نہیں ہوئے لہٰذا حکومت کے خوف کی بنا پر تحریف وترمیم کی ضرورت کیا تھی۔

(۳) اس رسالہ وقصائد میں حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی گئی ہے! اگر حکومت کے خوف سے ترمیم کی گئی ہوتی تو لب ولہجہ نرم ہوتا۔

(۴) ۱۲۷۷ھ میں مفتی عنایت احمد کاکوروی رہا ہو کر آئے۔ ایک دو ماہ کے بعد رسالہ اور قصائد مولانا کو پہنچے ہوں گے۔ ۱۲۔ صفر ۱۲۷۸ھ کو علامہ فضل حق کا وصال ہو جاتا ہے اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ مولانا عبدالحق نے علامہ کے وصال کے بعد رسالہ وقصائد کی طرف توجہ دی ہو گی۔ لہٰذا علامہ کی رہائی کے لئے کوشش ان کی ترتیب سے مانع نہ ہوئی ہو گی[1]

میرے خیال سے قادری صاحب کو جواباً ان دلائل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ نادم صاحب زبان عربی اور اس کے ادب سے نابلد محض ہیں۔ علامہ کے اسلوب بیان اور طرز نگارش کو وہ خود تو کیا سمجھ سکتے ہیں بڑے سے بڑا ماہر لسان ولغت بھی کتب لغات کی مدد کے بغیر علامہ کے مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی ترمیم کی گئی ہوتی تو وہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ہوتی۔

اب خود محمد ایوب قادری صاحب کا شبہ ملاحظہ فرمائیں اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

> "جزائر انڈمان ونکوبار میں دفتر قائم ہو چکا تھا۔ اسکول کھل چکا تھا۔ عدالتی کارروائیاں جاری تھیں۔ وہاں کے انگریز حکام کی اجازت سے تصنیف و تالیف کا کام جاری تھا تو پھر کوئلے سے لکھنے کا کیا قرینہ؟
>
> مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی انڈمان سے رہا ہو کر آئے تو اپنے ساتھ اپنی تین کتابیں بھی لائے جن میں سے تواریخ حبیب اللہ اور علم الصیغہ شائع ہو کر مقبول عام ہوئیں۔ جب یہ تین کتابیں بحفاظت پہنچ گئیں تو رسالہ اور

---

[1] جزائر انڈمان ونکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات۔ سہ ماہی اردو جنوری ۱۹۶۶ء صـ ۶۳ و ۶۴

قصائد کے پہنچنے سے کیا مانع تھا۔؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

موصوف نے سوچا کہ نادم سیتاپوری دور کی کوڑی لائے تو میں کیوں محروم رہوں لیاقت آشکارا کرنے کے لئے کوئی نئی بات پیدا کرنی ہی چاہیئے۔

رسالہ وقصائد کو علم الصیغہ اور تواریخ حبیب الٰہ اور "غدر" کے حالات کو موجودہ حالات پر قیاس کرنا انھیں جیسے مفکر کا کام ہو سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد تعارف باغی ہندوستان میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"حال اس زمانے کا دوسرا تھا۔ غدر کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرم بغاوت مدۃ العمر قید کی سزا دی گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ خطرناک بات یقین کی جاتی تھی۔"

تواتر روایت کی تغلیط کی جسارت بڑی ہمت چاہتی ہے جسکی قادری صاحب کے پاس کمی نہیں۔

خود لکھتے ہیں کہ تواریخ حبیب الٰہ اور علم الصیغہ شائع ہو کر مقبول عام ہوئیں۔ یہی بات تھی تو رسالہ و قصائد ۱۹۳۶ء تک کیوں شائع ہو کر مقبول عام نہ ہوئے؟ اور کیوں ان کی معدودے چند نقلیں خواص نے حرز جاں بنا کر رکھیں۔؟

پرزوں پر لکھ کر بھیجنے میں مصلحت یہی تھی کہ اگر راہ میں کسی کے ہاتھ لگ جائیں تو اسے کچھ ہاتھ نہ آئے۔ اس کی ترتیب میں خلف الرشید مولانا عبدالحق جیسے فاضل کو کیا کیا دقتیں پیش آئی ہوں گی۔ یہ وہی جانتے ہوں گے۔ مولانا تو "الولد سرٌ لابیہ" سمجھے کہ فائز المرام ہو گئے۔ ؎

ہرچہ در طبع تو نہ آید راست
تو ندانستہ ای مگو کہ خطا ست

چند اغلاط کی تصحیح

[تلخیص از "فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون" برکات اکیڈمی۔ کراچی ۱۹۵۷ء
مؤلف مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی۔ موصوف کی اجازت سے یہ مضمون شکریہ کے ساتھ شائع ہے۔]

دوسرے اعاظم رجال کی طرح مولانا فضل حق خیر آبادی بھی ابتدا ہی سے مختلف و متعدد "اغلاط" کا ہدف رہے ہیں! اور ان اغلاط کو ایک خاص گروہ بڑے اہتمام سے بار بار دہراتا رہا۔ ہم مولانا فضل حق کے پرستار نہیں ہیں، ان کو خطا و نسیان سے مبرا نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کسی بڑے سے بڑے پاکباز میں کوئی اخلاقی کمزوری پائی جاتی ہو مگر ایک مورخ کی حیثیت سے ہمارا فرض یہ ہے کہ اس کے محاسنِ اخلاق کے ساتھ معائب کا ذکر بھی ناگزیر سمجھتے ہیں تو سند اور حوالے کے ساتھ کریں۔ بے بنیاد الزامات، گپ اور افواہ کی قلعی بالآخر کھل کر رہتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص تو اپنی مظلومیت کی بنا پر ہمدردیوں کا مستحق بن جاتا ہے اور مورخ کی تحریر پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے اور اس کا بھرم باقی نہیں رہتا۔

مولانا فضل حق کے متعلق غلط بیانیاں زیادہ تر ایک خاص گروہ کے حضرات نے کی ہیں۔ جس نے بھی شاہ اسماعیل دہلوی کے سوانح کو موضوع بنایا اس نے شاہ صاحب کی مدح کے ساتھ مولانا کی قدح کو بھی لازمی قرار دیا۔ مولانا کا جرم صرف یہ تھا کہ جب شاہ اسماعیل نے ۱۸۲۸ء میں امام معین کی تقلید ترک کر کے "تمسک بالکتاب والسنۃ" کا (بزعم خود) پرچم بلند کیا اور "تقویۃ الایمان" کے نام سے اردو میں ایک رسالہ لکھا۔ جس کا نہ صرف اندازِ بیان حسنِ ادب سے عاری تھا بلکہ جمہور امت کے عقائد کے برعکس شفاعت کا انکار بھی کیا تھا۔ اور نظیر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے امتناع کا بھی انکار تھا۔ تو دہلی کے دینی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ اور وقت کے علماء جن میں اکثریت ولی اللّٰہی علماء کی تھی سخت برہم ہوئے۔ مگر چونکہ شاہ اسماعیل وشاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے تھے۔ اس لئے کسی کو حرف اختلاف زبان پر لانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس نازک لمحے میں مولانا فضل حق نے جرأت سے کام لے کر امتناع النظیر کے مسئلے پر شاہ

اسماعیل کے جواب میں ایک رسالہ تالیف فرمایا۔ اور پھر "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ" کے نام سے ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائی جس پر علمائے عصر اور خانوادۂ ولی اللّٰہی سے وابستہ علماء کے بھی دستخط تھے۔ مولانا کے اس اقدام نے دوسرے علماء کی بھی ہمت افزائی کی۔ اور وہ میدان میں آ گئے۔ ابتداءً نجی گفتگوؤں تک بات محدود رہی مگر شاہ عبدالعزیز کے وصال (۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) کے فوراً بعد دہلی کی جامع شاہجہانی میں ایک تاریخی مجلس مناظرہ منعقد ہوئی جس میں ایک طرف شاہ اسماعیل کے اعوان و انصار تھے۔ دوسری طرف باقی علماءِ حق پرست۔ شاہ اسماعیل تو دورانِ مناظرہ برہم ہو کر چل دیئے۔ مولوی عبدالحئی بڈھانوی نے بھی اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکے۔ اور آخر میں انھیں کئی باتوں کو تسلیم کرنا، اور لکھ کر دینا پڑا۔

مولانا فضل حق کا یہ وہ جرم ہے جو آج تک معاف نہیں کیا گیا۔ اور ان کی تخفیف شان تفسیق اور تضلیل کا کوئی موقع اب بھی ہاتھ سے نہیں دیا جاتا۔ اور صرف مولانا فضل حق ہی تک بات محدود نہیں رہی۔ مولانا کے تمام وابستگانِ داماں اور اصحاب سلسلہ اس انتقام کا شکار رہے۔ مولانا کے فرزند علامہ عبدالحق ان کے تلامذہ خصوصاً مولانا سید برکات احمد پر اتہامات ایسے ایسے "ثقہ اور متدین اور داعی الی اللہ" بزرگوں نے لگائے ہیں کہ انسان متحیر ہو جاتا ہے۔ میں ان اتہامات کا جائزہ "حیات عبدالحئی پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مضمون میں لے چکا ہوں۔ (العلم کراچی اپریل۔ جون ۱۹۷۲ء) اس وقت صرف ان کرم فرمائیوں کا جائزہ لینا مقصود ہے جو مولانا فضل حق کی ذات گرامی پر روا رکھی گئیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام نواب صدیق حسن خاں کا ہے پہلے آپ مولانا صدیق حسن خاں کا ایک جملہ سن لیں، مولوی محسن ترہتی نے اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں شاہ اسماعیل کی تقویۃ الایمان" پر یہ تبصرہ کیا تھا کہ اس کے بعض حصوں میں عسل و تمر کی سی حلاوت ہے اور بعض میں حنظل کی سی تلخی۔ اس پر نواب صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی محسن کے اس تبصرے کا راز یہ ہے کہ وہ مولانا فضل حق کے شاگرد ہیں۔ اور

فانه اول من قام بصده وتصدّی لرده فی رسائله التی لیست علیها اثارة من الکتاب والسنّة۔[1]

(مولانا فضل حق) وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے (شاہ اسماعیلؒ سے) اختلاف کیا۔ اور اپنے ان رسائل میں (شاہ صاحبؒ کا) رد کیا۔ جس میں علم کتاب و سنّت کا کوئی اثر و نشان نہیں ہے۔

نواب صاحب کے اس جملے سے آپ کو ہماری اس بات کی تصدیق ہو گئی ہو گی کہ مولانا سے کدورت اس لئے ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کے رد میں پہل کی تھی۔ پھر آپ نے انداز فکر بھی دیکھ لیا کہ ایک انصاف پسند نے تقویت پر ایک درمیانی سی بات لکھ دی تھی کہ اس میں حلاوت بھی ہے اور تلخی بھی۔ تو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور اس کو مولنا فضل حق کے تلمذ کے اثرات پر محمول کیا۔ نواب صاحب نے مولنا کے متعلق فرمایا ہے:۔

کان زیه زیّ الأمراء دون العلماء[2]

ان کی سج دھج علماء کی سی نہیں تھی۔ امراء کی سی تھی۔

ہم نے نواب صاحب کے اس جملے کو اس لئے اہمیت دی ہے کہ یہ حضرات اس بات کو بار بار دہراتے ہیں۔ مرزا حیرت نے بھی یہی لکھا ہے۔ اور مولوی سید عبد الحئی نے بھی اس کی تکرار کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ بات کسی نے بھی واضح نہیں کی کہ زیّ علماء اور زیّ امراء کا کیا مطلب ہے۔؟ اور ان دونوں میں بنیادی فرق کیا ہے۔؟ اگر ان حضرات کا یہ مطلب ہے کہ وہ غیر شرعی لباس پہنتے تھے تو صاف صاف لکھنا چاہیے تھا کہ ہم شرعی لباس کا مطلب پوچھتے کیونکہ شریعت نے تو کچھ اصول اور کچھ حدود مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اس کے بعد آزادی دی ہے۔ ہاں قدامت پسند علمائے ہند بیشک اس باب میں متشدد رہے۔ مگر ان کے معیار بھی بدلتے رہے۔ پوشش سر کے سلسلے میں عمامے کو شرعی لباس سمجھا جاتا اور علماء کے لئے لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ مگر مولنا ابوالکلام آزاد نے عمامے کا تکلف روا نہیں رکھا۔ وہ اپنی مخصوص (غیر عالمانہ) ٹوپی پہنے رہتے۔ اور بڑے بڑے علماء ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ اور پھر انقلاب آیا۔

---

[1] ابجد العلوم [2] ایضاً۔

تو دیوبند کے مشاہیر علماء کو ہم نے گاندھی کیپ بر سر بھی دیکھا۔ یہی حال پاجامے کا ہے ایک دَور، وہ بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک خاص قسم کی شلوار کو شرعی پاجامہ کہا جاتا تھا اور علی گڑھ پاجامہ علماء کے لئے معیوب و ممنوع تھا۔ لیکن بتدریج وہ بھی رائج ہو گیا۔ اسی صدی کے آغاز میں انگرکھے کی جگہ اچکن یا شیروانی پہننے والوں کو فیشن ایبل کہا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ہم تو زیِّ امراء اور زیِّ علماء کے فرق سے واقف نہیں ہیں۔

اگر زیِّ امراء سے ان حضرات کی مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دولت علم کے ساتھ دولت دنیا سے بھی بہرہ مند ہونے کی بنا پر تحدیثِ نعمت کرتا ہے اور شایانِ شان لباس پہنتا ہے تو یہ فرمایا جائے کہ یہ کس امام کے نزدیک حرام ہے؟ ہم نے امام الائمہ ابوحنیفہ، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ وغیرہ متعدد اکابر و ائمہ کے متعلق پڑھا ہے کہ وہ نہ صرف صاف ستھرا بلکہ اعلیٰ درجے کا لباس پہنتے تھے۔ خود نواب صدیق حسن خاں کے متعلق متعدد ثقہ حضرات سے لباس کے اہتمام اور غیر شرعی اسباب زینت پر توجہ کے متعلق سنا ہے اور ان کی جو تصویر نظر سے گزری ہے اس میں وہ زیِّ علماء کے بجائے زیِّ امراء میں نظر آتے ہیں۔ اور شاہ اسماعیل کے لباس کے متعلق تو جعفر تھانیسری نے لکھا ہے کہ وہ ہمہ سپاہیانہ وضع رکھتے تھے۔ گلے میں الخالق، اور چست پاجامہ، سر پر پیچیدہ عمامہ اور گلے میں تلوار حمائل کئے رہتے تھے۔ ؎

دوسری بات نواب صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ:-

وکان بینہ وبین استاذی	(مولانا فضل حق) اور میرے استاد علامہ محمد
العلامہ محمد صدر الدین خان	صدر الدین خاں دہلوی کے درمیان بڑی
الدھلوی بہا مودۃ اکیدۃ ومحبۃ	دوستی اور محبت تھی! اس لئے کہ دونوں ایک
شدیدۃ لانہما کانا شریکین	استاد کے شاگرد تھے اور مولانا فضل حق کے
فی الاشتغال علی استاذ واحد	فاضل والد (مولانا) فضل امام کے بھی دونوں

؎ سوانح احمدی طبع کراچی ص ۱۳۱۔

وعلى ابيه الفاضل فضل امام ومع ذلك يسخط استاذي عليه في بعض اموره منها رده على الشيخ الحافظ الواعظ المحدث الاصولي الحاج الغازي الشهيد محمد اسماعيل الدهلوي . ويقول لا ارضى منك وليس هٰذا بعد ذلك . لہ

شاگرد تھے۔ مگر اس کے باوجود میرے استاد مولانا فضل حق کو ان کے بعض کاموں پر بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ مولٰنا فضل حق نے حضرت حافظ واعظ محدث اصولی حاجی غازی شہید محمد اسماعیل دہلوی کا رد کیا تھا۔ استاد ان سے فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہاری اس بات سے خوش نہیں ہوں اور یہ تمہیں زیب نہیں دیتی۔

ایک دوست کا دوسرے کو ٹوکنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ مولانا صدر الدین آزردہ تو مولٰنا فضل حق کو اس بات پر بُرا بھلا کہیں کہ انھوں نے شاہ اسماعیل کا رد کیا تھا۔ جب کہ وہ خود شاہ اسماعیل کے خیالات سے متفق نہیں تھے۔ اور بقول مولانا فضل رسول انھوں نے شاہ صاحب کو سمجھا کر اس سے باز رکھنا چاہا تھا۔ مولٰنا آزردہ تعین یوم میلاد کے قائل تھے۔ مولانا قیام فی المیلاد کو بھی مستحسن جانتے تھے۔ "منتہی المقال" میں بھی وہ وہابی نقطۂ نظر کے خلاف گئے ہیں۔ اور جوش وخروش کے ساتھ وہابیہ کا رد کیا ہے۔ امتناع النظیر کے باب میں بھی ان کا ایک قلمی رسالہ میرے کتب خانہ میں ہے۔ وہ اس میں بھی شاہ صاحب سے کلیۃً متفق نہیں تھے۔

ان حقائق کی موجودگی میں، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ نواب صاحب کا اپنے استاد پر افترا ہے۔ کہ وہ مولانا فضل حق سے اس لئے ناراض تھے کہ انھوں نے شاہ صاحب کا رد کیا تھا۔ اور مولانا فضل حق کے سلسلے میں لوگوں کو بدگمان کرنے کی ناکام کوشش ہے۔

لطف یہ ہے کہ یہی نواب صاحب جو ردّ وہابیت پر مولٰنا فضل حق سے اس درجہ

لہ اکمل العلوم

برہم تھے خود وہابیہ خصوصاً وہابیۂ ہند سے مسلسل اظہار برأت کرتے رہے۔ اور بقول مولانا مسعود عالم ندوی:۔

”اہل نجد کی بھی کوئی برائی نہیں ہے جو انھوں نے اپنی کتابوں میں نہ کی ہو۔۔۔۔ کچھ یہی حال اہل صادق پور (شاہ اسماعیل کے متبعین و مقلدین) کے ساتھ ہے“ ۱؎

اور اس تبرا کی توجیہ مولانا نے یہ کی ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے خوف سے خود کو وہابیان ہند سے بے تعلق دکھانا چاہتے تھے۔ ورنہ دل سے نجد کی دعوت توحید کے معترف و ثناخوان تھے۔ مولانا ندوی نے توقع ظاہر کی ہے کہ:۔

”جو لوگ ان کی زندگی کی الجھنوں سے واقف ہیں وہ انھیں معذور رکھیں گے“ ۲؎

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ نواب صاحب نے اپنی منقولۂ بالا عربی تحریر میں شاہ اسماعیل کو غازی و شہید لکھا ہے مگر اپنی کتاب ترجمان وہابیہ میں شاہ اسماعیل کے دامن سے ترغیب جہاد کے داغ دھوئے ہیں اور لکھا ہے کہ:۔

”انھوں نے اپنی کسی کتاب میں مسئلہ جہاد کا نہیں لکھا“ ۳؎

اور شاہ اسماعیل سے عقیدت اور ان کی اتباع سے تبرّی کی ہے۔ ۴؎

اور پوری کتاب میں کسی ایک جگہ بھی شاہ اسماعیل کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ نہیں لکھا اور بہ تکرار لکھا ہے کہ غدر میں انگریزوں کے خلاف جو بھی ہنگامہ آرائی ہوئی اور فتوے لکھے گئے وہ سب مقلدین اور احناف کی شرارت تھی وہابی اور اہل حدیث کا دامن اس بغاوت میں شرکت سے بالکل پاک ہے۔ ۵؎

منشی محمد جعفر تھانیسری سوانح احمدی میں لکھتے ہیں:۔

”مولوی فضل حق معقولی خیرآبادی جو اس زمانے میں حاکم اعلیٰ شہر کے سررشتہ دار اور علم منطق کے پتلے اور افلاطون و سقراط و بقراط کی غلطیوں کی تصحیح کرنے والے تھے مولانا شہید کے سخت مخالف ہو گئے۔ چنانچہ کتاب تقویۃ الایمان کے اس مسئلے پر کہ ”اللہ رب العزت حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سا دوسرا پیدا کر دینے

۱؎ معارف اعظم گڑھ جلد ۱۵ شمارہ ۳ مارچ ۱۹۲۳ء ۲؎ ایضاً ۳؎ و ۴؎ و ۵؎ ترجمان وہابیہ صفحہ ۱۱، ۵۲، ۵، ۱۲، ۵۱ ۲۵

پر قادر ہے۔ انھوں نے سخت اعتراض کیا اور لکھا کہ "اللہ ربّ العزت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا دوسرا پیدا کرنے پر ہرگز قادر نہیں۔" اس کے جواب میں مولانا (اسماعیل) نے ایک فتویٰ بدلائل عقلی ونقلی مدلل لکھا ہے ۔۔۔۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس خوبی سے آپ نے مخالفوں کا منھ بند کیا ہے۔" [1]

مخالفین کا منھ تو بند نہیں ہوا۔ دین میں جو فتنہ پیدا ہو گیا اور قلب امت میں قادیانیت کا جو ناسور پیدا ہو گیا۔ اس کا علاج نظر نہیں آتا۔

شاہ اسماعیل کی اس تحریر پر مولانا فضل حق نے یہ اعتراض کیا تھا کہ نظیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امکان تسلیم کر لینے سے ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے۔ مگر شاہ صاحب کو اپنی بات پر اصرار رہا۔ اور پھر ان کی حمایت میں مولوی حیدر علی رامپوری نے ان سے بھی بڑھ کر بات کہی کہ حضور اکرم، ممکن ہے، ان ارض وسما کے خاتم النبیین ہوں اور وہ مفروض مثیل خاتم النبیین کسی دوسرے ارض وسما اور کسی اور دنیا کا خاتم النبیین ہو۔ [2]

ان حضرات نے اثر ابن عباس سے استدلال کیا جو ایک موضوع روایت اور از قبیل اسرائیلیات ہے۔ اس روایت میں سات زمینوں کے وجود اور ان ساتوں زمینوں میں ہماری زمین کے انبیاء اور خاتم النبیین کی طرح الگ الگ ہر زمین میں دوسرے انبیاء اور خاتم النبیین کا ذکر ہے۔ گویا اس طرح یہ حضرات امکان نظیر کے اثبات کی دھن میں سات زمینوں کے سات خاتم النبیین ثابت کرنے پر تل گئے۔ اور اس طرح دانستہ یا نادانستہ ہی انکار ختم نبوت کی راہ ہموار ہوئی۔ اور مرزا غلام احمد قادیانی کو یہ جرات ہوئی کہ وہ نبوت کا ادعا کرے [3] چنانچہ مرزا کے خلیفہ مرزا بشیر احمد نے مولانا قاسم نانوتوی کے رسالہ تحذیر الناس کی (جو اثر ابن

---

[1] سوانح احمدی صفحہ ۳۰۲ [2] صیانۃ الناس من وسوسۃ الخناس [3] مولانا محمد قاسم نے ۱۸۷۳ء میں رسالہ تحذیر الناس لکھا اور ۱۸۸۲ء میں مرزا نے اپنے ملہم و مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔

عباس کی صحت کے حق میں ہے) ایک عبارت نقل کر کے لکھا ہے۔[۱]

"اہل بصیرت کے نزدیک اس شہادت کو خاص وزن حاصل ہونا چاہئے۔ یہ شہادت مدرسۃ العلوم دیوبند کے نامور بانی مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی (ف ۱۸۸۹ء) کی ہے۔"

مختصر یہ ہے کہ شاہ اسماعیل کے غیر محتاط انداز بیان اور ایک خاص گروہ کے علماء کی طرف سے ان کی بے جا اور ناحق حمایت نے ایک ایسے فتنے کو سر اٹھانے اور پنپنے کا موقع دیا جو ۹۵ سال سے امت کے لئے دردِ سر بلکہ دردِ جگر بنا ہوا ہے۔ مولانا فضل حق کی فراست نے برمحل اس فتنے کا سدِّ باب کرنا چاہا تھا اور شاہ اسماعیل کی کتاب پر بر وقت تنقید کی تھی۔

جعفر تھانیسری نے مولانا فضل حق پر ایک اور تہمت یہ تراشی ہے کہ مولانا نے جامع مسجد میں شاہ اسماعیل کا وعظ بند کرا دیا تھا۔[۲]

جعفر تھانیسری نے یہ بات بلا سند لکھی ہے۔ اس لئے قطعاً ناقابل اعتبار ہے۔ وہ شاہ اسماعیل کی "موت" (۱۸۳۱ء) کے ایک سال بعد پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۹۵ء میں یہ سوانح لکھ رہے ہیں۔[۳] اس لئے بغیر کسی سند کے اس کی بات کا اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ تحریک جہاد کے معاصر مورخین میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ شاہ صاحب کے وعظ کی مخالفت میں مولانا فضل حق کا ہاتھ تھا۔

اس تحریف نے تحریک کو طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا کر دیا۔ اور منشی جعفر نے وہ کارنامہ انجام دیا جو بدترین دشمن کے بس کا نہ تھا۔

مولانا فضل حق کے ایک اور کرم فرما مرزا حیرت دہلوی تھے۔ ان حضرت نے شاہ اسماعیل کے سوانح پر حیات طیبہ کے نام سے جو کتاب بیسویں صدی کے آغاز میں تحریر کی تھی۔ اس میں متعدد مقامات پر مولانا فضل حق کا ذکر خیر کیا ہے! اور متعدد

---

[۱] ختم نبوت کی حقیقت ص۱۵۲ طبع کراچی [۲] سوانح احمدی ص۳۹ طبع کراچی [۳] یہ سالِ طباعت ہے تالیف دو ایک سال قبل کی ہوگی۔

گھناؤنے اور بے بنیاد الزامات مولانا پر لگائے ہیں اور کئی غلط بیانیاں کی ہیں۔

(۱) مولانا فضل حق "زمرۂ علمائے دینی کے پابند نہیں تھے" اور انھوں نے اپنے کو دائرۂ علماء سے خارج کر لیا تھا"[1]

اس سلسلے میں ہم آپ کو نواب صدیق حسن خاں کا وہ قول یاد دلائیں گے کہ "مولٰنا فضل حق کی وضع قطع امراء کی سی تھی۔ علماء کی سی نہیں تھی" اور ہمارا جواب یہاں بھی وہی ہوگا جو ہم نواب صاحب کی بات کا دے چکے ہیں۔ یہاں ہم آپ کو اپنی وہ بات بھی یاد دلائیں گے کہ مولانا فضل حق کے متعلق ایسی تہمتیں زیادہ تر اہل حدیث کے گروہ نے تراشی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں نواب صدیق حسن خاں، منشی جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت کے انداز تہمت تراشی میں کس قدر یکسانی اور یک رنگی ہے۔ مرزا حیرت بھی اہل حدیث اور عدم تقلید کے مبلغ تھے۔

(۲) "مولانا فضل حق طوائفوں کے یہاں جایا کرتے تھے"[2] مرزا حیرت مولانا کے معاصر نہیں تھے۔ اس لئے ان کو کسی معاصر کے تذکرے کا حوالہ دینا ضروری تھا۔ حوالے کے بغیر اتنے عرصے بعد کوئی نئی بات کیسے قبول کی جا سکتی ہے۔

(۳) منشی جعفر تھانیسری کا یہ الزام مرزا حیرت نے بھی دہرایا ہے کہ "مولانا فضل حق نے شاہ اسماعیل کا وعظ بند کروایا تھا۔" بلکہ منشی جعفر کے اجمال کو تفصیل کا رنگ دے کر کئی صفحات سیاہ کئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا نے پہلے تو ریزیڈنٹ کے کان میں یہ بات ڈالی کہ شاہ صاحب کے مواعظ سے امن عامہ میں خلل کا اندیشہ ہے۔ پھر ایک عرضی پندرہ سو مسلمانوں کے دستخط سے ریزیڈنٹ کو شاہ صاحب کے خلاف دلوائی جس پر ریزیڈنٹ نے حکم دیدیا کہ شاہ صاحب کا وعظ بند کر دیا جائے۔ شاہ صاحب تک یہ حکم پہنچا تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی درخواست لکھی۔ جس سے ریزیڈنٹ کی رائے بدل گئی اور اس نے اجراءِ مواعظ کا حکم دیدیا۔ مگر مولانا نے یہ حکم شاہ صاحب کو نہیں پہنچایا۔ شاہ صاحب چند روز انتظار کے بعد خود ریزیڈنٹ

---

[1] حیات طیبہ ص۱۰۱ طبع سوم ۱۹۵۸ء لاہور [2] حیات طیبہ ص۱۰۰

کے پاس پہونچ گئے۔ اور اپنی درخواست کے جواب کا مطالبہ کیا۔ ریزیڈنٹ کو یہ معلوم کر کے کہ اس کا حکم شاہ صاحب تک نہیں پہنچایا گیا بہت طیش آیا اور اس نے مولانا کو زجر و توبیخ کی اور تین ماہ کے لئے معطل کر دیا۔ ؎۱

اس کے جواب میں اولاً تو ہم پھر اپنا وہی مطالبہ دہرائیں گے۔ کہ آپ کا ماخذ کیا ہے۔؟ ثانیاً مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ جس سال یہ واقعہ پیش آیا "یہ مولانا کی عمر کا بتیسواں سال تھا"۔ ؎۲ ——— شاہ اسمٰعیل کا سال ولادت ۱۱۹۳ھ ہے۔ اس لئے ۱۲۲۵ھ میں ۳۲ سال کے ہوتے ہیں۔ اور مولانا فضل حق جن کا سال ولادت ۱۲۱۲ھ ہے اس وقت صرف ۱۳ سال کے ہوں گے۔ یا یوں سمجھئے کہ شاہ اسمٰعیل مولانا سے ۱۹ سال بڑے تھے۔ اس لئے جب شاہ صاحب ۳۲ سال کے ہوں گے اس وقت مولانا کی عمر ۱۳ سال ہو گی! اس عمر میں وہ زیر تعلیم تھے نہ کہ ریزیڈنٹ کے سر رشتہ دار۔

(۴) مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ مولانا فضل حق کی نظم و نثر پر مولوی امیر احمد صاحب مرحوم نے تیرہ سو اعتراض کئے تھے۔ اور مولانا سید احمد رامپوری نے ان ۱۳ سو اعتراضات کو ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر کے اس کا نام تیرہ صدی رکھا تھا۔ ؎۳

مرزا حیرت کا یہ بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقت میں مبالغے کا عنصر شامل کر دینے میں چابک دست واقع ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اہل حدیث عالم شمس العلماء مولوی امیر احمد سہسوانی نے مولانا فضل حق کی کتاب الہدیۃ السعیدیہ وغیرہ پر دس اعتراضات "تلک عشرۃ کاملۃ" کے نام سے ایک رسالے میں لکھے تھے۔ اور مولوی سید محمد نذیر نے رامپور میں یہ رسالہ طبع کرایا تھا۔ ؎۴ ——— دس کو تیرہ سو لکھ کر مرزا حیرت نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی تحریر میں صداقت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ دہلی کے نامور ثقہ بزرگ ملا واحدی تحریر فرماتے ہیں: ؎۵

"مرزا حیرت وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے کارنامۂ شہادت سے انکار کیا تھا۔ اور انکار پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ کمال یہ تھا کہ جس زمانے

؎۱ حیات طیبہ ص۱۳۳ ؎۲ ایضاً ص۱۳۴ ؎۳ ایضاً ص۱۳۵ ؎۴ حیوۃ العلماء مولفہ مولانا عبدالباقی سہسوانی طبع ۱۹۳۲ ؎۵ میرے زمانے کی دلی ص۱۰۲

میں انکارِ شہادت پر کتاب تصنیف کر رہے تھے اس زمانے میں جمعہ کے جمعہ شہادت پر تقریریں کیا کرتے تھے۔ اور ایسی تقریریں کرتے تھے کہ سننے والوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔"

خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں :- [۳۵]

"وہ (مرزا حیرت) فرضی عبارتیں، فرضی حکایتیں اور فرضی حوالہ جات تاریخ کی کتابوں میں درج کر دینے میں مشہور ہیں۔ اور ان کی دلیری اور جھوٹ بولنے اور جھوٹ لکھنے کی بے باکی پر شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی تک حیرت زدہ رہتے تھے۔"

خواجہ صاحب کے اس بیان کا جیتا جاگتا ثبوت مرزا حیرت کی کتاب حیات طیبہ ہے اس کتاب کے ماخذ کی اصلیت و واقعیت کا یہ حال ہے کہ متعدد مقامات پر تو اس نوع کے مہمل و مجمل حوالے ہیں۔ "ایک کتاب" (ص۴۷)، "ایک راوی" (ص۹)، "ہم عصر مورخ" (ص۱۸۸)، "ہم عصر سوانح نویس" (ص۲۷۷) "ایک ضعیف بوڑھا شخص مرحوم" (ص۲۹۵) "ہمارا مورخ" (ص۶۱) ایک اہم ماخذ منشی ہیرا لال کے بیانات ہیں۔ ۵ اہم مواقع پر اس کے حوالے دیئے ہیں۔ اور اپنے شاہ اسماعیل کا منشی بتایا ہے (ص۱۲۳) شاہ صاحب کے کئی صفحات پر محیط مواعظ و مکالمات اس کی روایت سے نقل کئے ہیں۔ حالانکہ شاہ صاحب کے کسی تذکرے میں یہ نام ہماری نظر سے نہیں گذرا! اسی طرح چند ایسی کتابوں کے حوالے بھی اس کتاب میں نظر سے گذرے جن کے نام بھی کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے مثلاً سیر دہلی (۵ مقامات پر) تواریخ علمائے دہلی (۳ مقامات پر) مجموعہ واقعات (۶ مقامات پر) تحفۂ عزیزی (۳ مقامات پر) بکثرت انکشافات بھی کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ شاہ اسمٰعیل نے "حقیقت تصوف" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی۔ جو مرزا صاحب نے کشمیر میں دیکھی بھی تھی (ص۱۶۷) شاہ اسماعیل کے معاصر مورخ کتنے بے خبر تھے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی ایک ضخیم کتاب کی زیارت نہیں کی۔

---

[۳۵] غدر دہلی کے اخبار مطبوعہ ۱۹۲۳ء دہلی

سید عبدالحی حسنی (صاحب نزہتہ الخواطر) نے ۱۸۹۴ء میں سرگروہ اہل حدیث میاں نذیر حسین دہلوی کی زبانی ایک روایت سن کر اپنے سفرنامے (دہلی اور اس کے اطراف) میں من وعن، بے نقد و جرح درج کر دی تھی۔ یہ روایت بھی اسی مہم کا ایک حصہ ہے۔ جس کے ذریعے مولانا فضل حق کے دامنِ کردار پر، معائب کی افشاں چھڑکی جا رہی ہے۔ پہلے آپ روایت سن لیں۔ میاں نذیر حسین نے سید عبدالحی سے فرمایا[1]

"مولٰنا فضل حق صاحب ایک شادی میں شریک تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ پلاؤ کھایا ہو گا (؟) ناچ رنگ ہوتا رہا جس مکان کے بالا خانے پر یہ جلسہ تھا وہاں، جتنے ظرف پانی کے تھے سب میں کسی نے جمال گوٹہ ملا دیا۔ اور آمد و رفت کا راستہ بند کر دیا یعنی زینے کے دروازے میں باہر سے قفل لگا دیا۔ وہاں پلاؤ کھانے کی وجہ سے پیاس کی شدت سے لوگ خوب پانی پیتے رہے اور دست آنے شروع ہوئے۔ حاضرین و ارباب نشاط سب اس مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ راستہ بند ہونے سے اور پریشانی پھیلی۔ وہیں سب اپنی اپنی حالت میں تھے اور شدت گرمی سے پانی پیے جاتے تھے۔ کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ اس پانی میں زہر گھلا ہوا ہے۔ رات کو جب پولیس کے جوان روند میں ادھر آنکلے تو شور و غل سن کر اوپر چڑھے۔ دروازہ توڑا تو لوگوں کی یہ حالت دیکھی۔ ان میں مولوی (فضل حق) صاحب بھی تھے۔ جیسی کچھ خفت ان کو ہوئی، وہ ظاہر ہے۔"

میاں نذیر حسین کتنے ہی ثقہ راوی کیوں نہ ہوں، عقل اسے باور کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اور درایت کا فیصلہ یہ ہے کہ ایک اَن ہونی بات ہے۔ کہانی ہے فسانہ ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ اگر ہم روایت کو حقیقت پر مبنی فرض کریں گے تو اس کے ساتھ متعدد مفروضات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے تو ہمیں اکبر شاہ ثانی کی دلی میں شاہ عبدالعزیز کے دور کی دلی میں اور غدر سے ۳۰ سال پہلے کی دلی میں ایک ایسا شریف النفس اور باہوش میزبان فرض کرنا ہو گا جو اپنی اولاد کی شادی میں مدعو

---

[1] دہلی اور اس کے اطراف ص۲۱

معززین کے ساتھ ایسا گھناؤنا، پرخطر اور ناشائستہ مذاق کرسکتا ہو یا دوسرے مذاق کرنے والے "شرفا" کے ساتھ اس حد تک اغماض کرسکتا ہو کہ وہ اس کے معزز مدعووین کے ساتھ جو چاہیں معاملہ کریں۔ اور خود جا کر بستر پر دراز ہو جائے۔ پھر ایک ایسا بالاخانہ فرض کرنا ہوگا جو اوّلاً تو اتنا وسیع ہو کہ اس میں سرود و غنا کی محفل برپا کی جاسکے۔ ثانیاً۔ موسم گرما میں ایسی محفل کے لیے بھی موزوں ہو، ہوادار ہو۔ ثالثاً۔ اس میں آمد و رفت کا صرف ایک راستہ ہو۔ جسے مقفل کر دیا جائے۔ تو وہ بالاخانہ دنیا سے منقطع ہو جائے۔ رابعاً۔ وہ کسی دوسری عمارت سے متصل نہ ہو تاکہ اس میں محبوس و محصور حضرات کی آواز بھی برابر والے سن نہ سکیں۔ خامساً۔ اس میں کوئی دریچہ اور روشن دان تنگ نہ ہو کہ اس کے ذریعہ محلے والوں سے رابطہ قائم کیا جاسکے اور استعانت کی جاسکے۔ پھر یہ بھی فرض کرنا ہوگا کہ ان شرکاء بزم نشاط میں سے ہر فرد بلا استثنا اتنا قوی الاعضا بلکہ سخت جان تھا کہ شدید موسم میں پلاؤ کھانے کے بعد جمال گوٹے کا محلول گھنٹوں مسلسل پیتا رہے۔ اور مبتلائے اسہال رہے مگر ان میں سے ایک فرد کے بھی جان و تن کا رشتہ منقطع نہیں ہوا۔ بس صرف مولوی فضل حق صاحب کو خفت ہو کے رہ گئی۔

سید عبدالحی نے نزہۃ الخواطر کے جزء سابع میں بھی مولانا فضل حق کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کا ثبوت دیا ہے۔ اور نواب صدیق حسن خاں کے تنقیصی کلمات نقل کرنے کے سوا خود بھی لکھا ہے کہ [1]

> "ان کی وضع قطع علما کی سی نہیں تھی۔ امرا کی سی تھی شطرنج کھیلنے اور مزامیر سننے اور مجالس رقص میں شرکت اور دوسری ممنوع باتوں سے بھی پرہیز نہیں کرتے تھے۔"

آپ کو یاد ہوگا کہ وضع قطع کی بات نواب صدیق حسن سے منقول ہے۔ اور سماع مزامیر اور مجالس رقص میں شرکت کا اتہام میاں نذیر حسین کے عمل میں ڈھالا گیا ہے اور ہم ان کا جواب دے چکے ہیں۔ اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ باتیں حقیقت نہیں تہمت

---

[1] نزہۃ الخواطر الجزء السابع ص ۲۷۵۔

ہیں۔ اس کے برعکس ان کے تلمیذ مولانا عبداللہ بلگرامی کا بیان ہے کہ [2]

"ہر ہفتے قرآن کریم کا ختم فرماتے۔ تہجد کی نماز پابندی سے پڑھتے اور جو نوافل کا اتنا اہتمام کرتا ہو اس کے ادائے فرائض کا خود اندازہ کر لو۔"

مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:۔ [3]

"مولوی فضل حق صاحب، (مرزا غالب) کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ ان (مولنٰنا) کی عادت تھی کہ جب بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے "بیا برادر آؤ رے بھائی"۔ چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی فضل حق صاحب کی رنڈی بھی دوسرے دالان سے اٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا۔ ہاں صاحب اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے۔ "بنشیں مادر بیٹھ ری مائی۔"

اس لطیفہ کا صحیح واقعہ مرزا غالب کی بہن کے پوتے نواب سرور جنگ نے اپنی خود نوشت میں اس طرح درج کیا ہے [1]

"مرزا غالب کی مولانا فضل حق سے کمال دوستی تھی۔ ہر شب کو معمولاً مرزا مولانا کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک شب کو مولانا جو سررشتہ دار ریزیڈنٹ تھے باہر صحن میں بیٹھے ہوئے کچھ مسلیں دیکھ رہے تھے، ایک رنڈی بھی اس امر کی منتظر کہ مولانا دیکھ لیں تو سلام کر کے بیٹھ جاؤں۔ کھڑی ہوئی تھی۔ اس عرصے میں مرزا بھی لالٹین لئے آگے آ پہنچے۔ مولانا نے سر اٹھا کر کہا کہ "بیا برادر آؤ رے بھائی" مرزا نے کہا دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجئے کہ دیر سے منتظر کھڑی ہے۔ دوسرا مصرع یہ ہے "بنشیں مادر بیٹھ ری مائی"۔"

ہنومان گڑھی (اجودھیا) کی مسجد بابری کی بے حرمتی کے سلسلے میں ۱۸۵۵ء میں،

---

[2] خطبۂ ہدیہ سعیدیہ [3] آب حیات ص ۲۷۲

[1] کارنامہ سروری ص ۳۷ بحوالہ غالب نام آورم از نادم سیتاپوری۔

مولوی امیر علی امیٹھوی کی قیادت میں مسلمانوں نے جو جہاد کیا تھا بعض مورخین کا بیان ہے کہ مولانا فضل حق اس جہاد کے عدم وجوب کا فتویٰ دینے والے علماء میں شامل تھے۔ لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ الزام صرف سید کمال الدین حیدر نے عائد کیا ہے جو انگریزوں کے خاص آدمی تھے۔ اور جنھوں نے مسٹر ایلیٹ (مشہور مورخ) کی فرمائش پر اودھ کی تاریخ قیصر التواریخ مرتب کی تھی۔ اور اسی تاریخ کی بنا پر وہ واجد علی شاہ کے معتوب اور ملازمت سے برطرف ہوئے تھے۔ اور اسی الزام کو مولوی نجم الغنی خاں نے برسوں بعد اپنی تاریخ اودھ (مطبوعہ ۱۹۱۹ء) میں من و عن نقل کر دیا۔

مسجد پر ہندوؤں کے قبضے اور قرآن کریم کی بے حرمتی کے خلاف جب جہاد کی تحریک شروع ہوئی۔ اودھ کی حکومت نے اس کی مزاحمت کے لئے علما کی خدمات حاصل کیں۔ اور ایک استفتا مرتب ہوا جس کے جواب میں علماء نے مجاہدین کے مقابلے میں حکومت کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔ اس فتوے پر دستخط کرنے والے علما میں سید کمال الدین نے مولانا فضل حق کا بھی نام لیا ہے (ص ۱۲۵ قیصر التواریخ جلد دوم طبع ۱۹۰۷ء) مگر لطف یہ ہے کہ اسی کتاب میں ص ۱۲۷ پر جو وہ فتویٰ نقل کیا ہے اس پر مولوی محمد یوسف، مولوی حمد اللہ، مولوی خادم احمد، مولوی محمد سعد اللہ، مولوی تراب علی کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق کے نہیں ہیں۔ مولوی نجم الغنی خاں نے بھی تاریخ اودھ میں فتویٰ نقل کیا ہے مگر یہاں بھی مولانا کے دستخط نہیں ہیں — حدیقۃ الشہداء میں بھی جو مولوی امیر علی امیر المجاہدین کے ایک رفیق کی تالیف ہے اور اسی سال شائع ہوئی تھی[1] علماء کے فتوے درج ہیں لیکن مولانا فضل حق کا نہ فتویٰ ہے نہ دستخط۔ پھر آخر صاحب قیصر التواریخ کا یہ بے اصل بیان کیسے تسلیم کر لیا جائے خصوصاً جب کہ انہی کی اسی کتاب میں فتوے پر مولانا کے دستخط نظر نہیں آتے۔ ایک اور معاصر مؤرخ مولوی سید فخر الدین نے مہر جہاں تاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے مگر انھوں نے بھی مولانا فضل حق کا نام نہیں لیا۔ حدیقۃ الشہداء میں یہ ضرور درج ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں ایک پنچایت بنائی جس کے چار ثالث مقرر کئے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا فضل حق بھی تھے۔ مگر حکومت نے اس پنچایت کی کوئی میٹنگ ہی نہیں بلائی۔ اس لئے اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مولانا فضل حق کا اس سلسلے میں کس طرف رجحان تھا

---

[1] یہ نایاب کتاب رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "واجد علی شاہ اور ان کا عہد" میں کاملاً نقل کر دی ہے
لاہور ۱۹۵۷ء

تعارفِ تصانیف[1]

حاشیہ علامہ فضلِ حق خیرآبادی بر شرح سُلّم قاضی مبارک

قاضی مبارک گوپاموی کی شرح سُلّم کو درسیات میں جو بلند مقام حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب درس نظامی کے منتہی طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب علماء و فضلاء کی توجہ کا ہمیشہ مرکز رہی ہے۔ اس پر مختلف تعلیقات شروح اور حواشی لکھے گئے ہیں۔ جن میں ماہرین معقولات نے اپنے طباعی کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے فن کے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔

سلم العلوم کی مشہور و متداول شروح یہ ہیں ۱۔ شرح قاضی مبارک گوپاموی (م ۱۱۶۲ھ) ۲۔ شرح ملا احمد عبدالحق فرنگی محلی (م ۱۱۶۷ھ) ۳۔ شرح ملا مسافر (م) ۴۔ شرح حمداللہ سندیلوی (م ۱۱۶۰ھ) ۵۔ شرح ملا مبین (م ۱۲۲۵ھ) ۶۔ شرح ملا حسن فرنگی محلی (م ۱۲۰۹ھ) ان میں قاضی مبارک کی شرح سب میں ممتاز و اہم ہے۔ اس کا حاشیہ لکھ کر علامہ فضل حق کے قلم نے تحقیق و تدقیق کی جو گلکاری اور فن کے اسرار و رموز کے جن نقوش کی آرائش و زیبائش کی ہے اس سے اس حاشیہ کا دنیائے معقولات میں درجہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ اور اساطین فن نے اس کارنامے پر علامہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ علامہ کا یہ حاشیہ صرف کتاب کے غوامض کا حل نہیں ہے بلکہ معقولات کا ایک دائرۃ المعارف ہے جس میں فن کے تمام اہم مسائل پر بصیرت افروز محققانہ اور مجتہدانہ تبصرہ ہے۔ بعض ارباب علم نے تو اس کو معقولات کا فتاویٰ کہا ہے۔ یہ علامہ کی شاہکار تصنیف ہے۔ جس پر خود علامہ کو ناز تھا۔ جزیرہ انڈمان کی حراست کے زمانہ میں کسی نے دریافت کیا تھا کہ مولانا آپ ہندوستان میں کیا یادگار چھوڑ آئے ہیں۔ تو

---

[1] از رفیق محترم مفتی سید نجم الحسن رضوی ۱۲ شاہد نعمانی ۔

آپ نے جواب دیا کہ دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک فرزند عبدالحق ہیں اور دوسری یادگار قاضی کا حاشیہ۔

اس حاشیہ میں علامہ کے ذہن ثاقب نے فن کے جن حقائق سے بحث کی ہے دوسرے اصحاب شروح اور حواشی ان بلندیوں تک پہونچنے سے قاصر رہے ہیں۔

یہ حاشیہ پہلی بار ۱۳۱۷ھ میں مطبع مصطفائی دہلی میں طبع ہوا تھا۔ جسے قدردانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد نایاب ہو گیا۔

مالک مطبع خواجہ مصلح الدین جو علامہ کی قدر و منزلت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ کتاب کے آخر میں اس حاشیہ کا جو گرانقدر تعارف کرایا ہے اس سے فن معقول میں علامہ کی حذاقت اور عبقریت پر پوری طرح روشنی پڑتی ہے۔ خواجہ صاحب نے علامہ کو علوم حکمیہ کا بحر زخار کہا ہے جس کی شان یہ ہے کہ من شرب قطرۃ منه صار بحراً لا ساحل له۔ سب سے پہلے انھوں نے دوسرے علماء کے حواشی اور شروح کی حیثیت اور ان کے مقام علمی کے سلسلہ میں لکھا ہے:

وكثير من العلماء قد علقوا عليه التعليقات والحواشى لتزيل عنه الغواشى فلم تغن عن كشفه شيئاً۔

اس کے بعد امام المعقولات علامہ فضل حق کے حاشیہ کی علمی قدر و منزلت اور اس کے مقام کا تعین کیا ہے ۱۔

الا التعليقات للفاضل المشهور بالمنطق والعلوم العقليه بين الجمهور المعروف من الغرب الى الشرق المولوى محمد فضل حق الخيرابادى عامله الله بكرمه المتمادى يوم يناد المنادى الذى هو بحر المنطق والعلوم الحكميه من شرب قطرة منه فقد صار بحرا لا ساحل له وشيخا لاانحا صم له مرجعا ينجذب اليه كل استاذ لا مانع له - فان كنت فى شك مما اقول فمن مولفاته

التعلیقات المعلقہ علی شرح السلم للقاضی مبارک تشہد، علی قولی بلا فضول فان ما یشہد ویدل علی حال الفاعل حال المفعول فانظر الی ھذہ الحواشی والتعلیقات یظہر لک ما فیہا من غرائب التوضیحات والتحقیقات وابین لک شیئا مما فیہا علی الاجمال ۔

اس کے بعد خواجہ صاحب نے وہ خصوصیات ذکر کی ہیں جن کی وجہ سے اس حاشیہ کو برتری حاصل ہے۔ اس کا اردو میں خلاصہ درج ذیل ہے ۔

۱ :۔ شرح سلم قاضی میں جن معانی میں خفا باقی رہ گیا تھا علامہ کی تعلیقات میں ان کو ظاہر کر دیا گیا۔ اور لفظ و بیان کے اشکال کو دور کر دیا گیا جن مسائل کا کتاب میں بیان تھا ان کو دلائل سے آفتاب کی طرح روشن کر دیا گیا۔

۲ :۔ علامہ نے مسائل کی ایسی تنقیح فرمائی جس سے زیادہ ممکن نہیں اور ان کو اس طرح واضح فرمایا کہ اس سے زیادہ وضاحت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۳ :۔ اس حاشیہ میں علامہ نے منطق کے مشکل مسائل کی تحقیق کی ہے اور دقیق مباحث کو سہل انداز میں پیش فرمایا ہے ۔

۴ :۔ منطق کی درسی کتابوں کے دشوار مسائل کی پوری تنقیح فرما دی ہے ۔

۵ :۔ مختلف فیہ مسائل میں جو حق مسلک تھا اس کو محکم اور قطعی دلائل سے اس طرح ثابت کر دیا ہے کہ ذہین وغبی، اور ناقص مبتدی اور ماہر منتہی سب پر یکساں اس کی حقانیت واضح ہو گئی ۔

۶ :۔ جو منطق دانی کے مدعی ہیں حالانکہ وہ حقیقت میں اس سے بے بہرہ ہیں۔ اس حاشیہ کے دیکھنے کے بعد ان کو بھی اپنی بے مائگی کا اعتراف ہو جائے گا۔ اور وہ محسوس کریں گے کہ واقعی منطق وہ ہے جو اس حاشیہ کے مضامین میں ہے۔ اور یہ حاشیہ تمام کتابوں کا مغز ہے ۔

۷ :۔ طباعت سے قبل یہ حاشیہ جس کے پاس تھا وہ انتہائی اخفا سے کام لیتا تھا۔

طالب دید کتنے ہی حیلے کرتا (مگر اس کو زیارت نصیب نہ ہوتی تھی)

امہات مسائل

مندرجہ ذیل پانچ مسائل فن کے امہات مسائل میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عہد قدیم سے ان کے بارے میں حکماء کے درمیان اختلاف ونزاع کا ایک طویل سلسلہ چلا آرہا ہے (مسائل خمسہ) علم، وجود، جعل، کلی طبعی اور تشکیک کے بارے میں فضلاء دہر نے مستقل رسالے تصنیف کئے۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ جس کے فضل و کمال کا ہند و بیرون ہند میں ڈنکا بج رہا تھا وہ ان مباحث کو تشنہ چھوڑ دیتا۔ خاتم المحققین فاضل خیرآبادی کا قلم حقیقت رقم حرکت میں آیا اور انھوں نے ان مباحث پر سیر حاصل بحث کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ جس سے اربابِ دانش اور اصحابِ فکر ہمیشہ اپنی تشنہ لبی دور کرتے رہیں گے۔

مسئلہ وجود یہ فن کا بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ وجود کے دو معنی ہیں۔ وجود بمعنی مصدری (چیز کا موجود ہونا۔ پایا جانا) چونکہ یہ انتزاعی امر ہے۔ جو چیز کے موجود ہونے کے بعد اس سے منتزع ہوتا ہے اس لئے اس کی عینیت یا زیادت محل اختلاف نہیں۔ ۲۔ وجود ما بہ الموجودیۃ جس کو وجود حقیقی کہتے ہیں۔ اور اس کا نام وجود خاص بھی ہے۔ معرکہ آرائی اس کے بارے میں ہے کہ وہ ماہیت کا عین ہے یا زائد۔

اس کے بارے میں متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ وہ تمام حقائق میں زائد ہے۔ خواہ حقیقت واجبہ ہو یا ممکنہ کسی کا عین نہیں ہے۔ حکماء مشائیہ وجود کی دو مختلف حقیقتیں مانتے ہیں۔ ایک حقیقت واجبہ دوسری حقیقت ممکنہ۔ واجب میں ان کے نزدیک وجود عین ذات ہے واجب کے علاوہ تمام ممکنات میں وجود زائد ہے۔

اشاعرہ کے نزدیک وجود ایک حقیقت نہیں ہے بلکہ مختلف حقیقتوں کا نام ہے۔ ہر حقیقت کا وجود اس کا عین ہے۔

اشراقیہ کے نزدیک وجود ایک حقیقت ہے جو واجب اور ممکن دونوں میں

مشترک ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق عالم کون میں صرف ایک حقیقت موجود ہے جس کا فرد اکمل واجب تعالیٰ اور فرد ناقص ممکن ہے۔

میر زاہد اور صوفیا کرام وجود کو کلی نہیں بلکہ شخص مانتے ہیں۔ لہٰذا یہاں اشتراک یا عدم اشتراک کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان کے نزدیک مظاہر اور متعلقات کے لحاظ سے تعدد آیا ہے۔

میر زاہد اور صوفیا کرام کے مذہب میں فرق یہ ہے کہ صوفیا کرام وجود کے علاوہ کسی دوسری ذات کے قائل نہیں ہیں! ان کے نزدیک عالم کون میں محض وجود جلوہ گر ہے جو نام ہے واجب تعالیٰ شانہ کا۔ ممکنات تو اس کے اظلال ہیں! ان کی کوئی مستقل ذات نہیں۔

میر زاہد کے نزدیک ممکنات گو مستقل وجود رکھتے ہیں لیکن بذات خود وجود سے خالی ہیں۔ البتہ جب ان پر وجود واجب کا پرتو اور عکس پڑتا ہے تو وہ موجود کہلانے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ جیسے شمس کا پرتو پڑنے سے پانی کو شمس کہدیتے ہیں۔ (از افادات علامہ اجمیری)

اصل واقعہ یہ ہے کہ وجود کی عینیت اور زیادت پر فن کے دوسرے مسائل کی بنیاد ہے۔ اگر وجود کو عین مانا جائے تو جعل بسیط اور تشکیک فی الماہیت کی حقانیت ثابت ہوتی ہے! اور کلی طبعی کا وجود بھی خارج میں ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جب اشیاء کے وجودات اور تشخصات ماہیات کے عین ہیں۔ اور ماہیات خارج میں موجود ہیں تو اس مسلک پر مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز ایک ہے۔ وہی ماہیت کلیہ تمام وجودات اور تشخصات کا سرچشمہ ہے۔ محققین نے یہی مسلک اختیار کیا ہے اور حضرت ملا نظام الدین اور ان کے کل تلامذہ کا اسی طرف میلان ہے۔ (افادات مولانا اجمیری)

وجود کی عینیت پر مسئلہ حصول الاشیاء باشباحہا متفرع ہے! اور وجود کی زیادتی پر حصول الاشیاء بانفسہا۔ اشراقیہ پہلے قول کے اور مشائیہ دوسرے کے قائل ہیں۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے واجب اور ممکن دونوں میں عینیت وجود کے مسلک کو حق بتلایا ہے۔ حاشیہ قاضی میں رقمطراز ہیں:۔

وتحقیق المقام علیٰ وجہ یمیط غواشی الاوہام ان الوجود یمکن ان یراد

به معنیان۔ الاول المعنی المصدری والثانی منشأ انتزاعه۔ الاول لیس عینا الشیٔ من الحقائق اصلا والثانی عین الواجب فقط علی رای الحکماء وعین الممکن ایضا علی مذھب اھل الحق۔ (حاشیہ قاضی ص۲۱)

وجود کی عینیت پر جو مسائل متفرع ہیں۔ ان سب پر بھی علامہ نے محققانہ بحث کی ہے۔

مسئلہ علم اس کا شمار بھی فن کے معرکۃ الآرا مسائل میں ہے۔ اس مسئلہ کے مختلف عنوان ہیں۔ اور ہر عنوان خود ایک مستقل مسئلہ ہے۔ حاشیہ قاضی میں علامہ نے علم کی بحث میں درج ذیل عنوانات پر مجتہدانہ تبصرہ فرمایا ہے۔

(۱) تصور اور تصدیق کا مقسم علم حصولی حادث ہے یا مطلق حصولی۔

(۲) حضوری اور حصولی کی جانب علم کی تقسیم۔

(۳) حصول الاشیاء بانفسہا و باشباحہا کی تحقیق۔

(۴) مورد قسمت الشیٔ المطلق ہے یا مطلق الشیٔ اس کی تحقیق۔

(۵) علم کی کنہ بدیہی ہے یا نظری۔

(۶) علم کے بارے میں تیرہ مذاہب ہیں۔ یہ بہت نفیس بحث ہے۔ اس بحث کا آغاز علامہ نے اس طرح کیا ہے۔

اعلم انهم اختلفوا فی العلم اختلافاً عظیما فلنقص علیك حاله فنقول المذاهب التی بلغتنی ثلثة عشر۔

اس بحث کو علامہ نے بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

(۷) علم کو صورت قرار دینے کا بطلان (یہ بحث بھی اس موضوع پر نا جواب ہے)

(۸) معلوم کے بارے میں اختلاف۔ اسمیں علامہ نے بارہ مذاہب بتلائے ہیں۔

(۹) حصول الاشیاء بانفسہا پر اعتراضات و جوابات۔

(۱۰) مسئلہ وجود ذہنی پر اعتراضات اور جوابات۔

(۱۱) علماء کی اس بارے میں تصریح کہ علم حالت کا نام ہے۔

(۱۲) علم حصولی قدیم اور علم حضوری بدیہی اور نظری نہیں ہوتے۔
(۱۳) بدیہی اور نظری ہونا علم کی صفت ہے یا معلوم کی۔
(۱۴) واجب تعالیٰ کے علم فعلی کی بحث۔
(۱۵) واجب تعالیٰ کے لئے علم حضوری کا اثبات۔
(۱۶) واجب تعالیٰ کے علم فعلی میں افلاطون کا مسلک۔
(۱۷) اثبات علم واجب تعالیٰ میں مسالک۔
(۱۸) فارابی کے اس قول کی تحقیق کہ "العلم بالکل بعد ذاتہ"

خاتم المحققین علامہ خیر آبادی کا حاشیۂ قاضی تحقیقات کا گنجینہ ہے جس کا ہر صفحہ علمی حقائق سے مرصع اور "جام جہاں نماست ہر صفحہ دریں" کا مصداق ہے۔ مذکورہ مباحث کے علاوہ مندرجہ ذیل مسائل پر بھی علامہ نے محققانہ تبصرہ فرمایا ہے۔

۱ :۔ تحقیق لفظ سبحان۔ اور اس کے استعمال کے محل۔
۲ :۔ اجزاء حدیہ اور غیر حدیہ کی بحث۔ ۳ :۔ باری تعالیٰ کی بساطت کا ثبوت۔
۴ :۔ کنہِ واجب تعالیٰ کا علم۔ ۵ :۔ ابطال تماثل واجب تعالیٰ کے لئے۔
۶ :۔ واجب تعالیٰ کے لئے ابطال تجانس۔ ۷ :۔ ابن کمونہ کا توحید پر شبہ اور اس کا رد۔
۸ :۔ واجب تعالیٰ کے صفات کی تحقیق۔ ۹ :۔ واجب سبحانہ کی جسمانیت کا ابطال۔
۱۰ :۔ بحث جعل۔ ۱۱ :۔ وجود کے بارے میں مذاہب کا بیان۔
۱۲ :۔ میر باقر کے اس نظریہ کا ابطال کہ "مصداق الوجود فی الماہیات الممکنہ نفس الماہیۃ من
حیث الاستناد الی الجاعل۔"
۱۳ :۔ تحقیق معنی مصداق۔ ۱۴ :۔ وجود کے بارے میں حکماء اور متکلمین کا اختلاف۔
۱۵ :۔ متکلمین کے اس مسلک کی تحقیق کہ وجود ذات سبحانہ کے لئے زائد اور اس کا معلول ہے۔
۱۶ :۔ باری تعالیٰ کے لئے موجودیت کے اطلاق پر حکماء کا اختلاف (یہ نفیس بحث ہے)
۱۷ :۔ اس بات کی تحقیق کہ جاعل کی طرف احتیاج کی علت امکان ہے یا حدوث۔
۱۸ :۔ ممکن کے ایجاد پر قادر نہ ہونے کا استدلال ۱۹ : جعل کے بارے میں نزاع۔

۲۰:۔ اصحاب جعل بسیط اور مؤلف کے درمیان مدار اختلاف (وجود کی عینیت و زیادت میں)

۲۱:۔ ذاتیات کا جعل مجعول ہے یا نہیں ۲۲:۔ نسبت کا خارج میں عدم وجود۔

۲۳:۔ اصحاب جعل مؤلف کے شبہات اور ان کا رد ۲۴:۔ بحث و اتفاق کے معنی کی تحقیق۔

۲۵:۔ بحث مقدمہ علم و مقدمہ کتاب۔ ۲۶:۔ بحث متعلق تصدیق۔

۲۷:۔ "التصور والتصدیق نوعان متباینان من الادراک" کا بیان۔

۲۸:۔ وجود ذہنی پر اشکال اور اس کے جوابات۔ ۲۹:۔ معنی نظری و بدیہی کی تصدیق۔

۳۰:۔ بیان برہان تضعیف و تضایف ۳۱:۔ برہان تطبیق کا بیان۔

۳۲:۔ العدد عرض۔ ۳۳:۔ اکتساب التصور من التصدیق کا بیان۔

۳۴:۔ تحقیق معنی فکر و حدث ۳۵:۔ المعرف یفید علما جدیدا ام ہو آلۃ لملاحظۃ المعرَّف

۳۶:۔ تحقیق معنی موضوع و اعراض ذاتیہ ۳۷:۔ بیان تقسیم واسطہ۔

۳۸:۔ عرضی و ذاتی کی تقسیم۔ ۳۹:۔ معقول ثانی کی تحقیق (بہت ہی کارآمد اور مفید ہے)

۴۰:۔ کلیۃ، جزئیۃ، ذاتیۃ، عرضیۃ، وجود اور لوازم ماہیت کا شمار معقولات ثانیہ میں ہے
یا نہیں؟

۴۱:۔ معقولات ثانیہ سے معقود قضایا ذہنی ہیں یا خارجی یا حقیقی۔ اور قضیہ ذہنیہ و خارجیہ
وحقیقیہ کی تقسیم کا بیان۔

۴۲:۔ ظرف اتصاف کی تحقیق (بہت تفصیلی اور نافع بحث ہے)

۴۳:۔ بحث قیام الوجود بالماہیۃ من حیث ہی ہی۔ ۴۴:۔ تحقیق ظرف الاتصاف بالوجوب۔

۴۵:۔ تحقیق ظرف الاتصاف بالامکان ۴۶:۔ تحقیق الحیثیۃ المعتبرۃ فی الموضوع۔

۴۷:۔ تحقیق موضوع المنطق ماہو۔ ۴۸:۔ بحث معقولات ثانیہ یا معلوم تصوری و تصدیقی۔

۴۹:۔ بحث امہات المطالب ۵۰:۔ اس بات کا بیان کہ ما حد اور جنس اور نوع میں
منحصر ہے۔

۵۱:۔ تقسیم ہل اور تثلیث قسمت ہل ۵۲:۔ بحث "التقرر مقدم علی الوجود"

۵۳:۔ تعریف ہلیہ بسیطہ و مرکبہ۔ ۵۴:۔ تحقیق قضیہ "زیدٌ معدومٌ"۔

۵۵۔ بیان ان النسبۃ السلبیۃ ربط أو سلب ربط۔

۵۶۔ بحث ان فی الہلیۃ البسیطۃ نسبۃ رابطۃ ام لا۔

۵۷۔ بیان ان فی القضیۃ نسبۃ اخریٰ سوی النسبۃ التامۃ الخبریۃ۔

۵۸۔ بیان ان فی الہلیۃ المرکبۃ نسبۃ اخریٰ۔

۵۹۔ اختلاف محقق الدوانی مع معاصرہ الصدر فی الحل الاولی۔

۶۰۔ تحقیق تعداد اجزاء قضیہ۔

عنوان مذکورہ پر نظر ڈالنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس حاشیہ میں فن کے تمام اہم مسائل کو زیر بحث لاکر ان پر محققانہ رائے قائم کی گئی ہے۔ اس لئے اس کو فن معقول کا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کہنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ کچھ عرصہ ہوا جب پاکستان میں اس کا دوسرا ایڈیشن فوٹو آفسٹ پر شائع ہوگیا ہے۔ جو مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے۔

الہدیۃ السعیدیہ

علامہ فضل حق خیر آبادی کی یہ تصنیف برصغیر کی تمام عربی درسگاہوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا آغاز اس طرح ہوا کہ علامہ اپنے شہرہ آفاق فرزند مولانا عبدالحق کی تدریس کے لئے اسباق تحریر فرما دیتے تھے۔ جب معتد بہ حصہ ہوگیا تو تلامذہ نے استدعا کی کہ مباحث کے اضافہ کے بعد ان کو مکمل کتاب کی حیثیت دیدی جائے۔ علامہ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اپنے شبدیز قلم کو رواں کر دیا۔

اس کتاب میں ابطال اجزاء لایتجزی، اثبات ہیولیٰ، بحث زمان ومکان کو بہت وضاحت کے ساتھ سہل انداز میں بیان فرمایا ہے۔ اور دوسرے مایعم الاجسام کے مسائل کی بھی خوب توضیح فرمائی ہے۔ عنصریات کی بحث بڑے بسط وتفصیل سے لکھی ہے۔

کتب درسیہ میں اس تفصیل اور وضاحت کو اگر ہدیہ سعیدیہ کا مخصوص حصہ سمجھا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اپنی تحقیق کے مطابق حرکت ارض کے ابطال پر دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں۔

علامہ نے یہ کتاب بہت عجلت کے عالم میں لکھی ہے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے،

"وبعد فهذه جملة جميلة فى الحكمة الطبيعية يزرى بزهوها
بالنوار الربيعة نطقت بها ارتجالا ونمقتها استعجالا -"

عجلت میں لکھی جانے کے باوجود یہ کتاب معقولات کے بتدی طلبہ کے لئے شافی و کافی ہے۔ اگر حکمۃ طبعیہ میں ہدیہ سعیدیہ اور الٰہیات میں مولانا عبدالحق خیرآبادی کی الجواہر الغالیۃ طلبہ کے درس میں داخل کر دی جائیں تو فلسفہ کی استعداد بدرجہ اتم پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اعلیٰ کتابیں وہ پوری بصیرت کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ ہدیہ سعیدیہ میں نفس کی بحث میں کچھ حصہ ناقص رہ گیا تھا۔

علامہ نے الخاتمۃ فی المباحث کے سلسلہ میں جو بیان کے عنوان قائم کئے ہیں وہ یہ ہیں:- البحث الاول ان النفس مغایرۃ للمزاج - البحث الثانی ان النفس مغایرۃ للبدن البحث الثالث ان النفس الناطقۃ مجردۃ عن المادۃ، البحث الرابع فی لنفس الناطقۃ هل هی حادثۃ او قدیمۃ ، البحث الخامس فی اتحاد النفوس بالماهیۃ واختلافها

البحث الخامس بھی ناتمام رہ گیا تھا اور اس کے بعد کی پانچ اور بحثیں لکھی جاکی تھیں جن کی تکمیل مولانا عبداللہ بلگرامی کی فرمائش پر علامہ کے فرزند مولانا عبدالحق خیرآبادی نے کی جو بطور تتمہ کتاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مبحث سادس عقیدۂ تناسخ کے رد میں ہے۔ مبحث سابع میں النفس تبقی بعد خراب البدن ولا تفنی کا بیان ہے مبحث ثامن میں النفس مدرکۃ للکلیات والجزئیات ام ہی مدرکۃ للکلیات کا بیان ہے۔ مبحث تاسع میں کیفیت تعلق النفس بالبدن سے بحث کی گئی ہے۔ مبحث عاشر میں مراتب نفس انسانی فی الادراکات کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہ کتاب علامہ عبداللہ بلگرامی کے تحشیہ التحفۃ العلیہ کے ساتھ طبع ہوئی ہے آخر میں بطور ضمیمہ مولانا سلطان حسن بریلوی کا وہ رسالہ شامل کر دیا گیا ہے جس میں انھوں نے مفتی سعداللہ صاحب کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو انھوں نے ہدیہ سعیدیہ کی بعض عبارتوں پر کئے تھے۔ یہ کتاب ہندوستان میں برابر طبع ہوتی

رہتی ہے۔ اور پاکستان میں بھی طبع ہوئی ہے۔ نصف صدی قبل یہ جامع ازہر مصر کے نصاب میں بھی داخل تھی۔ اسی زمانہ میں اس کا مصری اڈیشن بھی شائع ہوا تھا۔

الرّوض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود

علامہ فضل حق خیر آبادی نے یہ رسالہ وحدۃ الوجود کے اثبات میں تحریر فرمایا ہے۔ مسئلہ وحدۃ الوجود صوفیائے کرام کے درمیان مدت سے ما بہ النزاع چلا آرہا ہے۔ اس کا تعلق درحقیقت کشف و حال سے ہے نہ کہ قیل و قال سے۔ لیکن علامہ نے اپنی سحر نگاری سے حال کو قال کے قالب میں بدل دیا ہے۔ قلم کی روانی، اور فکر کی جولانی نے تحقیق میں جان ڈال دی ہے۔

استاذ محترم مولانا حکیم احمد علی صاحب خیر آبادی بیان فرماتے تھے کہ علامہ کا دوران سفر میں ایک بار بریلی میں گزر ہوا۔ وہاں کے اہل علم نے علامہ کی آمد کو غنیمت سمجھتے ہوئے مسئلہ وحدۃ الوجود پر سوالات اور اعتراضات کا طویل سلسلہ شروع کر دیا اس کے جواب میں موصوف نے فرمایا کہ جہاں تک دلائل و براہین کا تعلق ہے وہ میں آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد تسلیم کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔

پھر علامہ نے اس موضوع پر ایسی جامع اور مدلل تقریر فرمائی کہ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ علامہ اقبال کے کلام کے مشہور شارح اور مبصر پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے کہ علامہ خیر آبادی کے دلائل دیکھ کر میں بھی وحدۃ الوجود کا قائل ہو گیا ہوں۔ یہ کتاب بھی علامہ نے بہت عجلت میں لکھی ہے۔ فرمایا ہے:۔

"وسمیتها بالروض المجود ملیتها مرتجلا من دون بذل المجهود فی تحقیق ما علیه ائمة الکشف والشهود۔ (الرّوض المجود)

یہ کتاب پہلی بار ۱۳۱۳ھ میں مطبع مفید الاسلام حیدر آباد دکن میں طبع ہوئی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل دوبارہ ہندوستان میں مولانا سید غلام جیلانی کے مکتبۂ سمنانی (جس کا دفتر پہلے میرٹھ میں تھا) کے زیر اہتمام اس کی طباعت وجود پذیر ہوئی ہے۔

پاکستان میں مولانا حکیم محمود احمد برکاتی کے فاضلانہ اردو تراجم کے ساتھ مکتبہ قادریہ

اندرون لوہاری دروازہ لاہور میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں مولانا عبد الحکیم شرف قادری نے عربی زبان میں علامہ کا تعارف بھی کرایا ہے۔

رسالہ کلی طبعی

کلی طبعی کی بحث معقولات کے اہم مسائل میں شمار کی جاتی ہے علامہ فضل حق نے اس پر مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ جس کی ضخامت کاپی سائز پر باریک قلم سے پچیس۲۵ صفحات ہے۔ علامہ فن معقول کے بحر ناپید اکنار تھے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا تحقیق کے دریا بہا دیئے ہیں۔ رسالہ کلی طبعی میں بھی یہی شان نظر آتی ہے۔ رسالہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

"اعلم انه قد استمر الخلاف بين الاسلاف والاخلاف من الحكماء في امر الكلي الطبعي فذهب الجمهور الى ان الكليات التي هي الانواع او ذاتيات للموجودات الخارجيه كالانسان والحيوان واللون والبياض موجودات في الخارج بالذات بعين وجودات افرادها والكليات التي هي عرضيات صادقه على الموجودات الخارجية كالكاتب والماشي موجودة بوجود ما يصدق هي عليه بالعرض۔"

یہ رسالہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے۔

اِمتناع النظیر

علامہ فضل حق خیر آبادی نے یہ کتاب بزبان فارسی مولوی حیدر علی رامپوری کے اقوال کی تردید میں تحریر فرمائی ہے اس کتاب کے سرورق کا عنوان ہے رسالہ امتناع النظیر (صلی اللہ علیہ وسلم)

لفضل حق الخیرآبادی علیہ رحمۃ الباری۔

فی تردید اقوال، مولوی حیدر علی رامپوری بولد اُد الٹونکی مسکنا۔

تحشیہ و تصحیح:۔ راس المحدثین و رئیس المتکلمین مولانا سید شاہ سلیمان اشرف صاحب القادری الچشتی۔

فاضل خیر آبادی نے اس کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا مثل و نظیر ممتنع بالذات ہے۔ تحت قدرت داخل نہیں ہے۔

افاد استاذنا العلام حالا دعویٰ میکنم کہ شخصے کہ برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در کمالات باشد ممتنع بالذات است و ہرچہ ممتنع بالذات است تحت قدرت الٰہی داخل نیست۔ (امتناع النظیر ص۲)

اپنے اس قول کی تائید میں شرح مواقف اور شرح عقائد عضدیہ کی درج ذیل عبارت نقل فرمائی ہے:۔

”قال فی شرح المواقف المصحح للمقدوریة هو الامکان لان الوجوب و الامتناع الذاتیین یحیلان المقدوریة. وفی موضع آخر منه علمه تعالیٰ یعم المفهومات کلها الممکنة والواجبة والممتنعة فهو اعم من القدرة لانها تختص بالممکنات دون الواجبات والممتنعات. وفی شرح العقائد العضدیة المصحح للمقدوریة هو الامکان (امتناع ص۳)

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی مساوی (نظیر) تسلیم کیا جائے تو وہ تمام صفات میں آپ کے برابر ہوگا جس میں صفت خاتم النبیین بھی ہے تو اس ختم نبوت کے عقیدہ پر ضرب پڑتی ہے جو صراحۃً کفر ہے۔ امتناع النظیر کے ص۱۵ پر اس کی خوب وضاحت کی ہے۔ اور اس کی دلیل نقلی سے توثیق فرمائی ہے:۔

”واز حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کہ مسلم روایت کردہ ہمراں ارشاد شدہ است ارسلت الی الخلق عامة وختم بی النبیون نیز امتناع ذاتی مساوی آنحضرت صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم در نعوت کمال ثابت است۔ چہ بر تقدیر امکان مساوی و فرض وجود آن یا ہر دو صفت دران یافتہ شوند یا نہ۔ اگر یافتہ نشوند آں مساوی مساوی نشد و اگر یافتہ شوند آں مساوی مرسل الی الخلق کافہ باشد پس آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم از امت او باشد پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مساوی او نباشد۔ و نیز بر تقدیر ایں کہ آں مساوی آخرین ہمہ انبیاء باشد تا معنی ختم بہ النبیون در آں یافتہ شود۔ بریں تقدیر ضرورت است کہ در آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفت ختم بہ النبیون کہ ارشاد شدہ است یافتہ نشود۔ پس آں

حضرت صلے اللہ علیہ وسلم مساوی او نشد ندیس او مساوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نشد۔ بہر کیف وجود مساوی مستلزم عدم آنست و ہر چہ وجودش مستلزم عدم آں است محال بالذات است۔"

علامہ نے اس کتاب میں ضمناً صفات باری تعالیٰ سے بھی بحث کی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:۔

اکنوں باید دانست کہ در مسئلہ صفات کمالیہ حضرت واجب الوجود سبحانہ اختلاف است۔ معتزلہ و فلاسفہ و حضرات صوفیاء کرام و محققین و متکلمین صفات کمالیہ را عین ذات می دانند و عامہ متکلمین صفات کمالیہ را غیر ذات حقہ اعتقاد می کنند و عامہ اشاعرہ می گویند صفات او سبحانہ، نہ عین او یند نہ غیر او یند۔ وحال ایں مسئلہ آنست کہ در شرح عقائد جلالی می گویند۔ اعلم ان مسئلۃ زیادۃ الصفات وعدم زیادتہا لیست من الاصول التی یتعلق بہا التکفیر احد الطرفین وقد سمعت بعض الاصفیاء انہ قال عندی ان زیادۃ الصفات وعدم زیادتہا مما لایدرک بالکشف ومن اسندہ الی الکشف فانہ ترآی لہ ما کان غالبا علی اعتقادہ بحسب الفکر النظری ولا اری باسا فی اعتقاد احد طرفی النفی والاثبات فی ہذہ المسئلۃ انتہی

(امتناع ص ۶۸، ۶۹)

اس کے بعد علامہ نے تفصیل سے اس مسئلہ کو رقم فرمایا ہے۔ آخر میں اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر فرمائی ہے:۔

"وحق دریں مسئلہ این ست کہ مصداق صفات کمالیہ نفس ذات حقہ است۔ بلا زیادۃ امر علیہا و مفاہیم انتزاعیہ صفات عین ذات حقہ نیستند۔ (امتناع صـ

اس کے بعد اشاعرہ کے مسلک کی مختلف شقوں پر بحث کی ہے۔ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کو مدت دراز سے اس کتاب کے دیکھنے کی تمنا تھی۔ بالآخران کو یہ نسخہ اپنے استاذ حضرت العلامہ ہدایت اللہ خاں صاحب سے حاصل ہوا۔ یہ مسودہ خود مصنف کتاب علامہ خیرآبادی کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ استاد محترم نے ان کو اس کی طباعت کی بھی اجازت دیدی۔ اس کے بعد موصوف نے استاذ العلماء مولانا برکات احمد ٹونکی

اور مولانا عبد المقتدر بدایونی کے نسخوں سے مقابلہ کر کے دوسرے فضلاء عصر کی تصحیح، اور اپنی شب و روز سہ سالہ کاوش و تصحیح کے بعد ایک خطیر رقم صرف کر کے اس کی طباعت و اشاعت کا فرض انجام دیا۔ اس کتاب میں مفید حاشیہ کے ساتھ قصیدہ کا حل لغات بھی موجود ہے۔ ۲۰ راگست ۱۹۰۸ء کو جادو پریس جونپور میں اس کی طباعت عمل میں آئی عرصہ دراز سے یہ بالکل نایاب ہے۔ مکتبہ قادریہ لاہور کے زیر غور اس کی دوبارہ اشاعت ہے۔

تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ

یہ کتاب بھی علامہ فضل حق کی مشہور تصنیف ہے۔ فارسی زبان میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے اور صاحب شفاعت ہونے کو اور دوسرے فضائل و کمالات کو براہین قاہرہ سے ثابت کیا ہے۔ تحقیق الفتویٰ میں سوالات قائم کر کے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب کچھ عرصہ ہوا جب مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے مع اصل اور ترجمہ کے باضافۂ مقدمہ پہلی بار شائع کیا ہے۔

رسالہ قاطیغوریاس

علامہ کا یہ رسالہ جوہر اور عرض کی تحقیق میں ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ ساٹھ صفحات پر ہے۔ اب تک یہ طبع نہیں ہوا ہے۔

رسالہ علم و معلوم

اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ رضا لائبریری رامپور میں اس کا ایک مخطوطہ ہے۔ یہ رسالہ بھی اب تک طباعت کا منت پذیر نہیں ہوا ہے۔ رسالہ کی اہمیت کے لئے علامہ فضل حق کا نام کافی ہے۔

حاشیہ افق المبین

یہ حاشیہ علامہ کی اہم تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے اس کے قلمی نسخے خاص خاص لائبریریوں میں اور شخصی خزینۂ کتب میں محفوظ ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خود نوشت نسخہ ہے جو ناقص الآخر ہے۔

استاد محترم مولانا اجمیری کے کتب خانہ میں یہ نسخہ بڑی تقطیع پر لکھا ہوا تھا اور

ضخامت بھی خاصی تھی۔ اب تک اس گوہر گرانمایہ کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ کاش علامہ کے صاحب ثروت ارادت مندان کی غیر مطبوعہ تصانیف کے شائع کرنے کی طرف توجہ کرتے یا کوئی علمی ادارہ حکمت و دانش کی کتابوں کے تحفظ کے جذبہ سے ان کو طبع کرا دیتا۔

شرح تہذیب الکلام

شمس العلماء مولانا عبد الحق خیر آبادی کی ملکیت میں اس کا جو نسخہ تھا ان کے رحلت فرمانے کے بعد ملازمین نے ردی میں اس کے اوراق استعمال کر ڈالے کسی اور نسخہ کا ابتک علم نہ ہو سکا

حواشی تلخیص الشفاء

ہدیہ سعیدیہ میں علامہ نے تحریر فرمایا ہے کہ مسائل حکمیہ کے متعلق ہماری ذاتی تحقیق حواشی تلخیص الشفاء میں ہے۔ تلخیص الشفاء علامہ فضل امام خیر آبادی کی تصنیف ہے۔ اس پر فاضل خیر آبادی نے حواشی لکھے ہیں۔ اس کتاب کے کسی نسخہ کا اب تک علم نہ ہو سکا۔

رسالہ فی تحقیق حقیقۃ الاجسام

اس رسالہ میں اجسام کی حقیقت پر علامہ نے محققانہ بحث کی ہے۔ الہدیۃ السعیدیہ کے ص۱۹ پر اس رسالہ کا ذکر موجود ہے:۔

"وللقوم فی ہٰذا المقام اقوال قد فرغنا عن ابطالہا فی حواشینا علی تلخیص الشفاء و رسالتنا المعقودۃ فی تحقیق حقیقۃ الاجسام"

یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس رسالہ کی ضخامت کیا ہے اور اس کا کوئی نسخہ کسی لائبریری یا شخصی کتب خانہ میں محفوظ ہے یا نہیں۔

رسالہ تشکیک فی الماہیات

تشکیک فی الماہیت کا مسئلہ فن کے اہم مسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ عہد قدیم سے بحث و تمحیص کا موضوع رہا ہے۔ علامہ نے فن کے دوسرے اہم مسائل کی طرح اس مسئلہ پر بھی اپنے قلم حقیقت رقم کو متحرک کیا ہے۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے خطبۃ التحفۃ العلیہ حاشیہ ہدیہ سعیدیہ میں علامہ کی تصانیف کی فہرست میں اس کا ذکر ہے یہ رسالہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

ضمیمہ

سلسلۂ تلامذہ

جیسا کہ گذر چکا ہے کہ علامہ کا سلسلۂ تلامذہ و تلامذۃ التلامذہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند، حجاز، بخارا، افغانستان اور دوسرے دور دراز ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندستان کے اکابر مشاہیر جامع العلوم مولانا احمد رضا خاںؒ بریلوی متوفی ۱۹۲۱ء، مولانا شبلی نعمانی م ۱۹۱۴ء، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی وغیرہم اسی دریائے فیضان سے سیراب ہوئے ہیں۔

تلامذہ اور تلامذۃ التلامذہ کی فہرست میں ایسے ایسے نامور اور اہل فضل و کمال افراد گذرے ہیں کہ مستقل کتاب ان کے حالات میں مرتب ہو سکتی ہے۔ اس جگہ ان کے تفصیلی ذکر کا نہ موقعہ ہے نہ گنجائش۔ صرف علامہ سے لے کر ہیچمداں تک اکابر سلسلہ کا مختصر تذکرہ درج کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی

محقق جلیل، مدقق نبیل، سرخیل فضلاء عصر، سرآمد کملاء دہر، شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی دہلی میں ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ خوش بخت و بلند طالع مشہور ہوئے۔

---

[1] مشہور احرار لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی مولانا عبدالعزیز پنجابی تلمیذ مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد ہیں۔ مولانا عبدالحق جب اپنے والد ماجد کے ساتھ پنجاب گئے تھے۔ تو مولوی عبدالعزیز کو بچپن میں دیکھا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد جب مولانا کی خدمت میں تعلیم کے لئے حاضر ہوئے تو پہلی نظر ہی میں پہچان لیا! اور شریک درس کر لیا۔ ۱۲ شاہد شروانی۔

زمانۂ قیام خیرآباد میں رویتِ ہلال کے بعد فال نیک کے طور پر لوگ چہرہ آ آ کر دیکھ کرتے تھے۔ [1]

ہوش سنبھالا تو باپ کی علمی مجلسوں کا رنگ دیکھا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور کا دربار علمی نظر سے گذرا۔

علماء میں، مولانا رشید الدین خاں، مولوی مخصوص اللہ بن مولانا شاہ رفیع الدین مولانا قطب الدین خاں، مولوی کریم اللہ، مولوی سید محبوب علی، مولوی نصیر الدین شافعی، مولانا محمد نور الحسن، مولانا مملوک علی، سراج العلماء مفتی سید رفعت علی، آخون شیر محمد افغانی، مولوی سید امان علی، شاہ محمد اسحاق محدث،

مشائخ میں، مولانا شاہ غلام علی، مولانا شاہ ابو سعید، حضرت شاہ محمد آفاق مجددی، حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب، خواجہ محمد نصیر۔

شعراء میں، مرزا اسد اللہ خاں غالب، امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن وغیرہم انھیں باکمال اساتذہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ چاروں طرف علم و ادب کے چرچے تھے۔

والدِ گرامی نے تربیت کے ساتھ ساتھ تدریس و تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ہاتھی اور پالکی پر دربار آتے جاتے وقت درس دیتے۔ پڑھاتے بلکہ گُنٹتے، ۱۶ سال کی عمر میں تمام درسیاتِ منقول و معقول سے فارغ کر دیا۔

مولانا کا آبائی وطن خیرآباد بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ شاہی زمانے میں کمشنری رہ چکا تھا۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ صاحب کمال اور اہل فن افراد، ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔ ہندستان کے مردم خیز قصبوں کے صف اول میں اس کا شمار رہا ہے۔ [2]

---

[1] حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء، تالیف مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی۔

[2] بیان کیا جاتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی میں سلطان ابراہیم نے خیرآباد آباد کیا۔ منتخب التواریخ میں ہے۔ "چند قصبہ بنا فرمود از انجملہ خیرآباد و امین آباد وغیر ذالک و در رشید السلاطین نوشتہ اند"

عہدِ اکبری میں سرکاری کمشنری بنایا گیا۔ یہاں نائب صوبہ دار یا ناظم رہا کرتا تھا۔ حدود علاقۂ زیر حکومت کو سرکار کہتے تھے۔ ناظم کے ماتحت کئی نائب ناظم (چکلہ دار) ہوا کرتے تھے۔ ان کے زیر حکومت علاقہ کو چکلہ کہا جاتا تھا۔ اس نظامِ حکومت میں

خیرآباد و دہلی کی علمی صحبتوں نے کم عمری ہی میں مرتبۂ کمال کو پہونچا دیا تھا۔ علامہ کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ ایک مرتبہ موصوف حاشیۂ قاضی کے اوراق لکھنے میں کہیں ضرورت سے اٹھ کر چلے گئے۔ مولانا عبدالحق اتفاق سے پہنچ گئے۔ ایک صفحہ پورا لکھ ڈالا۔ علامہ نے دیکھ کر دریافت کیا اور اصل حقیقت معلوم ہونے پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس وقت مولانا کی عمر ۱۴ سال تھی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۴) بائیس محال یا پرگنے شامل تھے۔ ان میں سے متعدد محال اضلاع کھیری و ہردوئی میں واقع تھے۔ خیرآباد خود محال بنام پرگنہ حویلی خیرآباد مشہور تھا۔ اسمیں مزروعہ آراضی ۱۵۹،۰۵۷،۲ بیگھہ تھی اور مالگذاری ۲۴۱۲۲۳۴ دام زمیندار برہمن تھے فوجی قوت ۵۰ سوار، ۲۰۰ پیدل حکومت کے لئے تیار رکھتے تھے۔ ابتدا عملداری انگریزی سے اسکی آبادی میں کمی ہو رہی ہے ۱۸۶۹ء میں جب پہلی مردم شماری ہوئی تو ۱۵۷۰۷ آبادی تھی۔ حالیہ مردم شماری میں ۲۳۶۳۴ ہے۔ ۶۱ فی صدی مسلمان اور ۳۹ فی صدی غیر مسلم ہیں۔ دو چار محلوں کے سوا باقی محلے غیرآباد ہیں۔ مساجد شمار سے متجاوز مگر غیرآباد و ویران زیادہ ہیں حسب ذیل ناظم و متعینہ خیرآباد ہوئے۔

۱۔ شیر علی

۲۔ مرزا عبداللہ بیگ بانی مسجد مصرکھو سنہ ۱۲۰۹ھ

۳۔ مرزا بندے علی بیگ سنہ ۱۲۵۶ھ

۴۔ مولوی فریدالدین گوپاموی۔

۵۔ حکیم امجد علی والد ماجد حضرت مولانا ہادی علی خاں رحمۃ اللہ علیہ سنہ ۱۲۳۶ھ

۶۔ حکیم مرزا مہدی علی خاں سنہ ۱۲۴۲ھ

۷۔ وزیر بیگ عرف مینڈو خاں

۸۔ محمود علی خاں۔

۹۔ مرزا ابوالحسن

۱۰۔ مرزا محمد ہادی۔

۱۱۔ محمود علی خاں

۱۲۔ امرت لال پاٹھک سنہ ۱۲۴۰ھ

۱۳۔ گوردھن لال سنہ ۱۲۶۹ھ

۱۴۔ گردھاری لال۔

۱۵۔ گردھارا سنگھ۔

۱۶۔ راجہ درشن سنگھ۔

۱۷۔ ہر پرشاد سنہ ۱۲۶۹ھ

۱۸۔ ولی محمد خاں۔

۱۹۔ سید محمد حسین خانبہادر سہوانی

۲۰۔ کنور فتح چند۔

۲۱۔ راجہ نارائن دھن۔

۲۲۔ شیخ امام بخش۔

۲۳۔ مرزا ولی بیگ خاں۔

۲۴۔ مرزا منصور بیگ۔

۲۵۔ مولوی غلام یحییٰ خاں۔

شاہی گڑھی کے آثار اب تک محلہ میاں سرائے میں موجود ہیں۔ محلہ فراشخانہ، توپخانہ بھی موجود ہیں قابل دید عمارتوں میں مکان جمعدار کا امام باڑہ، منشی نیاز احمد بانی مدرسہ نیازیہ خیرآباد کا پختہ محل علامہ فضل حق کی سنگین عالیشان محل سرا اور مدرسہ عربیہ نیازیہ کی بلند و بالا عمارتوں نے قصبہ کی شان کو دوبالا کر دیا تھا۔ علامہ کی محل سرا کے سوا باقی عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ یہ مدرسہ ۱۳۱۶ھ میں بن کر تیار ہوا۔ مولانا عبدالحق کے شایان شان بنایا گیا تھا۔ بانیٔ مدرسہ کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ افسوس کہ اختتام تعمیر سے ایک سال قبل ہی یہ آفتاب علم غروب ہو گیا۔

والد ماجد کے ساتھ الور آنا جانا رہتا۔ مہاراجہ مولانا کی بول چال اور علم و فضل کے شیفتہ ہو گئے۔ علامہ کے الور سے چلے جانے کے بعد ان کو عائد و ارکان سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں الور ہی میں قیام تھا۔ پھر دہلی پہنچ گئے۔ وہاں سے والد ماجد کے ساتھ اواخر ستمبر ۱۸۵۷ء میں خیرآباد کے لئے روانہ ہوئے۔ باپ کی گرفتاری پر لکھنؤ پہونچ کر پیروی کی۔ جزیرہ انڈمان جانے کے بعد کچھ عرصہ خیرآباد میں، گذارا۔ پھر نواب صاحب کی طلبی پر ٹونک چلے گئے۔ دو سال وہیں قیام فرمایا۔ فضل و کمال اور درس و تدریس کی شہرت ہندستان سے نکل کر بیرون ہند پہنچ چکی تھی۔ گورنمنٹ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لئے خدمات حاصل کر لیں۔ وہیں مولانا محمد اسماعیل اور مولانا ولایت حسین جیسے نامور شاگردوں نے تکمیل درسیات کی۔ کلکتہ کی آب ہوا ناموافق ثابت ہوئی۔ نواب کلب علی خاں کے اصرار پر رامپور تشریف لے گئے۔ نواب نے شاگردی اختیار کی۔ اور تعظیم و تکریم کا حق ادا کر دیا۔ بادشاہ تیمور نے علامہ تفتازانی کی جیسی آؤ بھگت کی تھی۔ نواب نے بھی ویسی برتاؤ کیا۔ ۱۲۸۱ھ سے ۱۳۰۰ھ تک حاکم مرافعہ اور پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور رہے۔ علاوہ گرانقدر مشاہرہ کے نواب وقتاً فوقتاً نذرانے کے طور پر بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے رہتے۔ مولانا کی شاہانہ داد و دہش کے لئے یہ بھی ناکافی ہوتے۔ نواب خلد آشیاں کی رحلت کے بعد خیرآباد چلے آئے۔ کچھ دن بعد آصفجاہ نظام حیدرآباد نے بلا بھیجا۔ حیدرآباد پہنچے۔ پر امرا و روسا و اراکین دولت نے استقبال کیا۔ وظیفہ جاری کیا گیا۔ تھوڑے دن قیام فرما کر وطن واپس ہوئے۔ تین سال کے بعد نواب حامد علی خاں نے رامپور میں قیام پذیر ہونے کی درخواست کی۔ ایک سال نواب کی خاطر سے گذار کر خیرآباد آ گئے۔ یہاں ورم جگر، استسقاء اور ضیق النفس میں مبتلا ہو گئے۔ زبان و قلب سے ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔ آخر عمر میں والد ماجد کی طرح تصوف کی طرف پوری توجہ مرکوز ہو گئی تھی۔

خلف الرشید صاحبزادہ مولانا اسد الحق نے حالت متغیر ہونے پر ہدایات طلب کیں

ارشاد ہوا :۔

"دنیا سے احتراز، دراہم و دنانیر سے اجتناب، حُبِّ مال تمام برائیوں کی جڑ ہے مسلمان کے لئے مال و دولت کی خواہش نازیبا اور اسکی ہوس بدترین گناہ ہے۔"

اسی شب (۲۳ر شوال المکرم ۱۳۱۶ھ) میں عالم جاودانی کو رونق بخشی۔ احاطۂ درگاہ مخدوم شیخ سعد میں اپنے دادا مولانا فضل امام سے کچھ فاصلے پر مسجد سے متصل فصیل کے نیچے جانب شمال مدفون ہوئے۔ مولانا فضل امام کے استاد عبدالواجد کی قبر اسی احاطہ درگاہ میں مخدوم صاحب کے مزار کی شرقی جالی کی جانب بیرون فصیل ہے۔

منشی امیر احمد امیر مینائی نے تاریخ کہی :۔

شمس العلماء زظلمت دہر چوں تیر ز ابر تیرہ برجست
برلوح مزار امیر بنویس آرام گہِ امام وقت است
۱۳۱۶ھ

مولانا کے اس حادثۂ رحلت پر نہ صرف مدارس ہندستان میں ماتم کیا گیا۔ بلکہ بیرونِ ہند بھی علماء و اعیان نے سوگ منایا۔ سلطان السلاطین بادشاہ ترکی نے بھی ایک ہفتہ تک مدرسۂ اظہریہ میں تعطیل رکھی۔ ملکی اور غیر ملکی جرائد نے مقالات لکھے۔ امیر مینائی کے شاگرد رشید لسان الملک ریاض خیرآبادی نے اپنے اخبار ریاض الاخبا میں جو کچھ لکھا تھا اسے درج کیا جاتا ہے :۔

علم و فضل کا گھر بے چراغ ہوا

"جناب شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب قبلہ کے انتقال کا صدمہ ایسا نہیں ہے کہ ملک و قوم اس کو بھلا سکے۔ اس حادثہ سے صرف خیرآباد ہی دارالعلم نہ رہا۔ بلکہ ہندستان ہی سے یہ فخر معدوم ہو گیا اور ہندستان کے ساتھ عرب و عجم سے بھی کچھ شک نہیں ایسے آفتاب علم و فضل کے پنہاں ہونے سے دنیائے اسلام تاریک ہو گئی۔

مولانا علماء اکابر اسلام کے عجب قابل قدر یادگار تھے۔ سچ پوچھئے تو شمس العلماء

مولوی عبدالحق کے ساتھ تمام زندہ نام علمار آج تہِ خاک ہو گئے۔ ایک ذات واحد میں ایسے کمالات غریبہ اور اوصاف عجیبہ کا جمع ہو جانا مرحوم مولانا کی ذات بابرکات کے ساتھ گیا۔

زمانہ تو صرف صورت ظاہری کا معاوضہ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ نورانی چہرہ، وہ خندہ روئی، وہ زندہ دلی، وہ سراپا علم، وہ رعب کمال، وہ شان ادب، وہ فضل و جلال۔

دیکھنے والے کے لئے صورت ہی پکار اٹھتی تھی کہ دنیائے اسلام کو فخر و ناز آج اسی قدسی صفات بزرگ پر ہے۔

شمس العلمار کا بہت بڑا احسان دنیا پر یہ ہے کہ وہ دولت علم و کمال کو خاندانی اختصاص کے ساتھ بہت ہی محفوظ طور پر منتقل فرما کر ایک ایسے سینہ کو گنجینۂ علوم بنا گئے، جو سلسلۂ فیض و برکت کے عدم انقطاع کا بہت ہی باعتبار ضامن ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ہز ہائنس فرمانروائے رامپور اور اعلیٰ گورنمنٹ نظام شمس العلمار مرحوم کے وظائف ان کے صاحبزادہ مولانا اسدالحق صاحب کے نام منتقل فرما دیں گے۔ کہ مقامات مختلف و ممالک دور دراز کے طلبا بے آس نہ ہوں۔ اور دار العلوم خیرآباد دار العلوم بنا رہے۔"[1]

جی چاہتا ہے کہ ریاض ہی کے قلم سے مولانا کے استغنا، جرأت، اور وقارِ علمی کا ایک منظر پیش کرتا چلوں "دربار قیصری" کے زیر عنوان "ریاض آپ اپنے آئینے میں" کے سلسلۂ مضامین نگار ریں لکھتے ہیں:۔

دربارِ قیصری

جس زمانہ میں ریاض الاخبار ہفتہ وار اور گلکدۂ ریاض ماہوار خیرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ (جس کے مطبع کا تاریخی نام "لمعۂ رخشاں" تھا۔)
۱۲۹۶ھ

---

[1] نثر ریاض ص۲۱۱ مرتبہ عقیل احمد جعفری خیرآبادی۔

اعلیٰ حضرت نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاذ حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعہ سے یاد فرمایا۔ میں اس وقت دربار قیصری میں شرکت کے لئے دہلی جانے کو شدت سے بیتاب تھا۔

اس سے پہلے دربار قیصری میں تمام اخبار نویس، ہر صوبے سے مدعو تھے۔ ان کا کیمپ خاص تھا۔ خیمے بہ کمال تزئین و تکلف نصب تھے۔ دو ایڈیٹروں کے لئے ایک خیمہ ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا۔ کھانے اور ناشتے کے لئے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ پرتکلف چاء ہر وقت تیار رہتی تھی۔ چمن بندیاں، اعلیٰ پیمانہ پر تاحدّ نظر ہر طرف تھیں۔ میں مع نظام احمد مرحوم مالک ریاض الاخبار، دہلی گیا۔ کیمپ کے سوا مولانا ابوالمنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانہ پر مہمان بننا پڑا۔ شب گذاری کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کیمپ میں پنجابی اخبار کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے۔ بعد کو آگئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ دن تو والیان ملک کے عالیشان پر فضا فردوسی کیمپوں میں گذرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہر طرف لہلہاتے ہوئے چمن زار، سجے ہوئے بازار، ان کی وضع و قطع، ان کی آراستگی، یہ بھولا ہوا خواب کہاں تک بیان کر سکتا ہوں۔ اسی گلگشت میں ظہیر دہلوی سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیرپور سندھ کے حضور میں بہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ حضور نواب صاحب اور تمام دربار فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس بنا پر کہ مہاراجہ اس سے پیشتر رونق افروز لکھنؤ تھے۔ تو سیٹھ سیتارام صاحب تعلقہ دار بسواں جن کے روابط مہاراجہ سے تھے۔ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ مگر اس وقت مہاراجہ بعزم واپسی

سوار ہو رہے تھے۔ سرسری شرف تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف لائے تھے۔ مجھے بھی مہاراجہ کے کیمپ میں ہمراہ لے گئے۔

دربار کیمپ کے قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ درباری کیمپ سے شمس العلماءؒ مولانا عبد الحق صاحب علامہ خیرآبادی کسی قدر منغض آرہے ہیں۔ کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر بھی لجاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولٰنا اسی تنغض کے ساتھ فینس پر سوار ہو گئے۔ ہم لوگ ایڈی کانگ کے ہمراہ خیمے میں آئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔

سیٹھ صاحب نے دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے، جواب ملا، اس وقت یہ واقعہ پیش آگیا ہے کہ شمس العلماء کے تشریف لانے کے لئے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا۔ شمس العلماء تشریف لائے۔ مہاراجہ نے براہِ تعظیم گوشۂ مسند پر جگہ دی، مزاج پرسی فرمائی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے اتالیق کو تکلیف دو۔ وہ بھی تشریف لائے۔ مہاراجہ نے انھیں بھی شمس العلماء کے مقابل گوشۂ مسند پر جگہ دی۔ ممکن ہے شمس العلماء کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا ہو۔ پھر مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علماء کا کسی مسئلہ پر مناظرہ دیکھوں، یہ سنتے ہی شمس العلماء نے برافروختگی کے ساتھ کہا:-

> مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی۔ علماء کی یہ شان نہیں ہے۔

ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراجہ کو عرق آگیا۔ ان پر اس ناگوار واقعہ کا زیادہ اثر تھا۔ ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آگئے۔

دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلیٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی، خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے

> براہ قدردانی خلعت ونقد سے عزت افزائی کی بگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں کیوں کہ میں رئیسِ رامپور کا ملازم ہوں۔
>
> یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر ولیعہد رامپور کو ان کے کیمپ میں گذرا خلد آشیاں فرمانروائے رامپور بیماری کی وجہ سے دہلی آنے، اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور رہے تھے۔ پرچہ گذرنے پر ولیعہد بہادر نے خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی۔ تار ہی پر جواب آیا۔ ہماری طرف سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار پیش کرو۔
>
> شمس العلماء جو کسی بات پر مدار المہام رامپور سے برہم ہو کر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ واپس نہ جائیں۔ اور کسی ریاست میں ملازمت کرلیں۔ اس قدرافزائی پر دربار قیصری کے بعد رامپور چلے آئے۔ اور پھر کبھی خلد آشیاں سے جدا نہ ہوئے۔"

مولانا کو دیکھنے اور برتنے والوں کی زبانی راقم الحروف نے سینکڑوں واقعے سنے جو مولانا کے فضل وکمال، حسنِ اخلاق، استغناء، جرأت اور حق گوئی وصداقت شعاری پر دلالت کرتے ہیں۔

لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم، نواب بشیر احمد فاروقی خیرآبادی مرحوم، سید اخلاق الحسن مرحوم رئیس خیرآباد، منشی نذر محمد خاں اختر مرحوم، مولوی محمد فاروقی یزؔ مرحوم، مولوی ظہیر احمد فاروقی، مفتی سید فخر الحسن۔ مولانا حکیم احمد علی، حکیم سید انوار حسین، اور مولوی حکیم ظفر الحق وغیرہم راوی ہیں کہ مولانا بے حد نفاست پسند اور نازک مزاج تھے۔ بڑے دبدبہ والے اور باوقار تھے۔ جو کوئی ملنے جاتا تو اضع سے پیش آتے۔ اوقات مقررہ کے علاوہ ملنے کی اجازت نہ تھی۔ علمی دربار میں پورے لباس سے رونق افروز ہوتے۔ اہل مجلس پر چھائے رہتے۔ کوئی شور و غل نہ کرسکتا تھا۔ چیخ کر بات کرنا ممنوع تھا۔ نشست گاہ پر مسند اور تکیہ لگا رہتا۔ اردگرد قالین بچھے رہتے۔ باہر سے آنے

والے مولانا کے دربار کو امیر کی مجلس سمجھتے۔ دن میں دو تین بار لباس تبدیل فرماتے جس کمرہ میں نشست ہوتی ہر دروازہ پر جوتا رکھا رہتا جس طرف سے کمرہ سے باہر ہوتے ادھر پہننے کے لئے پاپوش رکھی ملتی۔

لباس عمدہ اور اعلیٰ قسم کا زیب تن فرماتے۔ عبا بھی استعمال کرتے۔ لکھنؤ کے دوکانداروں کو تشریف آوری خیرآباد کا حال معلوم ہو جاتا تو پچاس میل کا سفر طے کر کے اچھی چیزیں لاتے۔ اور منھ مانگے دام پاتے۔

مولانا ملازمین کی چالاکیوں سے کماحقہٗ واقف ہوتے ہوئے بھی تجاہل سے کام لیتے۔ اور اکثر و بیشتر چشم پوشی فرماتے۔ دوسروں پر اس کا اظہار اس انداز میں فرماتے کہ حقیقت ظاہر ہونے پر بھی ناگوار نہ گذرے۔

مولانا کو ایسا عارضہ لاحق ہو گیا کہ بگلوں کا شوربہ استعمال کرایا گیا۔ اس لئے بطوں کے ساتھ بگلے بھی پالے گئے تھے۔ بٹیریں بھی غذا میں رہتی تھیں۔ کئی دن تک دسترخوان پر بٹیر نہ دیکھی تو دریافت کیا۔ شبراتی ملازم نے جواب دیا کہ بگلوں کے ساتھ رات کو بند کر دی جاتی تھیں وہ کھا گئے۔ خاموشی اختیار فرمالی۔ مگر جو آیا اس سے ذکر کیا کہ ہماری بٹیریں بگلے کھا گئے۔ فرزند سعید مولانا اسد الحق سے بھی یہ ذکر آیا۔ وہ کہنے لگے۔ ابا جان! یہ کارستانی شبراتی کی ہے خود کھا گیا۔ بگلوں کے سر تھوپ دیا۔ مولانا نے منھ پھیر لیا اور کئی روز بات نہ کی۔ کئی دن کے بعد عفو تقصیر کے لئے دست بستہ آ کھڑے ہوئے۔ تو فرمایا۔ میاں! تم نے ہمیں نادان سمجھا ہے۔ شبراتی ابا صاحب کا پروردہ ہے ہم کیسے اس کو چور بناتے۔ یہ تو تمہارا ہی جگر تھا کہ بزرگوں کے دیکھنے والے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کر بیٹھے۔ میاں! اگر اس نے کھایا بھی تو ہم نے اتنا فضیحتہ کر لیا کہ وہ خود نادم نظر آتا ہے۔ زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے بڑوں کے لئے بے ادبی کے الفاظ آئندہ استعمال نہ کئے جائیں۔

لکھنؤ کے ایک دکاندار مولانا کے لئے الوانیں لے کر آگئے۔ مولانا نے ایک الوان انچ روپیہ قیمت کی پسند فرمائی۔ قلمدان طلب کیا۔ کچھ رقم کی کمی تھی۔ دکاندار سے

کہا کہ تم جاؤ ہم روپیہ بھیج کر الوان منگالیں گے۔ طلبہ یہ حال دیکھ رہے تھے۔ انھیں میں سے حافظ محمد محسن خاں تھے۔ جو کراری (از مضافات آگرہ) کے زمین دار کے لڑکے تھے۔ یہ ذہین ہونے کے ساتھ مولانا کے منھ لگے بھی تھے۔ تاجر جب چلنے لگا تو یہ اس کے ہمراہ ہوئے اور باہر جاکر اس الوان کو چالیس روپئے میں خرید لائے۔ بعد عصر جب مولانا رونق افروز ہوئے تو الوان لاکر نذر کی۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ حضور! چالیس میں خریدی ہے۔ آپ نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اٹھا کر پھینک دیا۔ فرمایا:۔ بے وقوف ہم کو احمق سمجھتا ہے اور خود بڑا عقلمند کا بچہ بنا ہے۔ ہم گرہ کٹوا لیتے۔ اور یہ اس کی گرہ کاٹ لائے۔ یہ کہہ کر دربار سے نکال دیا۔ پریشان ہو کر مولانا کے پرانے خدمتگار شراتی کے پاس پہنچے۔ کچھ رقم دیے کا وعدہ کر کے اسے سفارش پر آمادہ کیا۔ وہ اٹھا اور الوان کو درست کر کے وصلی پر لپیٹ کر اور ململ کے ٹکڑے میں باندھ کر حاضر خدمت ہوا۔ عرض کیا حضور! میں مزید صرف کر کے پسند کردہ الوان لے آیا۔ مولانا نے الوان دیکھ کر فرمایا۔ حافظ جی دیکھو کتنا فرق ہے۔ یہ دکاندار ہمارا نام سن کر آتے ہیں منھ مانگے دام نہ پائیں تو کوئی کاہے کو آئے۔

نفاست پسندی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز ٹوکرے والا آم لے کر حاضر ہوا۔ آم بہت عمدہ تھے۔ مگر آپ نے دور سے دیکھ کر ہی واپس کر دیا۔ کسی طالب علم نے آم والے سے کہا۔ ان آموں کو دھو کر کپڑے سے پونچھنے کے بعد چھوٹی ٹوکری میں رکھ کر کسی دوسرے وقت حاضر خدمت ہو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ منھ مانگی قیمت دے کر سب آم لے لئے گئے۔ اور ہر آنے جانے والے سے اس کے سلیقہ کی تعریف کی۔

ایک بار کسی نے مجلس میں چمچہ کو چَمَچ کہہ دیا۔ مولانا کی طبع نازک پر یہ لفظ اتنا گراں گذرا کہ فوراً محفل برخاست کی۔ اور کئی وقت تک اس کا اثر رہا۔

حضرت الاستاذ مولانا معین الدین اجمیری کا بیان ہے کہ مولانا ٹونک میں اپنی قیام گاہ کے بالاخانہ پر تشریف فرما تھے۔ سڑک پر ایک بیل گذرا جس کے

سینگ بہت بڑے اور بے تکے تھے۔ اسے دیکھ کر طبیعت میں تکدّر پیدا ہوا۔ اور فوراً ملازم سے سامان درست کرنے کو کہا۔ ہر چند تمام عقیدت مندوں نے روکنا چاہا۔ لیکن نہ رُکے۔ فرمایا جس جگہ ایسے بیل رہتے ہوں وہاں عبد الحق کیسے رہ سکتا ہے۔

جرأت کا یہ عالم تھا کہ ایک قتل کے سلسلے میں آپ کے شاگرد رشید مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی پر الزام لگا دیا گیا۔ وہ مولانا کے پاس تھے کہ کوتوال رامپور وارنٹ لے کر حاضر ہو گیا۔ واقعہ معلوم ہونے پر کوتوال کے ساتھ نواب کی بھی خوب خبر لی۔ کہ اسے بھی لے کر آتا جب مزا معلوم ہوتا کہ طالب علم پر یہ جرأت کیسے کی جاتی ہے۔ کوتوال طیش میں بھرا ہوا نواب کے پاس پہنچا اور سارے الفاظ دہرا دیئے۔ نواب مولانا کے ناز بردار اور قدر دان تھے۔ اسلئے کوتوال پر ناراض ہوئے۔ مولانا نے میری توہین نہیں کی بلکہ تو نے کی۔ تو ایسے شخص کے پاس کیوں پہنچا جو نواب کو بھی برا بھلا کہہ سکتا ہے۔ اس توہین کا صرف تو ذمہ دار ہے :۔

تصانیف

مولانا کی تصانیف داخل درس بھی ہیں۔ اکثر چھپ گئی ہیں :۔

حاشیہ[1] قاضی مبارک، حاشیہ[2] غلام یحییٰ، حاشیہ[3] حمد اللہ، حاشیہ[4] میر زاہد امور عامہ، شرح[5] ہدایت الحکمۃ، شرح[6] مسلم الثبوت، شرح[7] کافیہ (تسہیل الکافیہ)، شرح[8] سلاسل الکلام، جواہر[9] غالیہ، رسالہ[10] تحقیق تلازم، شرح[11] مرقات، التحفۃ[12] الوزیریہ، زبدۃ[13] الحکمۃ، حاشیہ[14] عقائد عضدی، شرح[15] الحواشی الزاہدیہ علی ملا جلال۔ مشہور تصنیفات ہیں۔

تسہیل الکافیہ اور شرح زبدۃ الحکمۃ داخل نصاب ہیں۔ مولانا کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ شرح کو متن سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ذرا تسلسل بیان میں فرق نہیں آتا۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود شارح ہی ماتن ہے۔ اور یہ کہ متن و شرح نہیں ہے بلکہ مسلسل کتاب ہے۔

مولانا نے اردو میں زبدۃ الحکمۃ تحریر فرمائی۔ جسے مولوی امداد حسین کے ذریعہ

شائع کیا گیا تھا۔ دوبارہ راقم الحروف نے ۱۹۴۹ء میں بسیط مقدمہ کے ساتھ شائع کر دی ہے۔ جو بعض مدارس اور امتحانات الہ آباد بورڈ میں داخل نصاب ہے۔

اس کتاب سے مولانا کی اردو دانی اور اردو ادبیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

امیر اللغات پر مولانا نے جو تقریظ تحریر فرمائی تھی اسے تاریخ نثر اردو مرتبہ مولانا احسن مارہروی مرحوم سے نقل کرتا ہوں۔ جس سے ۶۰ سال پہلے کی زبان اور مولانا کا حُسنِ بیان دونوں کا پتہ چل جائے گا۔ ساتھ ہی یہ محسوس بھی ہو سکے گا کہ یہ علوم قدیمہ کے ماہر و متبحر علماء علوم و فنون میں کتنا درک رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی اردو لغت پر تقریظ نہیں ہو رہی ہے بلکہ کسی مسئلہ فلسفہ و حکمت کو حل کیا جا رہا ہے۔

> ”ہر زبان جو مافی الضمیر کی ترجمان ہے اپنے خصوصیات میں ضرور امتیاز رکھتی ہے اگرچہ وہی مفردات، وہی مرکبات، وہی کنایے، وہی تمثیلیں، وہی مقامِ استعمال، وہی مثلیں، وہی مقولے، ہیں جو لغات میں مستعمل ہیں۔ لیکن خصوصیاتِ لسانی کا بتانا نہایت مشکل اور نکتۂ لاینحل ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ لغت کا موضوع لفظ مفرد ہے۔ مفردات کے اصلی مادّے کی جستجو اشتراک لفظی یا معنوی حقیقت یا مجاز کا بتانا، اس کے عوارض ذاتی اور محلّ بحث ہیں۔ لیکن اس کے موضوع کو (جو مختلف لفظوں سے مخلوط ہو کر ہر خاص و عام کی زبان پر آتا ہے) اس طور پر ملحوظ رکھنا کہ خاص زبان اور اس کے الفاظ اور مستعملات اختلاطِ ناگہانی سے الگ ہو کر ممتاز رہیں۔ یا بحث کے مقامات ان عوارض سے الگ ہوں جو عوارض ذاتی یا نوع عوارضِ ذاتی سے جدا اور اعراض غریبہ میں داخل یا اس کے عین ہیں کوئی آسان امر نہیں۔ کبھی کبھی اس عموم موضوعیت کے علاوہ خاص خاص وہ پہلو بھی مبحوث عنہ ہو جاتے ہیں۔ جو خاص ایک زبان سے متعلق اور دوسری زبان کے موضوع یا عنوان موضوع کے خلاف ہوتے ہیں مثلاً بعض جملے جو ہیئت ترکیبی کی وجہ سے مفردات کے کل ہیں اور مفردات اس کے جز ہیں۔ بظاہر موضوع کی نوعیت اور شخصیت سے الگ اور جدا

ہوتے ہیں۔ جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کیوں یہ محلِ بحث اور موضوعیت میں داخل ہیں۔ لیکن اس مقام پر یہ سمجھنا ضرور ہے کہ مفردات جن کو عام طور پر لوگ، مفردات جانتے ہیں۔ ان سے یہ مفردات عام ہیں۔ مثلاً "زید" مفرد ہے۔ اور "زید آیا" مفرد نہیں۔ لیکن ان مفردات پر غور کرنے والوں یا موضوعیت کی نگاہ رکھنے والوں کو اس "زید آیا" کو اس وقت میں ضرور مباحثِ مفردات میں داخل کرنا ہوگا۔ جب وقت بصورتِ مقولہ یا مثل ظاہر ہو۔ جس کا خاص منشا یہ ہے کہ مقولے اور امثال بھی اپنے خاص معنی کے لحاظ سے مثل مفردات کے ہیں۔ اسی لئے مطلق زبان کی خصوصیت جو اس کے اجزائے مادّی یا ترکیبی سے پیدا ہو. ملحوظ رکھنا لغت کا مقصد اعلیٰ اور غایت قصویٰ ہے۔

راقم کو اس وقت لغت کے پورے مقاصد کا بتانا، اس کے موضوع یا تعریفات سے بحث کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس وقت صرف یہ بتانا اور ظاہر کر دینا ہے کہ امیر اللغات نے کہاں تک اپنے مقاصد، اور اغراض کے پورا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اس کے مصنف نے کہاں تک اس تالیف میں اصلی غرض کا خیال رکھا ہے۔ امیر اللغات کا اگرچہ ابھی ایک ہی حصہ نکلا جس میں الف ممدودہ ہے۔ لیکن ان اغراض پر نظر کرنے کے بعد جو لغت کے اہم مسائل ہیں اور امیر اللغات میں تحقیق کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ لغت اپنی جامعیت کے لحاظ سے ایک نمونہ ہے۔ جس نے مصنف کی تدقیقِ نظر اور کتاب کی جامعیت مسائل کو اس طور پر ظاہر کر دیا ہے جس کو ملک اور قوم فخر اور مباہات کی نظر سے اگر دیکھے تو زیبا ہے۔ اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ملک نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اردو لغات کے اشتراک اور منقولات جو اعلیٰ سے اعلیٰ لغت نویس کی نگاہ سے کوسوں دور اور مخفی رہ سکتے تھے۔ ایک لغت کے معنوں کا انتہا سے انتہا باریک فرق حدِ تعمق نظر سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

مفردات کی تحقیق اور مرکبات کی تدقیق (جو خصوصیات کے لحاظ سے مفردات میں داخل ہیں) کس شان سے بیان کی گئی ہے کہ اردو زبان بھی اس تصنیف کو دیکھتے ایک علمی زبان معلوم ہوتی ہے ۔ اس کتاب کی عظمت اس شخص پر خوب ظاہر ہو سکتی ہے جس نے کبھی اس قسم کی دماغ سوزی کی ہو ۔ ہر چند امیر اللغات کے مصنف (مولوی منشی امیر احمد مینائی مرحوم) کی استادی فن شاعری اور قابلیتِ علمی مسلم الثبوت ہے ۔ لیکن یہ کتاب میری رائے میں اس عام اور خیالی تسلیم کے لئے برہان قوی ہے ۔ اور ہندوستان کو ضرور مایۂ فخر ہے ۔ دعا کرنا چاہیے کہ اہل کمال اس کتاب کی پوری قدر کریں ۔ اور مصنف اس کو جیسا کہ چاہیے اور جیسا پہلا حصہ ہے اس سے بھی عمدہ حالت پر پورا کر سکے ۔ کہ اردو زبان سے محتاجی اور عدم استقلال کا الزام رفع ہو ۔ اور یہ عمدہ یادگار زمانے میں رہ جائے "

محمد عبدالحق العمری الخیر آبادی عاملہ اللہ بلطفہ الہادی
فی العواقب المبادی ۔ سنہ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء

مولانا کا یہی تبحرِ علمی اور تمام اصناف علم پر قدرت تامّہ، علماءِ عصر سے فضل و کمال کا لوہا منوائے ہوئے تھی ۔ وقت کا بڑے سے بڑا عالم مولانا کے کلمۂ خیر اور تعریف کو اپنے لئے سند سمجھتا تھا ۔ استاذ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ علی گڈھی کے درس میں ایک بار تشریف لے گئے ۔ مفتی صاحب نے حسب عادت درس بند کر کے سرو قد ہو کر پذیرائی فرمائی ۔ مزاج پرسی وغیرہ رسمی مراتبِ گفتگو کے بعد فاضل خیر آبادی نے فرمایا کہ طلبہ کا وقت بہت عزیز ہے ۔ حرج نہ فرمائیے ۔ قاضی مبارک کا درس ہونے لگا ۔ مولانا سنتے رہے ۔ ختم ہونے پر طلبہ سے کہا کہ تمہارے استاد کی تقریر ایسی ہے کہ اعتراض خود بخود دفع ہو جاتے ہیں ۔[1]

اسی کا نتیجہ تھا کہ جو کتاب بھی تصنیف فرماتے اس کی ایک نقل مفتی صاحب کے پاس بھی بھیجتے ۔ موصوف کے کتب خانہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ اور دوسری تصانیف علامہ

---

[1] استاذ العلماء صفحہ ۳۰ مولفہ نواب صدر یار جنگ بہادر ۔

کی دستخطی اب بھی موجود ہیں۔

مولانا کی سیر چشمی اور استغنا کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ علامہ فضل حق کی ضبط شدہ جائداد میں سے پندرہ سال کے بعد سندِ خطابِ شمس العلماء کے ساتھ جب کچھ گاؤں واپس ہوئے تو خیرآباد کا باشندہ مسمّٰی یار علی علامہ کا لڑکا بن کر ان پر قابض ہو گیا۔ اور کچھ دن بعد انھیں بیچ ڈالا۔

مولانا رامپور میں مقیم تھے۔ اعزہ و احباب کے اصرار کے باوجود اس جھگڑے میں پڑ کر عذرداری تک کرنا گوارا نہ کیا۔ شمس العلماء ہونے کے باوجود کبھی اسے باعث فخر نہ سمجھا۔ نہ اس کے ذریعہ کوئی عزت و وقار حاصل کرنے کی کوشش کی۔

والد ماجد کی عالیشان و سنگین محل سرا غیروں کے قبضے میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے مگر اس خطاب کو واسطہ بنا کر اس کے حصول کی سعی نہ فرمائی۔ کشمیر و رامپور کے دونوں واقعات نے ثابت کر دیا کہ مولانا نے علم کی عزت و شان کو کیسا بلند و بالا رکھا تھا۔ پریشان حالی کے باوجود طرزِ رہائش امیرانہ رکھا۔ اور تھے بھی درحقیقت امیر بن امیر بن امیر، عالم بن عالم بن عالم۔

مولانا کو بلا طلب گورنمنٹ برطانیہ نے ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب بھی پیش کیا تھا۔ فرمایا کرتے تھے باپ کو کالے پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی۔ جو سند دی گئی تھی اس کی نقل درج کی جاتی ہے۔ سند کے ساتھ تمغہ بھی تھا۔ یہ دونوں چیزیں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔

Sanad

To

Maulvi Abdul Haque
of Khairabad in Oudh

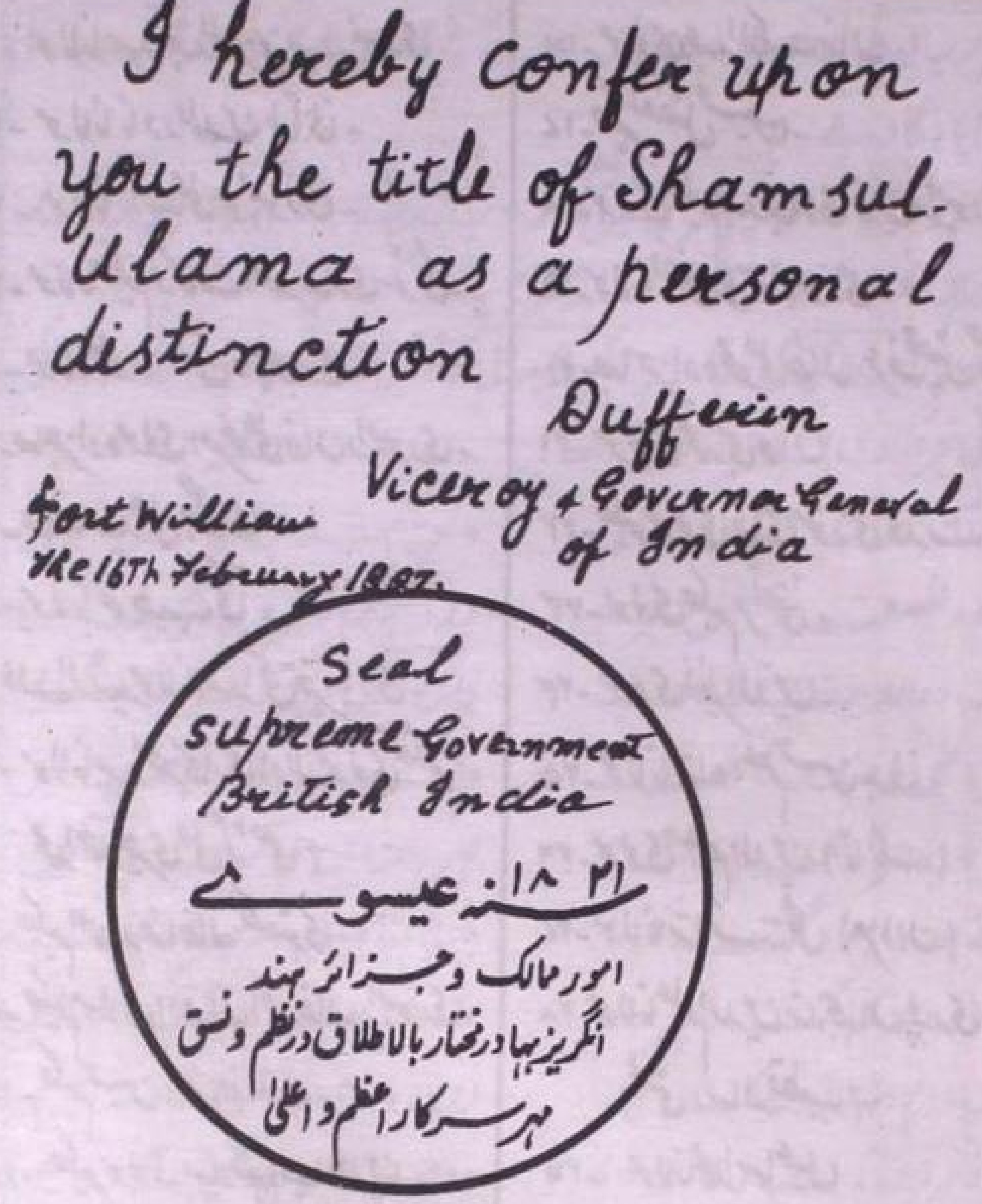

I hereby confer upon you the title of Shamsul-Ulama as a personal distinction

Dufferin
Viceroy & Governor General
of India

Fort William
The 16th February 1887.

Seal
Supreme Government
British India
سنہ ۱۸۲۱ عیسوی
امور ممالک و جزائر ہند
انگریز بہادر مختار بالاطلاق در نظم و نسق
مہر سرکار اعظم و اعلیٰ

اولاد مولانا نے دو شادیاں کیں۔ زوجۂ اولیٰ بنت مولوی فضل الرحمٰن سے عائشہ بی بی زوجۂ محمد حسین بسمل تھیں۔ زوجۂ ثانیہ دختر جناب بو علی سے مولانا اسد الحق تھے۔ جو دختر احمد حسین سے منسوب تھے۔

تلامذہ مولانا کے ہزاروں تلامذہ میں سے نامور شاگرد جن کا پتہ چل سکا حسب ذیل ہیں۔ ان میں سے اول الذکر چار وہ عقیدتمند ہیں جنھوں نے مولانا کے دربار علمی میں پندرہ سال سے لے کر بیس سال تک تعلیم میں صرف کئے ہیں اور عمر کا بہترین حصہ استاد کی نازبرداری اور عتاب و غصہ کی برداشت میں گذار

۱۔ مولانا سید عبد العزیز سہارنپوری۔
۲۔ مولانا نادر الدین ملتانی۔
۳۔ مولانا ماجد علی جونپوری۔
۴۔ مولانا حکیم برکات احمد بہاری، ٹونکی۔
۵۔ مولانا ظہور الحسن رامپوری۔
۶۔ صاحبزادہ مولوی امیر محمد علی خاں رامپوری۔
۷۔ علامہ سید علی بلگرامی۔
۸۔ مولانا محمد طیب مکیؔ۔
۹۔ خلف الرشید مولانا اسد الحق خیرآبادی۔
۱۰۔ مولانا سید احمد بخاری (والد مولوی حکیم محمد احمد خیری علی گڑھی)
۱۱۔ حکیم احمد رضا خاں لکھنوی۔
۱۲۔ حکیم مولوی افضال احمد خاں رامپوری۔
۱۳۔ حکیم حسین رضا خاں۔
۱۴۔ حکیم مولوی سید شہاب الدین۔
۱۵۔ مولوی عبد الغنی خاں۔ (والد حکیم نجم الغنی خاں مورخ)
۱۶۔ مولوی عبد الملک خاں۔
۱۷۔ حکیم تفضل حسین۔
۱۸۔ مولوی حکیم عبد الہادی خاں رامپوری۔
۱۹۔ مولانا فضل حق رامپوری۔
۲۰۔ صاحبزادہ محمد علی خاں۔ عرف چھٹن صاحب
۲۱۔ مولوی محمد نبی خاں۔
۲۲۔ حکیم مولوی حاجی منور علی محدث۔
۲۳۔ مولوی حکیم مرتضیٰ۔
۲۴۔ مولوی نظیر الدین۔
۲۵۔ مولانا شاہ اعظم حسین مدنی۔
۲۶۔ مولوی مقیم الدین (ٹانک)
۲۷۔ مولانا شائستہ گل (مردان)
۲۸۔ مولانا علیم الدین شاہجہاں پوری۔ (محشی رسالہ قطبیہ)
۲۹۔ مولانا محمد اسماعیل۔
۳۰۔ مولانا ولایت حسین۔
۳۱۔ مولانا عبد العزیز پنجابی۔

فرزند سعید مولانا اسد الحق کو فرمانروائے رامپور نے مولانا کی وفات کے کچھ دن بعد ہی مدرسہ عالیہ رامپور کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ موصوف نے اپنی قابلیت سے اس جگہ کو پُر کیا اور دریائے فیض علمی جاری فرمایا۔ افسوس یہ ہے کہ صرف ایک ہی سال اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے تھے۔ کہ ۷، ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ کو والد ماجد کی وفات کے پورے ڈھائی سال بعد اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ اور رام میں

باغ مزار میاں خواجہ احمد میں سپردِ خاک ہوئے۔[1] تالیفات میں رسالہ حمیدیہ (فن منطق) یادگار ہے۔

اولاد میں مولوی حکیم ظفر الحق خیرآبادی[2] اور بی بی رقیہ[3] زوجہ حسن رضا سندیلوی بقیدِ حیات ہیں۔ عزیز الحق جوارِ رحمت خداوندی میں پہنچ چکے

مولانا اسد الحق کی وفات پر حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی مرحوم (والد مولانا حکیم احمد علی خیرآبادی) نے قطعۂ تاریخ لکھا۔

حیف آں آفتاب فضل و کمال　　دفعۃً شد نہاں بزیرِ زمیں
بود، در فلسفہ و منطق فرد　　در اصول و فروع ہمہ مبیں
منتخب در حدیث و فقہ و ادب　　فاتحِ قفلِ گنجِ دینِ متیں
در ریاضی و ہندسہ، حکمت　　فاضلے در جہاں نبود چنیں
ماہ تابانِ عزّ و مجد و عُلا　　مہرِ رخشانِ شوکت و تمکیں
وائے در رامپور گشت خزاں　　باغِ شاداب و سبز شرعِ دیں
پس ہماں جا بخاک بسپردند　　شد غروب آفتاب علم و یقیں
اخت و ام از ملال خاک بسر　　ابن و زوجہ ملول و زار و حزیں
اقربا از فراق نالہ زناں　　دوستاں در غمش نگار و غمیں
مدرسہ از غمش خمیدہ پشت　　طلبہ از ملال خاک نشیں

کوثرِ زار سال فوتش گفت
اعلم، اکمل، مقیم خلدِ بریں
۱۳۱۸ھ

مولانا اسد الحق کے ساتھ اس خاندان خیرآباد سے نسلی طور پر علم کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ مولانا کے بعد نواب صاحب رامپور نے اپنے استاد بھائی مولانا عبدالعزیز سہارنپوری کو رامپور رکھا۔ مولوی حکیم ظفر الحق بن مولانا اسد الحق کو تعلیم کیلئے انکے سپرد کیا۔ حکیم صاحب نے اپنی توجہ فن طب کی طرف مبذول رکھی۔ اس خاندانی وراثی

---

[1] تذکرہ کاملان رامپور۔ [2] ۳ ستمبر ۱۹۷۸ء کو انتقال ہو گیا۔ [3] ۱۲ رمضان ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۶ مئی ۱۹۵۴ء کو وفات پا گئیں۔ مدفن تکیہ باغ واقع خیرآباد ہے ۱۲

علم کو خاص اہمیت نہ دی۔ رامپور کے بعد کچھ دن ٹونک بھی جاکر رہے۔ مولانا حکیم سید برکات احمد اور مولانا معین الدین اجمیری سے بھی کچھ پڑھا۔ اواسط کتب تک پہنچے پر ٹونک کو خیرآباد کہہ کر خیرآباد آگئے۔

حکیم صاحب نے ایک شادی خاندان میں کی۔ ان مرحومہ سے اولاد نہیں ہوئی۔ دو شادیاں غیر کفو میں کیں۔ دونوں سے اولاد ہے۔ کثرت اولاد اور ناسازگاریٔ زمانہ کی وجہ سے پریشانی میں زندگی گذرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد نعمت علم سے محروم ہے

تلکَ الایّامُ نُدَاولها بَینَ النّاسِ ۝

صلبی اولاد سے علم کا خاتمہ ہوا، تو کیا ہوا۔ روحانی اولاد کے دریائے فیض سے ایک عالم سیراب ہو رہا ہے۔ یوں تو مذکورہ بالا تلامذہ میں ہر فرد اپنی نظیر آپ تھا مگر سب سے زیادہ بافیض، نیک سیرت اور خوش صفات ہستی مولانا سید حکیم برکات احمد کی تھی۔ آپ کے شاگرد رشید علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری تھے۔ اور ان کی خدمت میں ۶ سال (از ۱۳۵۴ھ تا ۱۳۵۹ھ) راقم الحروف کی حاضری بسلسلہ تکمیل درسیات رہی۔

وصیّت

مولانا نے آخر وقت یہ وصیت فرمائی کہ جب انگریز ہندوستان سے جائیں تو میری قبر پر خبر کر دی جائے۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو رفیق محترم مولانا مفتی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی نے مولانا کے مدفن (درگاہِ مخدومیہ) پر ایک جم غفیر کے ساتھ حاضر ہو کر میلاد شریف کے بعد فاتحہ خوانی کی۔ اور اس طرح پورے پچاس سال کے بعد انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر وصیت پوری کی۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

مولانا عبدالحق کی حقیقی ہمشیرہ بی بی سعید النساء حرماں (والدہ اعتبار الملک مضطر خیرآبادی) بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ خود والد ماجد (علامہ فضل حق) نے ان کی تعلیم و تربیت کا پورا حق ادا کیا تھا! ان کی علمی لیاقت کا حال مولانا عبدالحق کے

ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

"اچھا ہوا کہ سعید النساء بہن ہوئیں بھائی نہ ہوئیں ورنہ ان کے سامنے ہمیں کون پوچھتا۔"

محترمہ اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ چند اشعار یہ ہیں:-

خانۂ یار کا کیا تم کو پتا بتلاؤں   جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

دردِ دل، دردِ جگر، کاوشِ دل، کاہشِ جاں   اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجا میرا

میری برگشتہ بختی کو لکھتے لکھتے   آخرش کاتبِ اعمال کو چکر آیا

اب لذتِ دردِ جگر ما پوچھتے کیا ہو   جب تم ہو نمک پاش تو پھر کیوں نہ مزا ہو

تضمین حرماں خیر آبادی بر نعت حضرت رضا بریلویؒ

وصفت زبشر ہم ناممکن ہے، ممدوح خدا جانا
من یا ہے بچار کرت تس دن تو ہے پرکھن ہار کیا جانا
لکھتی ہے یہی چشم باطن، میں نے تو تجھے یکتا جانا
لَم یاتِ نظیرک فی نظرٍ مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کا تاج تورے سر سوہے تجھکو شہ دوسرا جانا

رحم اے شافع روز جزا، شد غرقۂ بحر گنہ دلِ ما
من کو ان لوگ کا روگ لگا جن چاہے نہ آپ بلیں نہ خدا
کرتا ہوں یہی دن رات دعا اے ساقیٔ چشمۂ کوثر آ
الموج علا والبحر طغیٰ، من بیکس و طوفاں ہوش ربا

مجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا، موری نیا پار لگا جانا

سن تیرہ نصیب سیاہ عمل، دارم ہمہ عقدۂ لاینحل
نہ تو کام کی آس نہ کام کا بل، موسے چپت کو دھیر نہیں اک پل
اب تجھے چاہے تو بجھے کل، تر ہو سوکھی ہوئی یہ کشتِ عمل
لک بدرتی لوجہ الاجمل، خط ہالۂ مہ زلف ابر اجل

تورے چندن چندر پرو کنڈل، رحمت کی بھرن برسا جانا

تا چند کشم بہ فراقِ تو غم، تا کے خورد نوش سرشک الم
ہر آن کا راج بڑھے جم جم، سدھ کاہے بسار دئی پیتم
میں تشنۂ شوق ہوں تیری قسم، تپ ہجر سے الجھن تن ہے دم
انا فی عطش و سخاک اتم، اے گیسوئے پاک اے ابر کرم

برسن ہارے رم جھم رم جھم، دو بوند ادھر بھی گرا جانا

بگذشت بہ لہو و لعب طفلی، ایام شباب بہ بے خبری
اب تیرے نیت کی لاگ لگی، پا چھے پران نکس جائی
جز تیرے نہیں دنیا میں کوئی، جو روز دہاں جلے قطعی
یا شمس نظرتِ الی لیلی، چو بہ طیبہ رسی عرضے بکنی

تورے جوت کی جھل جھل جگ میں رچی، مری شب نے نہ دن ہونا جانا

از گردشِ بخت و جفائے فلک، ہستم در امن و اماں اینک
اب جات رہی جیرا کی کسک، نہ وہ ٹیس نہ پیر نہ دکھ نہ تپک
لیکن یہ عزا ہے، اسی در تک، ابھیں نہیں شک، ابھی نہیں اینک
یا قلتی زیدی اجلک، سمے بحسرتِ تشنہ لبک

مورا جیرا لرجے درک درک، طیبہ سے ابھی نہ سنا جانا

یا شاہ خبر گراست، نزارم بار ست غم فرقت
تجلے دئی توری کارن مت، موئے سیس سہانے پیل کوست

حسرت ہے اگر تو یہی حسرت، کہ وہیں بھول جائے مجھے قسمت
واہاً لسُوَیعاتٍ ذَہَبتْ، آں عہد حضورِ بارگہت
جب یاد آوت موہے کل نہ پرت، درداوہ میے کا جانا
چہ کنم شکرِ کرمِ تو ادا، نہ دہن دارم نہ زباں بخدا
داتا تو راج بڑھائے سوا، حرماں کی بھی نسدن ہے، یہ دعا
ملنے میں جو مجھ کو ملا ہے مزا، واللہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
الروحُ فِداک فزد حرقا، یک شعلہ دگر برزن عشقا
مورا تن من دھن سب پھونک دیا، یہ جان بھی پیارے جلا جانا

جذباتِ دلِ زار بر انتقال شوہر نامدار

خواب در دیدہ نیاید ز دل آزاریٔ دل   وائے بر بختم و بر تازہ گرفتاریٔ دِل
تا بجائے ستم ایجاد جفا کاریٔ دل   قابلِ رحم شدہ حالت بیماریٔ دل
ہمہ مصروف طرب از پے غمخواریٔ دل   منم و نالۂ دل گریۂ دل، زاریٔ دل
ثمرۂ عیش نہ بخشید وفاداریٔ دل   در دلِ یار نیاید غم لاچاریٔ دل

شب فرقت میں نہیں سوتی ہیں دم بھر آنکھیں   نیند کی جان کو روتی ہیں برابر آنکھیں
ڈھونڈتی ہیں تجھے اے یار ستمگر آنکھیں   زندگی میری کئے دیتی ہیں دوبھر آنکھیں
نورِ دیدار سے سب کی ہیں منور آنکھیں   اک مجھی کو مرے اللہ نے دیں تر آنکھیں
پہلے دل لے گئے دکھلا کے فسونگر آنکھیں   اب ملاتے نہیں، اللہ اکبر، آنکھیں

ٹھمری

پی کارن سگری پت کھوئی   اپنی بپتھا پر برسن روئی
اتنی اُمر سکھ نیند نہ سوئی

او پنچھی وا دیس کے جیو پی کے تیر   کیتھو ہری اُڑ رے کہاہیں ہائے اب دے چیر
بن تمرے موہے کل نا ہوئی

سب سکھیّن کے شیام ہیں اوریں دکھیا کے شیام   سب کا پیو آرام ہے اور ہمرا پیو ہے رام
سب کے پیا ہمرا نہیں کوئی

بیدردی وہ پیو ملے احمد جن کا ناؤں   من بس کر کے تج دیو آپ براجن گاؤں
بیچ دھار موری ناؤں ڈبوئی

○

تعارف تصانیف شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی

[از:- رفیق محترم مفتی سید نجم الحسن خیرآبادی ۱۲ شاہد شروانی۔]

○

تسہیل الکافیہ

علامہ عبدالحق خیرآبادی نے میر سید شریف جرجانی کی فارسی شرح کافیہ کو عربی لباس پہنایا ہے۔ تعریب سے اس کتاب کا پایہ بلند ہو گیا ہے۔ یہ شرح کافیہ اور شرح جامی کے درمیان کی چیز ہے۔ خیرآبادی سلسلۂ تعلیم میں کافیہ کے بعد تسہیل الکافیہ کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد شرح جامی کا نمبر آتا ہے۔ اس طریق تدریس سے شرح جامی سمجھنے میں طلبہ کو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اور دفعۃً شرح جامی کے مشکل مضامین کا ان کو سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ علامہ نے شرح کا متن کے ساتھ اس طرح پیوند لگایا ہے کہ خود متن شرح کا ایک جزء معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں تحریر فرمایا ہے:۔

اما بعد فیقول العبد المفتقر الی رحمۃ اللہ الہادی محمد عبدالحق العمری الخیرابادی غفر اللہ لاسلافہ و بارک فی اخلافہ ان الترجمۃ الشریفیۃ للکافیہ معانیہا رشیقۃ۔ لکن الفاظہا فارسیۃ رکیکۃ فاردت ان اجردہا عن ثیاب الفاظہا الأبیہ و اُحلّیہا بکسوۃ

الفاظ العربیة لیعم طلبة العرب نفعها وتعظم عند العجم وقعها۔

ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۶ھ میں مصنف نے اس کتاب کی تالیف سے فراغت پائی۔

قد وقع الفراغ من تالیف هٰذا الکتاب فی ذی الحجة سنة ستٍ وثمانین بعد الالف ومائتین من الهجرة المقدسة النبویة علی هاجرها الف الف سلام وتحیة۔

ربع صدی قبل یہ کتاب برابر طبع ہوتی رہتی تھی لیکن اب کمیاب ہے۔

شرح هداية الحكمة

فن فلسفہ کے مشہور متن ہدایۃ الحکمۃ کی دو شرحیں عربی مدارس میں داخل درس تھیں ایک شرح ہدایۃ الحکمۃ میبذی اور دوسری صدر الدین شیرازی کی شرح صدرا۔ لیکن یہ دونوں شرحیں طلبہ کی ضرورت کے لئے ناکافی تھیں۔ کسی میں ایجاز مخل تھا اور کسی میں اطناب ممل۔ اس لئے طلبہ کے ذہن پریشان تھے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں مولٰینا عبد اللہ بلگرامی نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

وکانت المهرة عائبین الی ایجازه المخل واسهابه الممل وقد کانت الطلبة هائبین عن تطویله بلا طائل وتعقید عن الوضوح مائل۔

صدر الدین شیرازی کی شرح کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

ولاکشرحها للصدر الشیرازی مطولا یعضل۔

پھر علامہ کی شرح کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

فصار متوسطا بین شرحی الکتاب وخیر الامور اوسطها مما سلمته اولو الالباب۔

علامہ عبد الحق نے یہ شرح محمد نظام الدین کی فرمائش پر لکھی ہے۔ تحریر فرمایا ہے کہ:

"مولوی نظام الدین نے مجھ سے فرمائش کی ایسی شرح لکھوں جو فوائد پر حاوی ہو اور حشو و زوائد سے خالی ہو۔"

خود علامہ نے اپنے مقدمہ شرح ہدایۃ الحکمۃ میں مروج دونوں شرحوں کے ناکافی ہونے کی وجہ بیان فرمائی ہے:۔

”ان الشرحین المشہورین لھٰذا الکتاب احدھما غیر واف لفہم المطالب لانہ مع ما فیہ من التعقیدات اللفظیہ والمعنویہ یحتوی علیٰ شکوک محیرۃ للطلاب وثانیھما مع عدم اشتہارہ بتمامہ غیر خال عن الاسہاب والاطناب۔

پھر اپنی شرح کی خصوصیت ذکر فرمائی ہے:۔

شرعت فی الشرح بحیث یذلل الصعاب ویکشف عن وجوہ الفوائد النقاب معرضاً عن التعرض للزوائد وموردا لما لہ مدخل فی تحصیل المطالب والمقاصد۔

چونکہ الٰہیات کے مسائل اسلامی عقائد سے تضاد رکھتے ہیں اس لئے دینی حیثیت کے پیش نظر کتاب کے آخر میں اس کی وضاحت فرما دی ہے:۔

”وھٰذا کلہ جزاف وشطط وغوایۃ عن سواء السبیل عصمنا اللہ وایاکم عن التورط فی ھٰذہ الاباطیل واللہ یقول الحق ویھدی السبیل ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔

یہ کتاب متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ اب بھی ملتی ہے۔ اگر اس کتاب کو محشی کر دیا گیا ہوتا تو اس کی قدر وقیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

الجواھرُ الغالیہ فی الحکمۃ المتعالیہ

فلسفۂ الٰہیات میں مولانا عبدالحق خیرآبادی کی یہ جامع تصنیف ہے۔ اس کتاب میں الٰہیات کے مسائل تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ فلسفہ طبعیات میں الہدیۃ السعیدیہ اور الٰہیات میں الجواہر الغالیہ اگر طلبہ محنت سے پڑھ لیں تو اس فن میں بصیرت، اور اونچی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

یا واجب الوجود، ویا مفیض الخیر والجود علیٰ کل موجود ویا غایۃ کل مقصود

کتاب کا اختتام درج ذیل عبارت پر ہوا ہے۔

حشرنا اللہ تعالیٰ فی زمرۃ الاتقیاء وجعلنا من السعداء وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ (سیدنا محمد وآلہ الطاہرین واصحابہ الذین شادوا الدین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

یہ کتاب مطبع سعیدی رامپور میں دو بار طبع ہوئی ہے۔ دوبارہ سنہ ۱۹۰۶ء میں مولوی حکیم احمد علی صاحب خیرآبادی نے اس کو طبع کرایا۔ افسوس ہے کہ کاغذ اور طباعت وکتابت، کتاب کے مرتبہ کے لائق نہ ہو سکی۔ اب یہ کتاب نایاب ہے۔

شرح مسلم الثبوت مع شرح منہیاتؒ

مسلم الثبوت اصول فقہ کا مشہور متن ہے جس کو درسیات میں اہم مقام حاصل ہے۔ علامہ عبدالحق نے اس کی جامع اور مفید شرح لکھی ہے۔ علامہ بحر العلوم فرنگی محلی اور دوسرے علماء نے بھی اس کی شرحیں تحریر فرمائی ہیں۔ یہ کتاب علامہ کی اہم تصنیف شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کی تالیف کی وجہ طویل عبارت میں تحریر کی ہے جس کے بعض اجزاء درج کیے جاتے ہیں:۔

اما بعد فیقول العبد المفتاق الیٰ رحمۃ اللہ الغنی الہادی محمد عبدالحق العمری الخیرآبادی عاملاً للہ بفضلہ البادی فی العواقب والمبادی ان الکتاب الموسوم بالمسلم فی الاصول لما کان معرکۃ لآراء الفحول وکان اکباد الطلاب وصدور الاصحاب ظامیۃ الیٰ منہالہ۔

آخر میں تحریر فرمایا ہے:۔

عملت الکتاب و میزت القشر من اللباب وخدمت بہا حضرۃ من ہو عزۃ بیت الامارۃ ودرۃ صدف المعدلۃ والرافۃ (حتی قال) النواب حامد علی خاں بہادر الخ

یہ شرح "لموات ہادم لاساس التکلیف" کے مبحث تک ہے۔ اس کی ضخامت ۲۷۶ صفحات ہے۔ مصنف کی اجازت سے ان کی وفات سے ایک سال قبل ۱۳۱۵ھ میں مطبع انتظامی کانپور میں طبع ہوئی تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔

حاشیۂ قاضی مبارک بر شرح سلم

سلم کی شروح میں قاضی مبارک گوپاموی کی شرح کو جو مقام حاصل ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں۔ علامہ فضل حق کے حاشیہ میں اگرچہ فن معقول کے تمام اہم مسائل زیر بحث آگئے ہیں لیکن وہ پوری کتاب کا حاشیہ نہیں ہے۔ اگرچہ بہت سے علماء اور فضلاء نے قاضی مبارک کی توضیح و تشریح کے لئے حواشی اور شروح تصنیف کی ہیں لیکن بقول علامہ برکات احمد ٹونکی کے قاضی کے حل کے لئے یہ ناکافی تھیں۔ اس لئے طالبین تحقیق کی نگاہ اس ہستی پر پڑی جو اپنے وقت میں اس فن کی امامت کا منصب رکھتا۔

واشتد رغبة الطالبين الى دفع الاوهام جاءوا قد حصرت صدورهم متقن العلوم وابن بجدتها وناقد الفنون وابن عذرتها الجهبذ المحقق والعريف المدقق (حتی قال) الفارق بين الباطل والحق استاذنا محمد عبد الحق الخيرآبادی تغمده الله تعالى فى الايادى فمنّ علينا معاشر الطالبين بل سائر اهل العلم والمحصلين الخ۔

لیکن یہ حاشیہ بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہونچ سکا۔

لكن بقی بعض التصانيف ولم يتيسر له قدس سره اتمامه ولم يتفق اتمامه منها خاتم الحواشی على شرح السلم للقاضی فاردت ان اشهرها (حسن العلماء)

صفحہ ۵۸۱ پر درج ذیل بحث ہے:۔

قوله انما هو بحسب الهوية انت تعلم ان التشخص ليس امرا زائدا على الماهية عارضا لها فى نفس الامر بل الماهية تتعين وتتشخص الخ

اور صفحہ ۵۸۲ پر حاشیہ ختم ہو گیا ہے۔ اسی قدر مصنف علام لکھ سکے۔ مصلح المطابع دہلی میں سنہ ۱۳۲۲ھ میں اس کی طباعت عمل میں آئی۔ اب نایاب ہے۔

حَاشیۂ غلام یحییٰ متعلقہ میرزاہد رسالہ

علامہ کی یہ شاہ کار تصنیف ہے۔ مصنف علام فرمایا کرتے تھے کہ علم تو زوائد ثلثہ میں منحصر ہے۔ اس کتاب میں علمی مباحث پر علامہ نے محققانہ بحث کی ہے۔ کتاب کا آغاز عبارت ذیل سے ہے:۔

سبحان الذی ارتدعت العلوم لعظمته فلم تجد الی اکتناھه مشرعا وارتعدت الفھوم بعزته فلم تستطع الیه مھیعا الخ

اس کتاب کی تصنیف کی وجہ مصنف نے یہ بیان کی ہے:۔

لما کانت الحاشیۃ الموسومۃ بلواء الھدیٰ صحیفۃ لطیفۃ تبتغی بان یکتب فیھا ما فیھا من السطور بالنور علیٰ خدود الحور بید انھا لم تکن مما یحوم حولھا کل فھم وینال غرض الغرض منھا کل مھم اردت ان اشرحھا یبھج به قلوب الناقدین ویثلج به صدور المتوقدین الخ

حاشیہ کی ضخامت ۱۹۲ صفحات ہے۔ مولانا سید عبد اللہ بلگرامی کی فرمائش پر مطبع نظامی کانپور نے ۱۲۷۸ھ میں طبع کیا تھا۔ مطبع نے حقوق طباعت فاضل مصنف سے اپنے حق میں محفوظ کرائے تھے۔ مدت دراز سے یہ حاشیہ نایاب ہے۔

حَاشیۂ حمد اللہ

شرح سلم ملا حمد اللہ سندیلوی درس نظامی کی مشہور اور متداول کتاب ہے۔ اس کتاب پر متعدد فضلاء نے حواشی لکھے ہیں۔ فاضل خیرآبادی نے بھی اس کتاب کا فاضلانہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔ کتاب کے آغاز میں حمد وصلوٰۃ کے بعد لکھا ہے:۔

اما بعد فیقول العبد المفتقر الی اللہ الھادی محمد عبد الحق العمری الخیرآبادی انه لما کان علم المیزان قسطاسا للافکار ومکیالا للانظار وسلما للارتفاع الیٰ علوم حکمیۃ ومرقاۃ للارتقاء الیٰ دقائق علمیۃ وکان شرح السلم للفاضل الاوحدی المولوی حمد اللہ السندیلی حقیقا بان یمدحه الافاضل ویذعن بجودته الاماثل

ولذا صار متداولا بین العشائر والاخوان ومعتبرا عند اقرباء الروية والعرفان علقت علیہ تعلیقا وافیا لتقریر ما یکشف عن حقیقة الحال وتحریر ما یفصح المقال الخ

اس حاشیہ کی ضخامت ۴۴۰ صفحات ہے۔ گزشتہ دور میں مطبع علوی لکھنؤ میں طبع ہوا ہے۔ اور مدت دراز سے نایاب ہے۔

شرح الحواشی الزاہدیہ علی مُلّا جلال

ملا جلال (شرح تہذیب المنطق) درس نظامی کی متداول کتاب ہے۔ اس پر میر زاہد ہروی کا حاشیہ ہے۔ ان حواشی کی شرح علامہ عبد الحق خیر آبادی نے تحریر فرمائی ہے۔ کتاب کے آخر میں فاضل جلیل مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور مولانا نظام الدین کیرانوی کی تقریظ بھی شامل ہے۔ عہد ماضی میں مطبع مجتبائی دہلی نے یہ کتاب طبع کی تھی۔ حال میں شاہ عبد الحق اکیڈمی بندیال ضلع سرگودھا (پنجاب۔ پاکستان) میں فوٹو آفسٹ پر طبع ہوئی ہے۔ کتاب کی ضخامت ۱۹۴ صفحات ہے۔

شرح الحاشیة الزاہدیہ علی الامور العامہ
مِنْ شرح المواقف

شرح مواقف کی عظمت اور اہمیت اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کتاب پر میر زاہد ہروی نے حاشیہ لکھا ہے جسکی شرح علامہ عبد الحق خیر آبادی نے کی ہے۔ علامہ کی یہ تصنیف فنی حیثیت سے اہمیت کی حامل ہے۔ کتاب کے آغاز میں علامہ رقمطراز ہیں:

وبعد فیقول العبد المفتقر الی اللہ الغنی الہادی محمد عبد الحق العمری الخیر آبادی عاملہ اللہ بلطفہ البادی فی العواقب والمبادی ان الحاشیة الزاہدیة المعلقة علی الشرح المواقف الشریفہ لا یخفی عظم شانہا ووثاقة برہانہا (حتی قال) فلما رأیت الناس ہائمة حوالیہ والطلاب جاثیہ بین یدیہ شرحتہا شرحا ینشرح بہ الصدور ویتجلی بہ الحق فی آفاق الانفس انجلاء البدر ویتنحی غیاہب الدیجور من حقہ ان

یکتب بعدادالمنور علی خدود المحور فھو نور علیٰ نور الخ

۱۲۹۴ھ میں اس حاشیہ کی تصنیف سے علامہ نے فراغت حاصل کی اور ۱۳۳۴ھ میں مطبع نظامی کانپور نے اس کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ اس کی ضخامت بڑی تقطیع پر ۱۷۶ صفحات ہے۔ اب یہ حاشیہ بالکل نایاب ہے۔

شرح تہذیب الکلام

تہذیب الکلام، تہذیب المنطق کی طرح مشہور متن ہے۔ اس متن میں عقائد وکلام کے مباحث بیان کئے گئے ہیں۔ شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی نے اسکی شرح تحریر فرمائی ہے۔ اپنے حاشیہ قاضی مبارک کے صفحہ ۲۲۳ پر اس کا حوالہ دیا ہے:۔

وقد بینا ما فی ھذا التعریف من النقض والابرام فی شرح تہذیب الکلام ان شئت الاطلاع فارجع الیہ۔

یہ کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ مولینا حکیم سید محمود احمد برکاتی (نبیرۂ مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی) کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے۔

زبدۃ الحکمۃ

علامہ عبدالحق خیرآبادی نے اردو زبان میں منطق اور فلسفۂ طبعیات اور الٰہیات کے مسائل بیان فرمائے ہیں۔ ۱۳۳۱ھ میں مولوی حافظ سید اولاد حسین (خواہرزادہ علامہ فضل حق خیرآبادی) نے افضل المطابع دہلی میں اسے طبع کرایا تھا جس کے آخر میں بطور ضمیمہ علامہ موصوف کا منطق میں رسالہ حامدیہ بھی شامل تھا۔ دوبارہ ۱۳۶۹ھ میں اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ الحاج مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں اس کو طباعت نو بخشی۔ جسکی وجہ سے یہ کتاب جو عرصۂ دراز سے گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی۔ اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچ گئی۔ مولانا شبیر احمد خاں غوری کی مساعی جمیلہ سے الہ آباد عربی وفارسی بورڈ کے بعض امتحانات میں یہ کتاب داخل ہے۔ مقدمہ کے ۲۴ صفحات کے علاوہ تقطیع خورد پر کتاب کی ضخامت

۱۳۶ صفحات ہے۔

شرحِ مرقات

مولانا فضل امام خیرآبادی کی تصنیف مرقات منطق کی مشہور اور مقبول درسی کتاب ہے۔ جو ہند اور بیرون ہند کے عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔ اس کتاب کی ایک شرح فارسی زبان میں عہد گزشتہ میں لکھی گئی تھی پھر حیدرآباد سے اس کا اردو میں ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے بعد متعدد حضرات نے اس کی توضیح و تشریح اردو زبان میں کی۔

لیکن فن کی تحقیق و تدقیق کا حق مصنف مرقات کے نبیرہ فاضل اجل شمس العلماء مولانا عبدالحق نے ادا کیا ہے۔ علامہ نے یہ شرح عربی زبان میں لکھی ہے۔ اگرچہ پوری کتاب کی شرح نہیں ہے لیکن جتنے حصہ کی بھی ہے، ماہرین معقولات کی نظر میں تحقیقی نقطۂ نظر سے اس کی بڑی وقعت ہے۔ گزشتہ دور میں بخط نسخ و بخط نستعلیق یہ شرح طبع ہو چکی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا جب پاکستان میں وہاں کے ارباب ذوق کی فرمائش پر طبع کی گئی۔

حاشیہ عقائد عضدی

عقائد عضدی معقولانہ رنگ میں عقائد کا مشہور متن ہے جس کی محقق دوانی نے شرح لکھی ہے۔ جو شرح عقائد جلالی کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔ میں نے استاد محترم مولانا حافظ حکیم احمد علی صاحب سے کئی بار سنا ہے کہ اس کتاب پر مولانا عبدالحق خیرآبادی نے حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔ وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ اس حاشیہ کو حاصل کر لو۔ بہت ہی کارآمد ہے۔ لیکن اس کتاب کی نہ تو زیارت ہی ہو سکی اور نہ اس کے کسی نسخہ کا اب تک علم ہو سکا۔

التحفۃ الوزیریہ فی المسائل النحویہ

نحو میں فاضل خیرآبادی کی یہ تصنیف نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خاں والیٔ ٹونک کی مناسبت سے "التحفۃ الوزیریہ" کے نام سے مرتب کی گئی ہے ۱۲۵۵ھ کے بعد ۲ سال

مولانا کا قیام ٹونک میں رہا تھا۔ یہ غالباً اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ کتاب کی ابتدا اس طرح ہے:۔

یا مالک یوم الدین ایاک نعبد و ایاک نستعین و نصلی علی رسولک الخ
وبعد فیقول العبد الفقیر الی اللہ الغنی الہادی محمد عبد الحق خیرابادی
انجاہ اللہ عن ظلمات الجہل وہداہ الی نور العلم والفضل۔

اس کے بعد کتاب کی وجہ تسمیہ بتاکر کتاب ان الفاظ سے شروع کی ہے:۔

الکلمۃ دال علی معنی مفرد بالوضع وینقسم الخ

اختتام اس طرح ہے:۔

ہذا اٰخر بحث الحرف وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ و
اصحابہ بعدد کل لمح وطرف۔

مولانا کا خود نوشت نسخہ جس پر کچھ حواشی بھی ہیں ۹۶، اوراق پر مشتمل خدا بخش لائبریری پٹنہ میں عربی فہرست میں ۱۵۲۸ نمبر پر موجود ہے۔

حاشیہ جدیدہ بر شرح تجرید

محقق طوسی کی شرح تجرید مشہور و متداول کتاب ہے۔ کسی زمانے میں اس کا کچھ حصہ بعض مدارس کے نصاب میں بھی داخل تھا۔ مولانا عبد الحق خیر آبادی نے اس کتاب کا حاشیہ تحریر فرمایا ہے جس کا نام جدیدہ ہے۔ یہ حاشیہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایک اہل علم کے ذخیرۂ کتب میں ہے۔ جو مکہ معظمہ میں مقیم ہیں۔ اور یہ حاشیہ بھی وہیں ان کے پاس ہے۔ چونکہ یہ نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے۔ اس لئے اس سے زیادہ معلومات فراہم ہونا دشوار ہے۔

بدر الفضلاء مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی

۱۲۸۰ھ —————— ۱۳۴۷ھ

حاوی فروع واصول، جامع منقول ومعقول، آیت کردگار، یگانۂ روزگار، مولانا حکیم سید برکات احمد بہاری ٹونکی سنہ ۱۲۸۰ھ میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد ماجد مولانا حکیم دائم علی طبیب خاص دربار ٹونک، میر نگر ضلع پٹنہ (بہار) کے خاندان سادات کے گرامی قدر فرد تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے عزیز اور بہار کے مشہور فاضل مولانا محمد احسن گیلانی سے حاصل کی۔ موصوف کے تعارف کے لئے محقق طوسی کی اقلیدس کے پہلے مقالہ کی تصحیح وتحشیہ کافی ہے۔ گیلانی سے لکھنؤ اور رامپور کے مدارس دیکھتے ہوئے تکمیل علم حدیث مولانا عالم علی مرادآبادی نگینوی سے کی۔ وہاں سے اجمیر ہوتے ہوئے فن طب کی تکمیل کے لئے ٹونک پہنچے۔ طبیب خاص والیٔ ٹونک سے پڑھنا شروع کیا۔ عسرت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ ایک شب حضرت سلطان الاولیا، خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بشارت ہوئی کہ: —— " میاں سید گھبراؤ نہیں۔ خدا تمہاری مشکلات آسان کرے گا۔ "

نواب محمد علی خاں کا زمانہ تھا۔ انھیں ولی عہد کے لئے ایک شریف، عالم، متقی، اور طبیب اتالیق کی ضرورت تھی۔ ایسی ہمہ صفت موصوف ہستی سید میر نگری ہی کی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ معالج خاص سے جب مشورہ کیا گیا تو سید صاحب ہی کو تجویز کیا گیا۔ اس طرح حضرت خواجۂ بزرگ کی بشارت کے فوراً بعد عہدۂ اتالیقی ولیعہد پر فائز ہوئے۔ اور ترقیوں کا دروازہ کھل گیا۔ جب ولی عہد (حافظ ابراہیم خاں خلیل) تخت نشیں ہوئے تو سید صاحب نہ صرف طبیب خاص بنے بلکہ وزیر اعلیٰ کا درجہ بھی نصیب ہوا۔ خان کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ جاگیر میں گاؤں بھی عطا ہوا۔

سید صاحب کی شادی ضلع مظفر نگر کے قصبہ پھلت کے اس شریف گھرانے میں ہوئی جس کا تعلق امام العلماء حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ انھیں بی بی

صاحب سے سب سے پہلے وہ آفتاب علم طلوع ہوا جس نے ہند، کابل، بخارا، خیوا، کاشغر وغیرہ کے ذرات کو روشن و منور کر دیا۔ اور جو آگے چل کر حقیقت میں برکاتِ احمدیہ ثابت ہوا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد سید صاحب نے اپنے ایک قدیم دوست اور صوبہ بہار کے مشہور عالم، مولانا لطف علی دھنجوہوی کو صاحبزادہ کی تعلیم کے لئے ٹونک بلا لیا۔ حمد اللہ تک درسیات موصوف ہی سے پڑھیں۔ مولانا محمد حسن ٹونکی سے ہدایہ پڑھی۔ استاذ کی توجہ اور ذاتی صلاحیت کی بنا پر طلب علم کا حقیقی جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور اس کے لئے ٹونک کا دامن صحرا تنگ نظر آیا۔ باپ جولائی فرزند کو پل بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل کرنا گوارا نہ کرتے تھے اور اسی بنا پر ایک جید عالم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ بیٹے کے اشتیاق کو دیکھ کر اطلبوا العلم ولو کان بالصین کے مطابق اجازت شدّ رحال پر مجبور ہوئے۔ ہندوستان کے طول و عرض کی طرف نگاہ اٹھی تو سب سے پہلے اسی حلقۂ درس پر نگاہ پڑی جو اس زمانے میں علوم عقلیہ کا اگر مرکز وحید نہیں تو سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں مرجع تھا۔ شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی کا قیام خیرآباد کے بجائے نواب کلب علی خاں کی ناز برداریوں کی بدولت رامپور تھا۔ حمد اللہ اور ہدایہ کا فارغ شدہ یہ طالب علم ایساغوجی اور میزان منطق جیسی ابتدائی کتابوں کے درجہ میں نئے سرے سے شریک کر دیا گیا۔

استاد کی خدمت میں شاگرد نے ۱۵ سال گذارے۔ وہ بھی کن صبر آزما حالات میں یہ ناز و نیاز کی طویل داستان ہے۔ اس دور میں افسانوں سے زیادہ اس کی حقیقت سمجھنا دشوار ہے۔

بہر حال سعادتمند شاگرد نے پندرہ سال استاذ کی خدمت میں اس طرح گزارے کہ جس کتاب حمد اللہ کو گھر سے پڑھ کر آئے تھے جب وہاں تک کئی سال میں پہنچے تو ایک بار نہیں کئی بار سماعًا و قراۃً اسے پڑھا اور سنا۔ نہ صرف نصاب درس نظامیہ بلکہ قدما کی کتابیں بھی پڑھیں، جن میں شفاء ابن سینا، شرح اشارات طوسی، افق المبین میر باقر داماد، حواشی دوانی، حواشی مرزا جان، خوانساری، مولفات قوشجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خود مولانا کی تصانیف

خارج از نصاب "جواہر غالیہ" وغیرہا بھی پڑھیں۔

تکمیل معقولات کے بعد استاد کی اجازت حاصل کر کے اپنے حقیقی خالو اور خاندان ولی اللہی کے ایک غیر مشہور مگر معتبر و مستند محدث مولانا محمد ایوب پھلتی قاضی ریاست بھوپال کی خدمت میں حصول علم حدیث نبوی کے لئے حاضر ہو گئے۔

ٹونک کے طلبہ کی ایک جماعت بھی جن میں مولوی نصیر احمد، مولوی خلیل الرحمن اور مولوی عبد الواسع بھی تھے۔ اس خیرآبادی شاگرد اور ٹونکی استاد کے ساتھ بھوپال گئی بھوپالی طلبہ بھی شریک درس ہوئے بھوپال جانے والے تینوں طلبہ فاضل بن کر نکلے! ایک مدرسہ خلیلیہ ٹونک کے صدر مدرس اور دوسرے محکمۂ شرعیہ ٹونک کے مفتی اور تیسرے شیخ الفقہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد بنے۔ ایک سال سے زیادہ بھوپال میں رہ کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔

زمانۂ طالب علمی میں اپنے والد ماجد اور حکیم رضی الدین دہلوی کے خاندان کے کسی فرد سے طب کی تکمیل بھی کر لی تھی۔ حکمت و طب دونوں اصطلاحوں کے لحاظ سے واقعۃً حکیم تھے۔ اور یہ لقب اتنا غالب رہا کہ بعد وفات بھی حکیم صاحب ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

زمانۂ طالب علمی ہی میں شادی بھی ہو گئی تھی۔ اور رامپور کے کسی بزرگ سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔

حکیم صاحب تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو والد ماجد حکیم دائم علی کی عمر پچاس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ قویٰ مضبوط تھے۔ چاہتے تو فرائض ملازمت انجام دے سکتے تھے لیکن غلبۂ تصوف کی وجہ سے ذکر و شغل اور عزلت و گوشہ نشینی کی طرف طبیعت مائل تھی۔ نواب صاحب سے اصرار کر کے بلند اقبال فرزند کو اپنی جگہ مقرر کرا دیا۔ مولانا حکیم برکات احمد چاہتے تو اپنے والد کے اثرات اور اپنی اہلیت و صلاحیت کی بنا پر بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے لیکن کبھی مال و جاہِ دنیا کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ معالج خاص کے عہدہ ہی پر مدۃ العمر اکتفا کی۔ دنیا سے بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ حضرت الاستاذ مولانا معین الدین اجمیری مرحوم فرماتے تھے کہ تمام عمر روپیہ کے پیسے شمار نہ کر پائے۔

زندگی کا پہلا حصہ درس و افادہ تھا۔ دوسرے حصہ میں تالیف و تصنیف کا ذوق

غالب ہوا۔ آخر عمر میں ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اس شغل میں ڈوب گئے جس کے لئے بنائے گئے تھے۔ کل عمر ۶۷ سال کی ہوئی۔ شروع میں مدرس تھے۔ پھر مصنف ہوئے۔ اور آخر میں وہ ایک صوفی صافی درویش نیک اندیش تھے۔

بھوپال میں طلبہ کی جو جماعت مستفید ہو رہی تھی انھیں میں کچھ طالب علم ہمراہی میں ٹونک پہنچے۔ یہاں باضابطہ درس کا آغاز ہوا۔ ابتداءً آپ کے پاس کچھ مقامی اور بیرونی طلبہ کا اجتماع تھا۔ رفتہ رفتہ آپ کی درسی عظمت کا احاطہ وسیع ہونے لگا۔ ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے طلبہ آپ پر ٹوٹ پڑے۔ یہاں تک نوبت تھی کہ ایک زمانے میں صبح پانچ بجے سے کر رات کے گیارہ بجے تک مسلسل سبق پڑھاتے رہتے تھے۔ طلبہ کی کثرت کو دیکھ کر ریاست نے ایک شکستہ مکان میں قلیل تنخواہ پر چند مدرسوں کو رکھ لیا۔ یہ مدرسین تحتانی طلبہ کو درس دیتے تھے۔ والیٔ ٹونک نواب محمد ابراہیم خان خلیل کے تخلص کی مناسبت سے اس مدرسہ کا نام مدرسہ خلیلیہ رکھا گیا۔ جو خدا کے فضل سے اب تک اسی شان سے چل رہا ہے۔ اس وقت حکیم صاحب کے تلمیذ التلمیذ مولوی منتخب الحق بہاری (شاگرد علامۃ الہند مولانا الحاج معین الدین ... الاجمیری) صدر مدرس ہیں۔

بیرونی طلبہ کے کھانے کے دو انتظام تھے:۔

پہلی صورت یہ تھی کہ طلبہ کی ایک بڑی جماعت حکیم صاحب ہی کی ذاتی مہمان تھی۔ چار سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ریاست سے ملتی تھی۔ جاگیر میں ایک گاؤں بھی تھا وقتاً فوقتاً مسہل وغیرہ کے موقع پر ریاست خطیر رقم بھی پیش کرتی رہتی تھی۔ برسوں دیکھا گیا کہ بیس پچیس آدمیوں کا کھانا پک کر الگ خوانچوں میں طالب علموں کے پاس آتا تھا۔ گھر میں بجز ایک ماما بریرہ کے مشکل سے کوئی خادمہ رہتی تھی۔ لیکن یہ حکیم صاحب کی کرامت تھی یا بیگم صاحبہ کی غیر معمولی محنت کہ تازہ تازہ گرم چپاتیاں بکرے کے گوشت کا سالن صبح ۹ بجے تک طلبہ کو مل جاتا تھا۔ اسی طرح شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر تازہ کھانا کھایا جاتا تھا۔ کچھ طلبہ حکیم صاحب کے علم دوست احباب کے مکان پر بعض

مساجد شہر میں رہتے تھے۔ تھوڑی جماعت مدرسہ خلیلیہ سے وظیفہ پاتی تھی۔

طلبہ پر بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔ درس و تدریس کے وقت پورا رعب و جلال رہتا تھا۔ عام مجلسوں میں پرلطف گفتگوئیں رہتی تھیں۔ دلچسپ خطابات سے بھی طلبہ کو نوازا جاتا تھا۔

بغیر مطالعہ کے قطبی و شرح جامی بھی نہ پڑھاتے تھے۔ جو طلبہ شروح و حواشی کی مدد سے مطالعہ دیکھتے ان پر سخت ناراض ہوتے۔ غیر درسی مجالس میں تحصیل علم اور قیمت علم کے متعلق ایسے واقعات سناتے کہ خود بخود طلبہ علم کی تشنگی سے معمور ہو جاتے تقریروں، حاشیوں، شرحوں اور قلمی نسخوں کی نقل میں رغبت کا عجیب سلسلہ جاری رہتا۔

ایک مرتبہ فلسفہ کی کتاب کی نقل کے سلسلے میں دو طالبعلموں میں کشمکش یہاں تک بڑھی کہ دونوں کے ہاتھ میں چھری دیکھی گئی۔ ایک مرتبہ خوانساری کا حاشیہ[1] شفا اور مولانا فضل امام خیرآبادی کا حاشیہ ملا جلال جنھیں آپ کسی کو نہ دکھاتے تھے اپنے شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانی کو جلد بندھوانے کے لئے دیا کہ دو روز میں جلد بندھوا کر داخل کر دینا۔ مولانا مناظر احسن نے دو شبانہ روز لگاتار محنت کر کے انھیں نقل کر لیا، اور چند گھنٹوں میں جلد ساز کو زیادہ اجرت دے کر جلد بندھوا کر حاضر خدمت کر دیئے۔

علاوہ درسیات کے طب اور مثنوی مولانا روم کا بھی درس رہتا فلسفہ شروع کراتے تو شمس العلماء مولانا عبدالحق کی تصنیف زبدۃ الحکمۃ (جو اردو میں ہے) سے ابتدا فرماتے۔

آپ کے یہاں کے طلبہ امتحان کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ جب کبھی سال میں باقاعدہ امتحان لینا ہوتا تو سوالات پہلے بتا دیتے پھر امتحان لیتے۔ اعتراضات کرتے، جرح فرماتے۔ جب اس میں کامل نکلتا تب پاس فرماتے۔ شعبان، رمضان اور شوال میں عموماً تعلیم بند رہتی

---

[1] مولوی حکیم احمد علی خیرآبادی راوی ہیں کہ لکھنؤ سے مولانا عبدالحق کے نام خط آیا کہ فاضل خوانساری کا حاشیہ دستیاب ہو گیا ہے اسکی قیمت پچاس روپیہ ہے۔ حکیم صاحب نے وہ خط دیکھ لیا لکھنؤ پہنچکر حاشیہ خریدا اور ٹونک روانہ ہو گئے۔ مولانا نے روپیہ لیکر آدمی لکھنؤ بھیجا تو معلوم ہوا کہ کوئی شاگرد موصوف ہی کے لئے حاشیہ خرید کرنے جا چکا ہے۔ مولانا سمجھ گئے کہ برکات ہی کی یہ حرکت ہو سکتی ہے۔ فوراً ٹونک خط لکھا کہ اگر حاشیہ فوراً حاضر نہ کیا تو عاق کر دوں گا۔ حکیم صاحب نے قسموں سے موکد کر کے لاعلمی کا عریضہ روانہ کیا! اور بعد میں کفارہ و توبہ سے کام لیا۔ یہ وہی حاشیہ تھا۔

ہفتہ میں منگل اور جمعہ کو اسباق بند رہتے۔

فلسفہ و منطق کے متعلق فرماتے کہ ان کتابوں کی حیثیت ایسی ہے جیسے پہلوان مگدر وغیرہ ہلائے کہ مقصد مگدر نہیں بلکہ پٹھے اور قویٰ مضبوط کرنا ہے۔ تاکہ اکھاڑہ میں کام آئیں۔ ان کتابوں سے بھی ذہنی قویٰ مضبوط کرنا ہے تاکہ اسلام کی تائید میں مخالفین کی سرکوبی کی جائے۔ یہی مقصد پیش نظر تھا۔ اسی کے ماتحت ایک روز خوش ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنا درس چند نشتروں کی تیاری کے لئے قائم کیا تھا۔ سو الحمد للہ! دو نشتر تو مجھے مل گئے۔ ان شاء اللہ ان سے بڑا کام نکلے گا۔

حکیم صاحب سے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ شاگرد رشید مولانا مناظر احسن گیلانی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے ان مضامین سے ماخوذ ہے جو موصوف نے حکیم صاحب کے انتقال کے بعد نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خان شروانی کی ہدایت پر ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں معارف اعظم گڈھ کے مسلسل تین نمبروں میں لکھے تھے۔ موصوف نے ٹونک میں آٹھ سال گذار کر حکیم صاحب کے دریائے فیض میں شناوری کی ہے۔ اس لئے اکثر و بیشتر واقعات و حالات چشم دید ہیں۔ کہیں کہیں حضرت الاستاذ مولانا اجمیری، اور دوسرے اکابر سے سنے ہوئے حالات بھی میں نے درج کر دیئے ہیں۔ اب میں مولٰنا مناظر احسن کے قائم کردہ عنوانات کے ماتحت انھیں کی عبارت حسب موقعہ حذف و اضافہ کے ساتھ درج کرتا ہوں۔

دورِ تالیف تقریباً بیس سال تک مختلف علوم و فنون کی مسلسل تعلیم و درس کے بعد ادھر پچھلے دس پندرہ سال سے حضرت نے اپنی توجہ درس سے زیادہ تصنیف و تالیف کی طرف پھیر دی تھی۔ ان کی کل کتابیں عربی زبان میں ہیں جن میں بعض تو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ اور مختلف مضامین، درسی کتابوں کے مشکل مقامات کے حل سے متعلق ہیں۔ ایک ضخیم کتاب آپ نے الحجۃ البازغۃ کے نام سے لکھی جس میں مابعد الطبیعیات کے چند اہم ابواب پر مجتہدانہ انداز سے گفتگو فرمائی گئی ہے۔ نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان مرحوم (استاذ حضور نظام) نے اس کو حکومت آصفیہ کی جانب سے شائع بھی کرا دیا ہے۔

ایک کتاب آپ نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کی۔ یہ مولانا بحر العلوم کی شرح منار

فارسی کا عربی ترجمہ ہے۔ کاش شائع ہو جاتی تو نصاب کے لئے بہترین کتاب ہے۔

آخر عمر میں آپ پر تصوف کا غلبہ ہو گیا اور چند اہم کتابیں اس موضوع پر لکھیں۔ جو سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ آپ نے دیانند سرستی کے فلسفیانہ اصول کی تردید میں زبان اردو کچھ نوٹ کرائے تھے۔ جس کو باضابطہ مرتب کر کے صدقۂ جاریہ فی ردّ آریہ کے نام سے حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد نے شائع بھی کرا دیا ہے۔ اردو میں اگر حضرت کی کوئی یادگار ہے تو یہی ہے۔ بعض نزاعی مسائل کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک ضخیم شرح کا بھی آپ نے آغاز کیا تھا۔ بہر حال حدیث و تصوف کے سوا آپ کی تمام تالیفی کوششوں کا تعلق ایسے مسائل سے ہے۔ جس کی مانگ علم کے دورِ جدید میں مشکل سے ہو گی۔

ایک رسالہ تار کی خبر پر اعتماد یا عدم اعتماد اور دوسرا نوٹوں کے ہنڈی کی طرح معنے یا نہ ہونے پر بھی تصنیف فرمایا گیا ہے۔ اول الذکر رسالہ چھپ چکا ہے۔ دونوں میں دلائل و براہین میں کافی زور صرف کیا گیا ہے۔

مجاہدات و ریاضات

حضرت میں تقویٰ، انابت، اخلاص باللہ اور عشق نبوی کے جوہر ابتدا سے منور تھے۔ لیکن ان میں آب و تاب اس وقت آئی جب علم و عقل سے آپ بالکل تھک کر بیٹھ گئے۔ یہ تو ہمیشہ سے آپ کا معمول تھا کہ رات کے تین بجے ساڑھے تین بجے اٹھ جاتے۔ تہجد کی نماز پڑھتے۔ پھر جہر کے ساتھ صبح تک ذکر کرتے۔ صبح کی نماز ہٹو کی مسجد میں باجماعت ادا کرتے۔ ایک خاص منظر قابل دید اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مسلسل زور زور سے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر ادعیۂ ماثورہ کا ایک سلسلہ نہایت لجاجت سے شروع فرماتے تھے۔ مسجد سے اٹھ کر گھر آتے تانگہ تیار رہتا تھا۔ علی الصباح نذر باغ نواب صاحب کو دیکھنے جاتے۔ اور راستہ میں قرآن مجید اور دلائل الخیرات کے اوراد ختم کرتے۔

آپ پر حج و زیارت کا شوق مسلط ہوا۔ اور حجاز کے سوا شام و فلسطین اور مصر ہوتے ہوئے آپ ہندوستان آئے۔ اس کے بعد آپ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ فقراء

اور درویشوں کے یوں تو ہمیشہ سے معتقد تھے لیکن اس کے بعد اس جماعت کی دامن آویزی کا جذبہ بہت تیز ہو گیا۔ اسی عرصہ میں ایک ضرورت سے حیدر آباد جانا ہوا۔ وہاں تلاشِ فقراء میں آپ کی نگاہ ایک ایسے فقیر پر پڑی جو اپنی ظاہری شکل و صورت میں ایک معمولی سے آدمی تھے۔ اور رسمی علوم میں بھی ان کا پایہ کچھ بلند نہ تھا لیکن فلسفہ و منطق کا یہ نہنگ جب اس فقیر کے آستانہ پر حاضر ہوا تو پچاس سال کے سارے سرمایہ کو ان کے قدموں پر نثار کر دیا۔ ان کا نام حضرت کمال اللہ شاہ عرف مچھلی شاہ تھا حضرت سے بعض لاہوتی مسائل پر گفتگو ہوئی اس کے بعد حضرت آبدیدہ تھے۔ اپنی گذشتہ محنت پر پچھتاتے تھے تقریباً ایک ماہ تک حیدر آباد قیام رہا۔ وقت کا اکثر حصہ انھیں بزرگ کی چٹائی پر متحیرانہ بسر کرتے تھے۔ وہ کچھ کہتے جاتے اور حضرت سنتے رہتے تھے۔

یہ بزرگ مدارس کی جماعت صوفیہ کے ایک بڑے اصلاحی گروہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے سلسلہ کے بزرگوں نے عربی فارسی میں ایک خاص قسم کا ذخیرہ مختلف کتابوں کی شکل میں مہیا کیا ہے حضرت نے ڈھونڈ کر یہ کتابیں قلمی و مطبوعہ مہیا کیں۔ اور شاہ صاحب سے اجازت لے کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔ آخر زندگی میں ان کا شغلہ ان ہی کتابوں کا مطالعہ اور ان سے مطالب استنباط کر کے کئی کتابوں کی تدوین رہ گیا تھا مچھلی شاہ صاحب نے ایک بار فرمایا کہ میں حکیم صاحب کو عالم مثال میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سر پر تاج زرنگار ہے اور وہ کسی منصب عالی پر سرفراز کئے گئے ہیں۔ یہ واقعہ حضرت مچھلی شاہ نے حکیم صاحب کی زندگی ہی میں بیان فرمایا تھا۔

سخاوت

حضرت کا سینہ نہایت وسیع اور چشم کشادہ تھی۔ طالب علموں کے ساتھ تو اولاد جیسا برتاؤ تھا۔ اس کے سوا غریبوں، بیواؤں، اور دوستوں کے ساتھ مخفی طور پر آپ بہت سلوک فرماتے تھے خصوصاً اقربا کے ساتھ آپ کا سلوک بالکل غیر معمولی تھا۔ تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ہر مہینہ ان عزیزوں کو مشاہروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اخیر میں غریبوں کی مہمان نوازی کا جذبہ آپ پر بہت غالب ہو گیا تھا۔ محبت رسول کی آگ جوں جوں تیز ہوتی تھی۔ دیار محبوب کا ہر آنے والا آپ کو بے چین کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ اسی

شوق کے پیش نظر آپ نے چند سال پہلے عربوں کے لئے ایک مستقل سرائے اپنے مصارف سے تعمیر کرائی تھی۔ اور اس کا نام رباط رکھا تھا۔ جس میں ہر قسم کے آرام کا سامان آپ کی طرف سے تھا۔ ٹونک میں جو عرب آتا خصوصاً اگر مدینہ کا ہوتا تو اس کے سامنے معمولی خادم کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرتے۔ خود دیتے، امراء سے دلاتے۔ اور نواب صاحب سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے ان عربوں کو دلوانا اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ حیدرآباد اور دوسری ریاستوں کو اپنے اپنے تعلقات و اثرات کی بنا پر عربوں کی سفارش کے خطوط تحریر فرماتے۔ بہر حال آپ کی اخلاقی صفات میں جود و بخشش کی صفت آپ میں بہت نمایاں تھی۔

سادگی اور قناعت لباس اور سواری وغیرہ میں آپ بالکل سادہ تھے معمولی لباس زیب تن فرماتے۔ مزاج میں وارفتگی حد سے گذری ہوئی تھی۔

مزاج میں حرص کا شائبہ مطلقاً نہ تھا۔ مہاراجہ اندور نے مختلف ذرائع سے آپ پر زور دیا۔ بارہ سو مشاہرہ دینا منظور کیا۔ اس کے سوا اور بھی وعدے کئے۔ لیکن آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ ان باتوں کا اثر نواب صاحب پر بہت پڑتا تھا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ نواب یہ خیال کرتے ہیں کہ میں ان کو چھوڑ دوں گا۔ حالانکہ ان کا یہ عجیب خیال ہے۔ حیدرآباد دکن کسی ضرورت سے جانے لگے تو نواب صاحب لپٹ کر کہنے لگے کہ مولوی برکات احمد صاحب! جانے کو تو جاتے ہو لیکن مجھے نہ چھوڑ دینا۔ بھائی ٹونک سے تو تم مجھے دفن کر کے ہی جانا۔ کیا معلوم تھا کہ معاملہ بالعکس ہونے والا ہے۔ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

ٹونک ہی میں ایک واقعہ آپ کی مالی آزمائش کا پیش آیا تھا۔ اس وقت چاہتے تو چھ لاکھ روپئے جائز طریقہ پر آپ کو مل جاتے۔ لیکن بعض لوگوں کی مروت سے آپ نے اس روپیہ کو بری طرح ٹھکرا دیا۔

مناظرہ بے نظیر منطقی اور فلسفی ہونے کے باوجود آپ نے کبھی کسی سے زبانی مناظرہ نہیں فرمایا۔ رئیس رامپور نواب حامد علی خاں کے بار بار طلب فرمانے پر صرف

ایک بار مولوی عبدالوہاب بہاری سے کچھ مکالمہ ہوا اور بس! اس مناظرہ کی کیفیت حضرت الاستاذ مولانا اجمیری نے اپنے رسالہ "چہار تازیانۂ قہار" میں تفصیل سے لکھی ہے اور ان فنی مسئلوں کو بھی تحریر فرمایا ہے۔ جن پر گفتگو ہوئی تھی بعض عقلی اور چند مذہبی جزئیات پر آپ میں اور آپ کے بعض معاصرین استاذ الاساتذہ مولانا فضل حق رامپوری مرحوم پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور اور شمس العلماء مولانا عبداللہ ٹونکی وغیرہما میں نوک جھونک رہی۔ نیز بعض مسائل دیوبندیہ کے متعلق آپ نے کبھی کبھی کچھ لکھا۔

تلامذہ

وسط ایشیا، ترکستان کے شہروں خصوصاً بخارا، تاشقند وغیرہ سے لے کر بنگال کے آخری حدود تک تقریباً ہر بڑے شہر میں آپ کا کوئی نہ کوئی شاگرد ضرور نظر آئے گا۔ اور اچھی حالت میں نظر آئے گا۔ بیرون ہند سے آپ کے پاس طلبہ خاص کر اس لئے زیادہ آتے تھے کہ علاوہ درس نظامیہ کے آپ خصوصیت کے ساتھ ابن سینا، طوسی، قوشجی، دوانی، خوانساری، میر باقر داماد وغیرہم کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ جو اس زمانے میں ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ شاید دنیائے اسلام بھی اس انداز سے نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ماوراء النہر کے طلبہ میں ان مصنفین کی کتابیں پڑھنے کا خاص شوق تھا۔

علمائے ہند میں مولانا معین الدین اجمیری، مولانا خلیل الرحمٰن ٹونکی، مولانا نصیر احمد پھلتی، مولانا عبدالرحمٰن چشتی حیدرآبادی، مولانا اشرف ملتانی، مولانا عبدالسبحان ہزاروی عہ مولانا مقبول احمد دربھنگوی، مولانا محمود سندھی، مولانا عبیداللہ الاصم البہاری، مولانا عبدالحمید ترہتی، مولانا محمد شریف مبارکپوری، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا فضل کریم بہاری، مولانا احمد کریم بہاری، مولانا عبدالواسع، مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہم حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں اکثر ہندوستان کے مرکزی مدارس کے صدر مدرس یا مدرس رہے ہیں۔ اسلامی علوم کے حلقۂ علمی میں وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ ان تمام حضرات کا دریائے فیض پورے شان

عہ سلطان المناظرین مولانا قاضی عبدالسبحان کھلابٹی (ہزاروی) بھی آپ کے تلامذہ میں سے تھے۔ محمد موسیٰ عفی عنہ

کے ساتھ بہتا رہا۔ ان میں سے اب جو باقی رہ گئے ہیں ان سے اجمیر، بہار، حیدرآباد وغیرہ کی مسند درس وافتا رونق پا رہی ہے۔ ایک عالم دریائے علم کی ان نہروں سے سیراب ہوتا رہا۔ اور اب بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ سیراب ہو رہا ہے۔

اہل وعیال حضرت کی پہلی شادی میرنگر (آبائی وطن) میں ہوئی تھی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کے بعد بہار ہی کے ایک بزرگ مولانا عبدالرحمٰن ساکن پترہٹہ ضلع مونگیر کی صاحبزادی سے آپ کا دوسرا نکاح ہوا۔ حضرت کی یہ بیوی صاحبہ حقیقت یہ ہے کہ ان گرامی قدر خواتین اسلام میں سے تھیں جنھوں نے اپنے کو علم ودین کی خدمت میں اپنے شوہر کا دست راست ثابت کیا تھا۔ بیوی صاحبہ نے حضرت کے تمام علمی مہمانوں کی خاطر مدارات میں نہ صرف ان کے قیام وطعام کا تیس پینتیس برس تک انتظام کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ انھوں نے ان بچوں کو مہربان ماں کی طرح پالا۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ بعض دفعہ انھیں غریب الدیار طلبہ کے مصارف کے سلسلے میں اپنے زیور خفیہ طور پر فروخت کرنے پڑتے تھے۔ طلبہ کی کیسی ناز برداری کرتی تھیں اس واقعہ سے اندازہ ہو سکے گا:-

مولوی حکیم ظفرالحق خیرآبادی کو حکیم صاحب تعلیم کے لئے ٹونک لے گئے۔ یہ استاد کے پوتے تھے۔ اور دودمان عالی کے تنہا چشم وچراغ، ان پر حکیم صاحب کی توجہ ومہربانی سب سے سوا ہونا ہی چاہئے تھی۔ موصوف کے حصے میں بھی خاندانی جلال کافی آیا ہوا ہے۔ اور وہ زمانہ تو شہزادگی وصاحبزادگی کا تھا ہی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ صاحبزادہ کو کھانا ناپسند ہوا یا دیر میں پہنچا تو آپ نے سالن کی رکابی اٹھا کر باہر سے حویلی میں پھینک دی اور جو کچھ جی میں آیا کہہ سنایا۔ لیکن اس نیک بخت بیوی نے کبھی شکایت کا ایک حرف زبان پر لانا گناہ سمجھا۔ اور ہر طرح معذرت وخوشامد سے رضامند کرنے کی کوشش کی۔

موصوف جب اپنی زبان سے اس قسم کے واقعات سناتے ہیں تو ان فرشتہ خصلت انسانوں کے تذکرہ پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر بیوی صاحبہ نہ ہوتیں تو شاید برکاتی سلسلے کے ان علم برداروں کو علمی آبادیوں میں نہیں پایا جاسکتا تھا۔ آپ ہی حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد مرحوم کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اور محمد میاں کے سوا کوئی دوسری نسلی نشانی موجود نہیں تھی۔ لیکن جس کی علمی ذریت زمین کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہو کیا ہوا اگر ایک اکلوتے بچے کے سوا اس نے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی ؎

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر
یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند

مولانا حکیم محمد احمد علماً و منصباً، دیناً و عملاً اپنے والد مرحوم کے سچے جانشین تھے۔ والد کے بعد والیٔ ٹونک کے معالج خاص مقرر ہوئے اور موصوف کی جگہ درس و تدریس کی باگ آپ نے ہاتھ میں لی تھی کہ دو تین سال کے بعد والد ماجد کی خدمت گذاری کے لئے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ اور یہ حادثۂ علمی بالکل اسی صورت سے واقع ہوا جیسا کہ حکیم صاحب کے استاذ شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی کو پیش آیا تھا۔ شمس العلماءؒ کے دو سال بعد ہی آپ کے صحیح جانشین مولانا اسدالحق اعزہ و اقارب کو داغ مفارقت دے کر نسلی سلسلۂ علم کو منقطع کر گئے تھے۔

مولانا حکیم محمد احمد نے دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ مولوی محمود میاں[1] اور مولوی مسعود میاں دادا کے شاگرد مولانا محمد شریف صدر مدرس دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف کی خدمت میں رہ کر تحصیل علوم کر رہے ہیں اور یونیورسٹی کے امتحانات بھی دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف نسلی بلکہ علمی یادگار بھی ان دونوں کو بنائے۔ بعض مطبوعہ اردو اور عربی علمی رسائل بھی مرحوم کی یادگار ہیں۔ انھیں میں سے "احسن الکلام فی مایم الاجسام" بھی ہے۔

وفات ترسٹھ برس کی عمر کے بعد یکایک آپ ہستی کی اس منزل پر پہنچ گئے جہاں انسان دنیا میں غروب ہو کر آخرت میں طلوع ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کی وفات کے حالات کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نجل سعید خلف ارشد مولانا حکیم محمد احمد مرحوم

---

[1] جناب حکیم محمود احمد برکاتی صاحب علم شخصیت ہیں اور کراچی میں مطب کرتے ہیں۔ محمد موسیٰ عفی عنہٗ۔

کے اس مطبوعہ خط کو نقل کر دیا جائے جسے انھوں نے اقطار ہند کے تعزیت ناموں کے جواب میں شائع فرما کر متعلقین کے پاس بھیجا تھا[1]

جناب محترم . . . .   السلام علیکم و علی جمیع من اتبع الہدیٰ۔

آنجناب کا تار و مکتوب گرامی بہ سلسلۂ تعزیت و بہ طلب حالات مفصل علالت و وفات والدی سراج الملۃ والدین حضرت مولانا برکات احمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ موجب ممنونیت و تسکینِ خاطر فقیر حقیر ہوا۔ جواباً التماس ہے کہ حضرت علیہ الرحمہ کو دو سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ ضعف معدہ کی شکایت تھی۔ سال گذشتہ اسی حالت میں بے تابانہ و پروانہ وار زیارت سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم و حج ثانی کے لئے روانہ ہو گئے۔ چونکہ موسم نہایت تیز و تند تھا اور طبیعت پہلے ہی سے مضمحل تھی اس لئے اسہال معدی میں زیادتی پیدا ہو گئی۔ سفر مبارک سے معاودت فرمانے کے بعد برابر سلسلۂ اسہال جاری رہا۔ غذا بجائے دو وقت کے ایک وقت ہو گئی۔ ریاضت کی کثرت، درس و تدریس کی پوری محویت، تصنیف و تالیف میں کامل انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضعف یوماً فیوماً بڑھتا گیا اور مرض الموت کی ابتدا یوم عید الفطر ۱۳۴۶ھ سے اس طرح شروع ہوئی کہ شدت سے دفعۃً بخار ہو گیا اور کامل تیئیس ۲۳ روز تک مفارق نہ ہوا۔ اور پھر ورم جگر اور سوء القنیہ ہو کر نوبت باستسقا رسید۔ امراض کا اس طرح ہجوم تھا مگر وہاں صحت جسمانی کی طرف تغافل اور بے توجہی کا وہی عالم تھا۔ جو ہمیشہ رہا۔ اور جس نے صحت کو بالآخر اس اخیر درجہ کو پہنچا دیا۔ تکالیف کے اخفا کی اس طرح کوشش جاری تھی۔ ذکر و شغل، حبسِ دم، پاس انفاس، کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اسی وجہ سے دو مرتبہ قئ الدم بھی ہوئی۔ ماہ صفر کے اخیر عشرہ میں مرض کی انتہائی شدت ڈبل نمونیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جس کی کمزور جسمانیت تاب نہ لا سکی۔ اور آفتاب فضل و کمال غرۂ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ کو شب کے ۲ بجے

---

[1] مکرمی مولوی حکیم ظفر الحق خیر آبادی نے ۷ ستمبر ۱۹۳۶ء کو میری حاضری خیر آباد پر یہ خط عاریۃً مجھے عنایت فرمایا۔

غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وما کان قیسٌ ہلکہٗ ہلکُ واحد
ولکنّہ بُنیانُ قومٍ تہدّما

وفات شریف سے ایک شب پہلے وصیت فرمائی کہ:۔

میرے مدرسہ[1] اور رباط[2] کا پوری طرح خیال رکھنا۔ درس وتدریس کا سلسلہ پوری قوت کے ساتھ قائم رکھنا میرے والد ماجد حضرت مولانا حکیم دائم علی صاحب بہاری) رحمۃ اللہ علیہ کا عرس ضرور جاری رکھنا۔ میرے فاتحہ کا بہت خیال رکھنا۔"

دورِ علالت کامل پانچ ماہ قائم رہا۔ مگر ایک روز بھی شغلِ علمی ترک نہ ہوا۔ جمعہ کے روز حضرت کی زندگی کا آخری دن اور یوم الرحیل تھا۔ میں جمعہ کی نماز سے واپس ہوا تو "التعرف فی حقیقۃ التصوف" کے مطالعہ میں مستغرق تھے۔ انہیں ایامِ علالت میں تین عمیق علمی تصانیف فرمائیں۔ جن کا اختتام زندگی کے لمحات کے اختتام کے ساتھ ہوا ہے۔ اور جن کو حضرت علیہ الرحمہ کے معلومات کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔ اور جن میں امتناع نظیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامتناع کذب الواجب جل مجدہ کو ایسے قوی تر اور روشن دلائل وحجج ساطعہ اور براہین قاطعہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جیسا امام وقت ہی کر سکتا تھا۔ اور تیسری کتاب تصوف کے مسائلِ مشکلہ کے حل میں بہترین کتاب ہے۔ ان ہر سہ کتب کی تصانیف شروع مرض میں اس امر سے مطلع ہونے کے بعد کہ اب دنیا سے کوچ ہے۔ شروع کی گئی۔ اور وفات حسرت آیات سے چند ساعت پیشتر اختتام کو پہونچائی گئیں[3]۔ یوم الرحیل میں برابر عصر سے مغرب تک عیادت کے واسطے جوق جوق لوگ آتے رہے۔ نہایت متبسم چہرہ اور خندہ پیشانی سے بات چیت اور تلقینِ ارشاد میں مصروف رہے۔ نماز مغرب سے فارغ ہونے کے بعد عشاء تک

---

[1] دار العلوم نظامیہ خلیلیہ ٹونک۔ [2] مسافر خانہ حضرت موصوف۔

[3] آپ کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:۔ الحجۃ البازغہ، اتقان العرفان فی تحقیق ماہیۃ الزمان (بقیہ ص پر)

درود و وظائف کا سلسلہ جاری رہا۔ اور عشار کے بعد خلاف معمول مدت دراز کے بعد تناول طعام فرمایا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ دس بجے تک آرام فرمایا پھر پوری قوت کے ساتھ بیدار ہو کر دو بجے تک اولاً تلاوت قرآن شریف اور پھر ذکر بالجہر میں مصروف رہے۔ دو بجے سے جہر کی شدت میں فرق آنا شروع ہوا۔ اور یٰس شریف جو ایک مدت سے رات کو پڑھی جا رہی تھی ختم کرائی۔ اور پھر ذکر میں مصروف ہوئے۔ تا آنکہ ٹھیک تین بجے اسی حالت میں جان بحق تسلیم ہوئے اور وہ زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی جس کی تذکیر و تلقین سے عالم گونج اٹھا۔ خدا جانے یہ کیا اسرار الٰہی میں سے تھا کہ تین روز سے آنکھوں میں ایسی غیر معمولی چمک دمک اور دلآویزی اور جاذبیت پیدا ہو گئی تھی کہ عام عیادت کنندگان نے بھی اس کا احساس کر لیا تھا اور ایک دوسرے سے متعجبانہ تذکرہ کرتے تھے۔ آہ! وہ آنکھیں تین بجے شب کو ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ لیکن قلب برابر ۳½ بجے تک جاری رہا۔ عوام اس واقعہ کو بنظر استعجاب دیکھتے تھے اور حقیقت شناس حضرات کہتے تھے:

"للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت ان کی"

حکامان ریاست نے تمام دفاتر سرکاری میں جنازہ و نماز جنازہ میں شرکت کے واسطے عام اجازت دی۔ اور دار العلوم خلیلیہ میں نماز اولیٰ ادا ہوئی۔ اور چوک دفاتر کے قریب ترصحرا میں نماز ثانی ادا ہوئی۔ دوسرے روز حسب فرمان خسروی ریاست میں تعطیل ماتمی ۱۹؍ اگست ۱۹۲۸ء کو دی گئی۔ حقیر فقیر پر غم کا جو پہاڑ ٹوٹا اور سر سے جو سایۂ طوبیٰ اٹھا۔ ایک طرف درد و اندوہ کا طوفان امڈ آیا۔ وہ سب سے بالاتر ہے۔ کمترین نے ایک ہفتہ بعد یعنی ٹھیک اس روز سے جب اعلیٰ حضرت سرکار عالی وقار دام ملکہم و اقبالہم نے تشریف ارزانی فرما کر رسم تعزیت ادا فرمائی! اور فرمایا کہ اب فرائض منصبی یعنی معالجہ سرکاری

(بقیہ صفحہ ۱۷) الصمصام القاضب لراس المفتری علی اللہ الکذب، امام الکلام فی تحقیق حقیقۃ الاسلام، فصل الخطاب فی العلم بما غاب، الملفوظات، حسرت العلماء بوفاۃ شمس العلماء ۱۲ شاہد شروانی۔

وعملات حضوری انجام دو۔ اور مدرسہ کا کام شروع کرو) سب کام شروع کر دیئے ہیں۔ وعلی اللہ التوکل وبہ الاعتصام۔

سرکاری معالجہ کی خدمت اگرچہ باقاعدہ مع تنخواہ چہار صد روپیہ و جاگیر موضع نکڑیہ اپریل ۲۶ء سے میرے نام منتقل ہو چکی ہے۔ میں ذمہ دارانہ حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ نیز تدریس کا سلسلہ باقاعدہ ۳۲ء سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایما سے جاری کر رکھا تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی کی وجہ سے عجیب بے فکری واستغنا رہتا تھا۔ اور فرائض مستحب کا درجہ رکھتے تھے۔ اب فرائض فرائض ہیں۔ خدا کے فضل سے دار العلوم کے کل طلبہ پورے جوش و معروفیت کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مجھے اپنا تدریسی نظام الاوقات بدل دینا پڑا۔ اپنے اکثر اسباق ماتحت مدرسین کے پاس، منتقل کرنا پڑے تا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقہ اسباق اپنے ذمہ لے سکوں چنانچہ میں نے ایسا کیا۔ نیز میں نے حضرت موصوف کے بعد مولانا عبد الرحمٰن چشتی (شاگرد رشید حضرت رحمۃ اللہ علیہ و مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی) کو اپنا اسسٹنٹ کر کے بلالیا ہے۔ اور وہ بھی معروف تدریس ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ اعظم حضرت مولانا نصیر احمد صاحب مدظلہ خصوصیت کے ساتھ درس تفسیر و حدیث میں مصروف ہیں۔ مجھے امید ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فیض علمی انشاء اللہ ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گا۔ اور آپ اس کے لئے اوقات مخصوصہ میں دعا فرمائیں گے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں ایک مسجد اور چاہ کا بھی سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ حسب مراسم قدیم کارلائقہ و خیریت مزاج سے یاد فرماتے رہیں گے۔ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا سلسلۂ اشاعت عنقریب شروع کیا جائے گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ جناب کیلئے اس کے مطالعہ کا موقعہ ہو گا۔ فقط

نیاز مند
کمترین ابو الحسنات محمد احمد الہاشمی معالج خصوصی فرمانروائے ٹونک
ناظم اعلیٰ و صدر المدرسین دار العلوم نظامیہ خلیلیہ ٹونک (راجستان)

عَلامۃ الہند مولانا معین الدّین الاجمیری

۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ ——— ۱۰ محرم ۱۳۵۹ھ

الحبر العلام والبحر القمقام، اللوذعی الفہامہ والمنطیق المتکلامہ، علامۃ الہند حضرت الاستاذ مولانا الحاج معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ہندوستان کے مشہور فاضل علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڈھ اپریل ۱۹۴۰ء میں تعزیتی مضمون سپرد قلم فرمایا تھا۔ اس ایڈیشن میں اسی پر اکتفا کی جاتی ہے:۔

۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ عین عاشورہ کے دن علم و عمل، فضل و کمال، مجاہدہ واستقامت اور تقویٰ وطہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی جو غالباً عرصہ دراز تک خالی رہے گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سے ہماری مراد حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال ہے۔ یہ حادثہ محض مولانا کے اہل خاندان یا مسلمانانِ اجمیر ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ سارا اسلامی ہند اس سے متأثر اور اپنی کم نصیبی پر نوحہ کناں ہے۔

وما کان قیس ہلکہ ہلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تہدما

مولانا ایک نومسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ والد ماجد مولانا عبد الرحمن صاحب بلیا کے رہنے والے نومسلم راجپوت تھے اور والدہ بھی داخلِ اسلام ہوئی تھیں اور دانا پور (بہار) ان کا گھر تھا۔ تعلق راجپوتانہ سے اس طرح پیدا ہوا کہ مولانا عبد الرحمن صاحب ریاست ٹونک میں سیکرٹری کونسل تھے۔ چار پانچسو

روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی۔ اسی علاقہ میں دیولی (راجپوتانہ) میں ۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ کو پیدا ہوئے اور باپ کے زیر سایہ زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہوئیں۔ بچپن ہی سے سعادت و فیروز مندی کے آثار نمایاں تھے۔ چنانچہ دولت و ثروت کی گود میں پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالب علموں میں مساوات ہی کی زندگی بسر کی۔ امیرانہ ٹھاٹھ اور رئیسانہ شان کا کبھی مظاہرہ نہ کیا۔

قسمت کی خوبی اور نصیب کی بلندی نے خاتم المحققین حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب (بہاری) ثم ٹونکی سے تلمذ کا رشتہ قائم کرایا۔ اس تعلق سے مولانا کا سلسلۂ تلمذ یہ ہے۔

حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مولانا عبد الحق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مولانا فضل امام صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت ملا عبد الواجد صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت ملا اعلم[1] صاحب سندیلی رحمۃ اللہ علیہ
استاذ الکل حضرت ملا نظام الدین صاحب سہالوی رحمۃ اللہ علیہ

جملہ معقول و منقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب ہی سے ہوئی۔ علم ریاضی حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل فرمایا۔ بائیس سال کی عمر میں

ف معاذ:-

[1] مشہور یہی ہے کہ ملا اعلم سندیلی ملا نظام الدین سہالوی کے براہ راست شاگرد تھے مگر میری تحقیق میں یہ صحیح نہیں ہے۔ ملا اعلم کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے اور وہ ملا نظام الدین کے۔ بس واقعہ یہ ہے کہ ملا اعلم سندیلی دونوں کے شاگرد ہیں۔ ملا کمال الدین ملا نظام الدین کے ابن العم اور شاگرد رشید تھے۔ استاد کے زمانے ہی میں سلسلۂ درس و تدریس کمال کو پہنچ چکا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تحریر مآثر الکرام کے وقت بقید حیات تھے۔ ۱۱۷۵ھ میں وفات ہوئی اور ملا نظام الدین نے قریبی زمانے میں یعنی ۱۱۶۱ھ میں محرم [illegible] رحلت فرمائی تھی۔ ملا اعلم کا دونوں کا شاگرد ہونا مولانا سید حکیم برکات احمد نے حسرۃ العلماء بوفات شمس العلماء میں لکھا ہے [illegible] شروانی۔

علوم میں ایسا رسوخ ہو گیا جسکی نظیر کم دیکھی گئی ہے۔ اس وقت سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ہندستان اور ہندستان سے باہر بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق درجوق آنا شروع ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ایک خاص واقعہ نے آپکی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبد الحق صاحب، صاحب تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریوں سے ایک مناظرہ ترتیب پایا تھا۔ آریوں کی طرف سے پنڈت درشنانند جی بحث کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی بڑے بڑے مناظر گفتگو کر رہے تھے، تین دن سے سلسلہ جاری تھا۔ جب مولانا کی باری آئی تو آپنے روح، مادہ، پرمیشر، کی قدامت کے سلسلے میں حدوث و قدم کی طویل بحث کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ صرف ۲ منٹ میں پنڈت جی لاجواب ہو گئے۔ اور موافق و مخالف آپ کے تبحر علمی کے قائل ہو گئے۔

اسی قسم کا ایک مکالمہ ہز ہائنس نواب حامد علی خاں مرحوم والئ رامپور کی تحریک سے مولانا عبد الوہاب صاحب منطقی بہاری مرحوم سے ایک خالص علمی مسئلہ پر ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ بصورت کتاب شائع ہو چکا ہے۔

ڈھائی سال مدرسہ نعمانیہ لاہور میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اجمیر کو شرف سکونت بخشا۔ اور ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ معین الحق قائم کیا۔ سرکار نظام جب اجمیر تشریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل کچھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متأثر ہوئے کہ خلعت شاہانہ سے سرفراز فرمایا۔ اور مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپیہ ماہانہ امداد کے لئے جاری فرما دیا۔ مولانا اسی مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے۔ اور پندرہ سال تک یہاں درس دیا۔ ۱۳۳۷ھ میں کارپردازان مدرسہ اور مولانا میں اختلاف ہوا چنانچہ انھوں نے استعفا دے کر محرم ۱۳۳۸ھ میں دار العلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم فرمایا۔ اور ۱۲ سال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرمایا۔ یہ مدرسہ اب تک قائم ہے اور

شہر کے غریب مسلمان اس کو چلا رہے ہیں۔ دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے علیحدگی کے باوجود اس کے اراکین، مدرسین، طلبہ اور دیگر متعلقین سے تعلقات خوشگوار رہے۔ ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ کے اراکین حضرت مولانا کو پھر اپنے یہاں واپس لائے۔ لیکن سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۳۹ء مطابق ۱۳۵۸ھ کو بحکم سرکار نظام دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہو گئے۔ لیکن اس علیحدگی کے بعد بھی حلقۂ درس پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہا۔

اس زمانۂ درس و تدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی جاری رہے۔ چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتد بہ ذخیرہ چھوڑا ہے۔ جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہو سکا ہے۔ مثلاً ترمذی شریف کا ایک نا تمام حاشیہ، وجود علم و معلوم، کلی طبعی اور مسئلہ دہر پر مکمل اور جامع تقریریں حضرت خواجہ غریب نواز کی محققانہ سوانح عمری[1] وغیرہ۔ یہ چیزیں انشاء اللہ جب اہل علم کے سامنے آئیں گی اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ اجمیر کے اس بوریہ نشین کی نگاہ تحقیق کتنی بلند تھی۔

آخری زمانے میں درگاہ بل کی اصلاح کے متعلق جو فتوے[2] مولانا نے مرتب فرمایا تھا۔ وہ اس قدر جامع اور موثر تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان اور حرمین کے علماء نے اس کی تائید کی۔ اور دوسری طرف ممبران اسمبلی نے اس بل کے ان تمام نقائص کو دور کیا جن کا شریعتِ اسلام سے تصادم ہوتا تھا۔

یہ تھی مولانا کی علمی زندگی۔ عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ اجمیر میں صدہا بدعات کا خاتمہ کیا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی میں باوجود چند در چند مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہیں فرمائی۔

تحریک خلافت میں مذہبی فتوے کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لیے۔ جس زمانۂ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم

---

[1] نثار خواجہ کے نام سے جولائی [illegible] میں شائع ہو چکی ہے ۱۲ شاہد شروانی [2] اسعاف کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۲ شاہد شروانی۔

جمعیۃ العلماء قید و نظر کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ اس وقت تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائلِ حاضرہ پر تقریر فرماتے۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس امروہہ کی صدارت فرمائی۔ اور مستقل نائب صدر رہے۔ صوبہ راجپوتانہ کی مجلس خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ تحریک کشمیر کے زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے ڈکٹیٹر رہے۔ مسلمانوں کے سوا برادران وطن بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔

ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیہ باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی۔ مولانا کے والد شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے۔ اور خود مولانا شاہ صاحب کے صاحبزادہ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب (والد حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم) سے بیعت تھے۔

استغنا، رجوع الی اللہ، توکل وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے۔ آخری سال تو بڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلانہ زندگی کے تھے۔ فرائض تعلیم و افتاء اور رشد و ہدایت کی ادائیگی کے بعد کبھی لوگوں میں بلا ضرورت نہ ٹھہرتے۔ ارباب دولت، اہل دنیا خصوصاً امراء و حکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ لیکن جب کوئی خدمت والا میں حاضر ہوتا تو اپنے قلب میں مولانا کے اخلاق فاضلہ کا خاص اثر لے کر واپس جاتا۔

عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سوا نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے۔ تا دمِ واپسیں اپنے اوراد و اشغال میں فرق نہ آنے دیا۔ حق گوئی میں کسی بڑی سی بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرے۔ اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دوچار ہوئے۔ لیکن اس کو بھی ہنسی خوشی برداشت کیا۔ اور ہمیشہ وہی کیا جو ایک مجاہد اور ربانی عالم کو کرنا چاہیے۔

ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضور کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرتِ فاطمہ

رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں "یا ابتاہ" (اے میرے باپ) سرکار دو عالم نے فرمایا لا کرب علی ابیک بعد الیوم آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں ہے۔ تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہو جاتے آنسو نکل آتے، چیخ نکل جاتی، بسا اوقات غشی طاری ہو جاتی۔ مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے۔ ہونہار طالب علم مولانا کا مرکز توجہ بن جاتا تھا۔ ہر سال موسم بہار میں طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ جس کو اجمیر کی اصطلاح میں "گوٹ" کہتے ہیں، منعقد ہوتا۔ اس جلسہ میں ہر ایک ملک کے طلبہ کے مروجہ کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ مولانا طلبہ کی خاطر اس تفریحی اجتماع میں بھی شرکت فرماتے۔ بیت بازی ہوتی۔ اس میں ایک فریق کی طرف مولانا بھی ہوتے۔ آپ ہی کا فریق اکثر غالب رہتا۔ اس لئے کہ مولانا کو اردو فارسی کے ہزارہا اشعار یاد تھے۔

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جائے گا کہ ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے۔ لیکن تیس روپیہ ماہوار کے سوا باقی پوری رقم طلبہ، سامان تعلیم اور نادر کتب کی فراہمی پر صرف کر دیتے تھے۔ کتاب کتنی ہی قیمتی ہو لیکن امکان بھر اس کو ضرور خریدتے اور خواہ دوگنی، سہ گنی قیمت ادا کرنی پڑتی مگر بہتر نسخہ خریدتے۔ قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت کے مہیا فرماتے۔ کلکتہ کے بہترین کارخانہ میں بھیج کر اعلیٰ قسم کی جلدیں بندھواتے تھے۔

۵ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ کو ایسے بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤں سے معذور رہے۔ دل و دماغ البتہ صحیح رہے۔ اور اس حالت میں بھی سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا۔ وفات سے دس یوم پیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے۔ زندگی ہی میں عرصہ دراز سے گورغریباں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ احباب کے اصرار سے وہیں ایک مختصر مکان بن گیا تھا جس کی تکمیل

دار العلوم کی اس رقم سے ہوئی جو کمیٹی نے بطور اعتراف خدمات مولانا کو پیش کی تھی۔ اسی مکان میں مولانا کا انتقال ہوا۔ ہزارہا مسلمانوں نے جنازہ میں شرکت کی۔ جنازہ کی چار پائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھی گئی تھیں۔ بیک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیتے تھے۔ پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی۔ خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ تدفین ہوئی قبر میں اتارتے وقت در و دیوار اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم تھا۔

پسماندگان میں دو بچے (مولوی عبد الباقی صاحب اور ایک صاحبزادی) اور ایک بیوہ ہیں۔

اجمیر کے قیام کی مدت ۴۳ سال اور کل مدت حیات ۶۰ سال ہے۔ یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک عاشورہ محرم میں جب لوگ واقعۂ کربلا سے سوگوار تھے اس شہید علم و عمل نے دنیا سے کوچ کیا۔ اور اجمیر میں اہل دل نے دوہرے محرم کا سوگ کیا۔“

راقم السطور محمد عبد الشاہد خاں شروانی

عجب درد است جانم را ندانم کہ چوں گریم
دلا! خوں شو کہ تا بر حال خود یک لحظہ خوں گریم

جنوری ۱۹۱۵ء میں یہ ننگِ خلائق، ناواقف حقائق و دقائق، اپنی ننہیال ریاست بھیکن پور ضلع علی گڈھ یو۔ پی میں پیدا ہوا۔ آبا و اجداد کا مسکن موضع بھاموں ضلع ایٹہ۔ بھیکن پور سے ۶ میل پر واقع ہے۔ بھاموں اضلاع علی گڈھ اور ایٹہ کی سرحد پر آباد ہے۔ اس کے جانب غرب ایک میل پر موضع بلونہ علی گڈھ کی حد میں اور جانب شرق اسی قدر فاصلہ پر موضع ڈھولنہ ایٹہ کی حد میں ہے۔ جانب جنوب موضع کناوہ اور جانب شمال موضع کنوبی ہے۔ کناوہ ایٹہ اور کنوبی علی گڈھ میں محسوب ہے۔

والد[عہ] مرحوم اردو، فارسی اور حساب وسیاق میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ میاں جی سید حبیب اللہ حسین پوری مرحوم کے شاگرد تھے۔ میاں جی صاحب کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ابھی دو سال ہوئے ہوا ہے۔ راقم السطور کو بھی شرف نیاز حاصل تھا۔ فارسی درسیات کی کتابیں انھیں ازبر تھیں۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ساری عمر اسی شروانی خاندان کی تعلیم و تدریس میں گذاری۔ بڑے وضعدار بزرگ تھے۔ آخر عمر تک عیدین کی نماز پڑھانے بھاموں آتے رہے۔

والد مرحوم کو تعلیم سے خاصہ لگاؤ تھا۔ فارسی کی کتابیں اور احادیث کے اردو ترجمے ان کے پاس تھے۔ برادر گرامی منشی عبدالماجد خاں مرحوم کی رسم بسم اللہ بھیکن پور میں ہوئی۔ حافظ سید مہدی حسن نگینوی نے کرائی۔ جب میں اس عمر کو پہنچا تو آبائی وطن بھاموں میں میاں جی محفوظ علی بلرامی کو مکان پر رکھا۔ میری بسم اللہ موصوف ہی نے کرائی۔ موصوف شاعر بھی تھے فارسی واردو دونوں میں کافی دسترس تھی۔ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اکثر جمعرات کو ۶ میل پیدل چل کر قلعہ ظفر منزل نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں مرحوم کے دربار میں کہا ہوا کلام جا کر سناتے۔ علاوہ داد و تحسین کے نذرانہ بھی پاتے۔ مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے "خالق باری" مجھے پوری حفظ کرادی تھی۔ قرآن مجید بھی حفظ کرانا شروع کر دیا تھا۔ سورۂ بقر ہی حفظ کر پایا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ سال بھر میں چار بار موتی جھرہ نکلا بعض مرتبہ سرسامی کیفیت بھی طاری ہو گئی۔ ایک سال بعد جب بیماریوں سے نجات ملی تو سورۂ بقر بھول چکا تھا۔ پھر اس سعادت سے محروم رہا۔ میاں جی صاحب بیت بازی بھی کراتے رہتے تھے! اس لئے سینکڑوں اشعار یاد کرا دیئے تھے۔

ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ گاؤں کے دوسرے غریب بچے بھی پڑھتے تھے۔ بعض لڑکے ازراہِ شرارت اپنی ٹوپی میں کانٹے لگا لاتے تھے۔ میاں جی صاحب کے چپت مارنے پر وہ کانٹے موصوف کی انگلیوں میں پیوست ہو جاتے۔ پھر ان کی ڈنڈوں سے کافی مرمت کی جاتی۔ کچھ عرصہ بعد میاں جی صاحب اپنی پیرانہ سالی کی وجہ اپنے وطن چلے گئے۔

[عہ] محمد عبدالواجد خاں ۱۲

ہم نے کچھ دن ظہور اللہ خاں صاحب کی چوپال کے مکتب میں منشی محمد ادریس خاں سے بھی پڑھا۔ پھر ہم قصبہ سہاور ضلع ایٹہ اپنی خالہ صاحبہ کے یہاں گئے۔ تو والد مرحوم نے مولوی عبدالرزاق عرف کالے مولوی صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا۔ دو تین ماہ وہاں پڑھتے رہے۔ بھاموں آنے پر چونکہ فوراً کوئی انتظام تعلیم نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے موصوف نے خود پڑھانا شروع کر دیا۔ غرض یہ ہے کہ رسم بسم اللہ کے بعد سے زندگی کے آخر لمحات تک دیہات میں تعلیمی دشواریوں کے باوجود والد مرحوم نے ایسا کوئی دور ہم پر نہ گزرنے دیا جسمیں تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہا ہو۔ ہم کہیں رشتہ داری میں جاتے تو وہاں بھی اس سے پیچھا نہ چھوٹتا۔ ابتدا میں ایک بار میاں جی صاحب کے پاس سے پیشاب کے بہانے سے میں گھر آکر روپوش ہو گیا۔ والد مرحوم کو پتہ چلا تو ایسی مرمت کی آج تک اس کی لذت یاد ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پھر کبھی روگردانی کی ہمت نہ ہوئی۔

بھاموں کو دو سال کے لئے ہمیں چھوڑنا پڑا۔ والد مرحوم موضع بہرا ضلع علی گڈھ میں نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں کی جانب سے عامل وکارندہ بنا کر بھیج دیئے گئے تھے۔

اس موضع کے ساتھ اس نواح کا پورا علاقہ جس میں دس بارہ دیہات شامل تھے۔ موصوف کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس موضع میں موصوف پہلے زمین دار کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہمارے نانا محمد محمود خاں شروانی بھیکن پوری کے ترکہ سے سسرال سے موصوف کو یہ حصہ ملا تھا۔ چونکہ موصوف کے تعلقات واثرات اہل علاقہ سے دیرینہ تھے۔ اس لئے بڑی شان سے کام چلایا۔ دو سال قیام رہا۔ اس درمیان میں خاص بہرا میں اپنی کوششوں سے پرائمری اسکول جاری کرایا۔ ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم کی خاطر پہلے مولوی عبد الصمد خاں پروروی اور پھر حافظ عبد السلام خاں کنادی کو بلا کر رکھا۔ یہ دونوں بزرگ موصوف کے عزیز بھی تھے۔ اس لئے ہم دونوں بھائیوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔

والد مرحوم کا خیال تھا کہ مجھے انگریزی تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی میں داخل کرائیں۔ اور برادر گرامی کو طبیہ کالج دہلی بھیجیں۔ اسی لئے ان کو عربی کی کتابیں شروع کرا دی گئی تھیں۔ اس معاملہ میں نواب بہادر سے مشورہ بھی ہو چکا تھا۔ انھوں نے دونوں کے داخل کرانے کا

وعدہ کر لیا تھا۔ یہی منصوبے تھے کہ اچانک والد مرحوم بیمار ہوئے۔ اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ صاحبِ فراش ہو گئے۔

اسی درمیان میں نواب محمد ابوبکر خاں رئیسِ اعظم دادوں ضلع علی گڈھ نے اپنی جائداد میں سے ساڑھے تیرہ ہزار کے منافع کی جائداد ۱۹۲۳ء میں وقف کی تھی۔ اس میں اعراس، مساجد، مسافر، اور فاتحۂ بزرگانِ دین کے ساتھ ساتھ ساڑھے تین ہزار مدرسہ عربیہ کے لئے وقف کئے۔ اور اس میں یہ شرط بھی رکھی کہ آفاتِ ارضی وسماوی سے اس رقم وقف میں کمی آنے پر پہلے مدرسہ کی رقم کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اس رقم سے کچھ بچے گا تو حصہ رسدی تقسیم ہوگا۔ چنانچہ ۲۴؍ نومبر ۱۹۲۴ء کو مدرسہ عربیہ کا افتتاح دادوں میں کر دیا گیا۔ مولانا وجیہ الدین احمد خاں رامپوری اور مولوی امین الدین چھپروی مرحوم نے درس وتدریس کی ابتدا کی۔ مولوی محمد شریف خاں، مولوی نور محمد، مولوی سید مسعود علی، مولوی نظام الدین نوشوی، مولوی رونق علی سہارنپوری، مولوی شمعون خاں اترولوی، حافظ عبدالرؤف علی گڈھی، مولوی محمد مسلم چھپروی، مولوی محمد ابوظفر خاں چھپروی وغیرہم "السابقون الاولون" کا درجہ رکھتے ہیں۔ طلبہ میں سب سے پہلے یہی لوگ داخل مدرسہ ہوئے تھے۔

انھیں ایام میں والد مرحوم کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہمارے چھوٹے ماموں منشی محمد عبدالمجید خاں شروانی بھیکن پوری اس وقت موضع کنوبی میں مولوی محمد جان خاں شروانی رئیس دادوں کی طرف سے کارندے تھے۔ بھاموں کنوبی سے ایک میل پر واقع تھا۔ اس لئے اکثر آمد ورفت رہتی۔ اور ہر طرح ہم سب کی دلدہی کرتے رہتے۔ موصوف نے برادرِ گرامی کو تو ریاضی وحساب سکھانا شروع کیا۔ اور مجھے دادوں لے جا کر مدرسہ عربیہ میں داخل کر دیا ۱۹۲۵ء میں جب کہ میری عمر دس گیارہ سال تھی۔ میں نے عربی شروع کی۔ چونکہ مدرسہ کئی ماہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اور طلبہ سال اول کا کافی نصاب ختم کر چکے تھے۔ اس لئے یہ صورت رہی کہ دن میں اسباق میں شریک رہتا اور بعد مغرب مجھے اور مولوی حبیب الرحمٰن کنوبی کو جو میرے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔ مولانا وجیہ الدین احمد خاں دروس الادب اور میزان الصرف پڑھاتے۔

نواب صاحب کو مدرسہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ بڑے فیاض، سیر چشم اور عالی حوصلہ انسان تھے۔

علماء کی بڑی عزت کرتے ۔ اور طلبہ کو گھر سے زیادہ آرام پہنچاتے ۔ رسہ کشی ، بیت بازی اور فٹ بال ، میچ وغیرہ کراتے رہتے اور جیتنے والوں کو انعامات واکرامات سے نوازتے طلبہ کی ساری ضروریات زندگی کا مدرسہ کفیل تھا ۔ نواب صاحب کی داد و دہش مزید براں تھی ۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے طلبہ پہنچنا شروع ہو گئے ۔ اساتذہ کے تبحر اور محنت و شفقت نے مدرسہ کو اور چار چاند لگا دئے ۔ دیکھتے دیکھتے دار الجہل خطہ ، دار العلوم بن گیا ۔ ایک بی بی صاحبہ نے چار پانچ ہزار سالانہ آمدنی کا وقف کر دیا پھر بھی اخراجات وسیع ہوتے گئے ۔ تو نواب صاحب کی ذات کفیل بن گئی ۔ نواب صاحب کا ۱۴؍ رمضان ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو مسلسل علالت کے بعد انتقال ہو گیا ۔ تو از روئے وقف نامہ مرحوم کے برادر خورد نواب حاجی محمد غلام محمد خاں حافظی رئیس اعظم موہن پور و دادوں مدرسہ اور وقف کے متولی ہوئے موصوف نے برادر گرامی کے نقش قدم پر چل کر مدرسہ کی شان و عظمت کو ذرا بٹہ نہ لگنے دیا ۔ موصوف نے ۱۴؍ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء کو اپنے پیر و مرشد حافظ محمد اسلم خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر جان ، جان آفریں کے سپرد کی ۔ اور وہیں پائیں میں دفن ہوئے ۔ مرحوم کے بعد واقف کے عم زاد بھائی مولوی محمد جان خاں تین سال سے متولی ہیں ۔ آپ کے دورِ تولیت میں نصف درجن طلبہ سے زیادہ کبھی تعداد نہ ہو سکی اور نہ آئندہ کوئی توقع نظر آتی ہے ۔

مدرسہ میں حافظ قاری مولوی غلام محی الدین خاں پیلی بھیتی اور مولوی حفیظ الدین کرمانی خیر آبادی مرحوم کا تقرر بھی ہو چکا تھا ۔ اول الذکر سے مشق قرأت سال ڈیڑھ سال کی ۔ ان دونوں استادوں نے بھی درسی کتابیں پڑھائیں ۔ ماسٹر سید مظہر علیم صاحب فرید آبادی مرحوم پرائیویٹ سکریٹری نواب صاحب مرحوم سے انگریزی بھی شروع کر دی تھی ۔ عربی ترجمہ ، اور خوشخطی کی مشق مولوی حاجی محمد سلامت اللہ لکھنوی خلف استاذ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو شرف منزل پر (جو دادوں سے نصف میل پر واقع ہے) اقامت گزیں تھے وہاں شام کو جا کر کرنا پڑتی ۔

اسی درمیان میں ایک مرتبہ قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین مولانا الحاج محمد ہادی علی

خاں بیستاپوری رحمۃ اللہ علیہ محرم کے ایام میں نواب صاحب کی استدعا و اصرار پر دادوں تشریف لائے۔ واقعات کربلا پر کئی تقریریں ہوئیں۔ کچھ اس انداز سے واقعات کی تصویر کشی فرماتے کہ سننے والے بے قابو ہو کر چیخیں مارنے لگتے۔ بیان میں وہ اثر تھا کہ بچے بوڑھے سبھی روتے روتے بے حال ہو جاتے۔ جب تک مولانا کا قیام رہا مواعظ و تقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔ میں بھی اپنی نو عمری و کم علمی کے باوجود بڑا متاثر تھا۔ سینکڑوں آدمی مولانا سے بیعت ہوئے تقریباً سارا مدرسہ ہی بیعت ہو گیا۔ انھیں میں سے میں بھی تھا۔

مولانا کی عمر نوے سال سے متجاوز تھی۔ کرسی پر دوسرے اٹھا کر مجلس میں لاتے۔ دو چار قدم سے زیادہ نہ چل سکتے تھے۔ اور وہ بھی دوسروں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر۔ حضرت شاہ حافظ محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور نواب صاحب مرحوم کے پیر بھائی تھے۔ اسی نسبت سے کبھی دادوں آجاتے تھے۔ نواب صاحب کے والد ماجد نواب احمد سعید خاں مرحوم اور تقریباً پورا خاندان حافظ صاحب ہی سے بیعت تھا۔ مولانا نے اس پیرانہ سالی کے باوجود ہمیشہ تراویح مسجد پہنچ کر پڑھیں اور رمضان میں پورا قرآن پاک تراویح میں سُنا۔ پابند شریعت اور متبع سنت تھے۔ وہ مجلس وغیرہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۱۸ ربیع الاول ۱۳۴۸ھ بروز شنبہ سرائے معالی خاں لکھنؤ میں آثار شریف میں وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ کچھ مذہبی تقریبات کے لئے آثار شریف کے لئے وقف بھی فرما گئے ہیں۔ ہر سال ربیع الاول میں موئے مبارک سرکار رسالت صلے اللہ علیہ وسلم کی اس جگہ زیارت ہوتی ہے۔ بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ مجھے یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ دفن میں شریک ہوا۔ اور آخری بار زیارت سے بعد وفات مشرف ہوا۔ میں اس وقت خیرآباد میں پڑھتا تھا۔ خیرآباد لکھنؤ سے پچاس میل ہے۔ اطلاع آنے پر کافی لوگ وہاں سے گئے۔ انھیں میں میں بھی تھا۔

میں شرح تہذیب، تاریخ الخلفاء، قدوری وغیرہا پڑھ رہا تھا۔ کہ مدرسہ میں نیا انقلاب آیا۔ مولانا وجیہ الدین احمد خاں رامپور تشریف لے گئے۔ اور مولانا شاہ عماد الدین سنبھلی نے مسند صدارت فتح پوری مسجد دہلی سے آکر سنبھالی۔ وہ تعلیمی سال ختم

کر کے دوسرے سال ذی قعدہ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں نواب صاحب سے باضابطہ اجازت حاصل کر کے میں خیرآباد چلا گیا۔ یہاں مدرسہ عربیہ نیازیہ میں مولانا حاجی محمد بشیر خاں رامپوری سے ۲؍ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء کو جلالین قطبی اور ہدیہ سعیدیہ شروع کیں۔ دیوان حماسہ ادیبِ مدرسہ مولانا حافظ عزیز الرحمٰن ندوی سے شروع کیا۔ میں تقریباً سات سال تک خیرآباد رہا۔ ان دونوں اساتذہ نے پوری دلچسپی اور شفقت و توجہ میرے حال پر مبذول رکھی۔

مدرسہ میں ۲۹؍ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء بروز سہ شنبہ ایک طلبہ کی انجمن بھی قائم کی جس کا نام انجمن اشاعت الدین رکھا۔ ہر ہفتے خاص خاص موضوع پر تقریریں ہوتیں۔ خیرآباد کے اکابر اور ارکان مدرسہ کو بھی دعوت دے کر شریک کرتے۔ متولی مدرسہ اس کے نگراں، مولوی منظور المحمود خاں رامپوری مدرس مدرسہ صدر، اور میں ناظم بنایا گیا تھا۔ انجمن کے لئے دار المطالعہ علیٰحدہ قائم کیا جس میں کتابوں کے علاوہ، رسائل و اخبارات بھی جاری کرائے۔ اکابر اسلام کی تاریخ وفات پر مختلف مقررین ان کے حالات بیان کرتے۔ سالانہ محفلِ سیرت و میلاد بھی منعقد ہوتی۔ جس میں باہر سے کسی اچھے مقرر عالم کو مدعو کیا جاتا۔

۱۹۳۴ء میں زلزلۂ بہار کے موقع پر ہماری انجمن نے بڑا کام کیا۔ خیرآباد سے کافی رقم جمع کر کے نائب امیر شریعت بہار مولانا محمد سجادؒ اور دوسرے ذمہ دار حضرات کو بھیجی۔ اخبار النجم، حقیقت وغیرہما میں میرے مضامین بحیثیت ناظم انجمن شائع ہوتے رہے۔ خیرآباد میں رہ کر شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہو گئی تھی۔ مشاعروں میں طرحی غزل بھی پڑھتا۔ رسائل میخانہ، انتخاب اور الناظر میں غزلیں اور شاعری سے متعلق مضامین بھی شائع کراتا رہتا۔ سرگذشت علی گڈھ میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا۔ مرزا ابراہیم بیگ مرحوم بڑی محبت و شفقت فرماتے تھے۔ علی گڈھ آنے پر موصوف ہی کے یہاں قیام رہتا۔ ۱۹۳۴ء میں نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں شروانی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میرٹھ میں جو خطبۂ صدارت پڑھا اس کا عربی ترجمہ کر کے ۱۰؍ دسمبر ۱۹۳۴ء کو مرحوم کی خدمت

میں پیش کیا۔ موصوف ہمیشہ کی طرح بڑی شفقت سے پیش آئے۔ اور ۱۲ دسمبر ۱۹۳۴ء کو نواب حاجی غلام محمد خاں حافظی مرحوم کو ایک خط لکھا جس میں میرے متعلق یہ سطور بھی تھیں۔ یہ خط میرے پاس محفوظ ہے:-

> عزیز عبدالشاہد خاں نے میرے خطبۂ کانفرنس کا عربی ترجمہ دکھایا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس ترجمہ کو پڑھ کر حیران ہو گیا۔ اور میرے دل نے ہزارہا تحسین و آفرین کہیں۔ آپ کے اس خیرِ جاری کو آپ کی مدد اور توجہ سے ایک غریب دیہاتی عزیز اس قدر قابلیت اور لیاقت سے مستفیض ہوا ہے۔ آپ کے حق میں اور نیز اس کے حق میں صدق دل سے دعا کرتا ہوں۔ میں ان کے مضامین اور اشعار متعدد اخبار میں پڑھتا رہا ہوں۔ لیکن اس عالمانہ قابلیت کا مجھ کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء وحفظکم من کل البلاء والابتلاء آمین ثم آمین۔

علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری کا تذکرۂ علم و فضل مولوی حکیم ظفر الحق اور مولوی حکیم حافظ احمد علی خیرآبادی سے اکثر سن چکا تھا۔ خود رجب ۱۳۵۴ھ میں اپنی آنکھوں سے اس سے بڑھ کر مشاہدہ کیا۔ مولانا کے دربار میں شعبان ۱۳۵۴ھ میں مستقل طور پر پہنچ گیا۔ **طبع اوّل** میں اپنے قیام اور تعلیمی نظام کے متعلق مختصراً سب کچھ لکھ چکا ہوں۔ استاد کے کرم کا حال اس پہلے خط سے معلوم ہو سکتا ہے۔ جو موصوف نے میرے خدمت میں پہنچنے سے قبل میرے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ اس نامۂ گرامی سے وقارِ علم و ادب، ہمت اور استقلال کے پہلو بھی معلوم ہو سکیں گے:-

> عزیزم صانکم اللہ تعالیٰ عن النوائب۔ وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
>
> رقیمۂ وداد موصول ہوا۔ آں عزیز کی روانگی کے بعد جناب مولوی حکیم احمد علی صاحب کا سفارشی خط موصول ہو گیا تھا۔ اس کا جواب بھی دے دیا گیا کہ تعمیل ارشاد ہو گی۔ آپ کے جانے کے بعد پھوڑے کی تکلیف میں فقیر مبتلا ہو گیا۔ اب تک اس کے شدید درد میں مبتلا ہوں۔ پھوڑا گُدّی پر نمودار ہوا ہے۔ عمل جراحی بھی

اس پر ہو گیا ہے۔ آپ میری جانب سے بالکل مطمئن رہیں۔ میں جیسا آپ کی حضوری میں تھا ویسا ہی اب ہوں۔ آپ صرف اپنے شوق و اخلاص پر نظر رکھیں جس قدر شوق علم اور میرے ساتھ اخلاص آپ کو ہو گا اسی قدر میری توجہ آپ کے حال پر ہو گی۔ غالب کیا خوب کہتے ہیں ؎

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا میرے آگے

اس فلسفہ پر آپ نظر کریں گے تو ہمیشہ مطمئن رہیں گے۔ حق تعالیٰ آپ کو فائز المرام کرے اور سلسلۂ خیر آباد کو آپ کے دم سے زندہ رکھے۔ ہم تو اب قبر میں پیر لٹکا چکے ہیں۔ آپ ہی جیسے ارباب شوق نوجوانوں سے بقائے سلسلہ کی توقعات قائم کئے ہوئے ہیں۔ والسلام فقط

فقیر معین الدین کان اللہ لہ۔ دار الخیر اجمیر۔

(۱۲ر رجب ۱۳۵۴ھ)

سیاسی زندگی کا آغاز اجمیر ہی سے ہوتا ہے مجلس احرار اجمیر عرصے سے ختم ہو چکی تھی۔ ۱۰ر فروری ۱۹۳۸ء مطابق ۸ر ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ کو اس کا دوبارہ افتتاح ہوا مجھے بھی اس کا رکن بنایا گیا۔ اس سے قبل میں انڈین نیشنل کانگریس کا باضابطہ ممبر بن چکا تھا۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۳۸ء مطابق ۱۸ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ سے مستقلاً کھدر پہننا شروع کر دیا۔ دونوں جماعتوں کا رکن و ممبر بن جانے کے بعد سیاست میں عملی طور پر بھی حصہ لینا پڑا۔ اکثر تقریریں بھی سیاسی جلسوں میں کرنا پڑتیں۔ اس وقت فلسطین پر بڑا جبر و تشدد جاری تھا۔ جو واقعات ہندستان تک پہنچتے تھے انھیں پڑھ پڑھ کر خون کھولتا تھا۔ یوم فلسطین کے سلسلے میں طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا اور پوری باغیانہ تقریر جامع شاہجہانی میں کر ڈالی۔ اس سے قبل تین تقریریں اسی قسم کی خطرناک اور کر چکا تھا۔

بالآخر ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں کئی ہزار کی ضمانت اور مچلکوں پر رہائی ہوئی۔ مقدمہ چلنا شروع ہوا۔ مسٹر اختر حسین اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں ۶ ماہ تک پیہم

پیشیاں ہوتی رہیں کبھی کئی کئی گھنٹے کٹہرے میں کھڑا رہنا پڑتا۔ تضیع اوقات کے سوا کچھ حاصل نہ تھا۔ یہ وقت میرے لئے بڑے امتحان کا تھا حضرت استاذ پاؤں سے معذور اور صاحب فراش تھے۔ حصول علم اور خدمت شیخ اولین مقاصد زندگی تھے ادھر سرپرستوں اور بزرگوں کا تقاضا تھا کہ یہ لکھ کر گورنمنٹ راجپوتانہ میں داخل کر دیا جائے۔ کہ "دوران تعلیم و قیام اجمیر میں سیاست میں حصہ نہ لوں گا" اس بے غیرتی پر آمادہ نہ ہونے پر تمام سرپرستوں سے ہاتھ کھینچ لیا گیا۔ اور بے تعلقی کا اظہار کر دیا گیا۔ یہ بھی صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیا۔ اب وہ وقت آیا کہ عدالت کے کٹہرے میں جن فقروں پر مقدمہ چلا تھا ان کے متعلق مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے تمام باتوں کا اقرار کیا۔ اخبار انجام دہلی، احرار سہارنپور اور معین اجمیر اس کے شاہد ہیں۔ آل انڈیا مجلس احرار اور جمعیۃ العلماء ہند کے ناظمان نے لکھا کہ اس وقت جیل جانا مقصد میں شامل نہیں۔ بلا وجہ بند ہونے سے فائدہ نہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر فیصلہ خلاف ہو تو اپیل کی جائے۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چھ ماہ کی زبان بندی کا مجسٹریٹ نے حکم سنایا۔ اور یہ چھ ماہ اس وقت ختم ہوئے۔ جب حضرت الاستاذ دنیا سے عالم آخرت کو روانہ ہو چکے تھے۔

قدرت کا نظام تو دیکھئے کہ زبان استاذ کے جلسۂ تعزیت میں کھلی جو کانگریس کمیٹی کی طرف سے ٹاؤن ہال میں ۲۰ فروری ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ میں ۱۹۳۹ء میں شہر کانگریس کمیٹی اجمیر اور ۱۹۴۰ء میں صوبہ کانگریس کمیٹی راجپوتانہ کا ممبر منتخب کیا گیا مجلس احرار کا ذمہ دار عہدیدار بھی بنا دیا گیا جمعیۃ العلماء ہند کا رکن مرکزی بھی رہا۔ اجمیر سے واپسی پر ایک سال تک احباب نے صدر مجلس احرار علی گڑھ بنا دیا۔ صوبائی اور مرکزی کی رکنیت بھی سر ڈال دی۔ نام و نمود سے نفرت اور علمی و تعلیمی مشغولیت نے سیاسی انہماک سے باز رکھا ورنہ اب تک خدا جانے سیاست کی کس منزل پر پہنچ چکا ہوتا۔

مولانا کی وفات کے ایک ماہ بعد میں اجمیر سے خیرآباد پہنچا۔ اور وہاں ایک ہفتہ رہ کر دادوں پہنچا۔ اور مدرسہ عربیہ حافظیہ سعیدیہ ریاست دادوں ضلع علی گڑھ میں ۲۲ صفر ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء سے فرائض درس و تدریس انجام دینے لگا۔ سب سے پہلے سابقہ

ہدایہ جلد ثالث، مسلم الثبوت اور تفسیر بیضاوی سے پڑا۔ ان کے علاوہ دوسری کتابیں بھی زیر درس رہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تین سال تک اپنی بساط کے موافق دیانت داری سے یہ فرض انجام دیا اور اس درمیان میں متولی مدرسہ ارکان کمیٹی اور طلبہ کو کسی تعلیمی و انتظامی شکایت کا موقع نہ ملا۔

متولی مدرسہ نواب حاجی محمد غلام محمد خاں حافظی کا ربیع الاول سنہ ۱۳۶۲ھ میں انتقال ہوتا ہے۔ اور قانون وقف نامہ کے مطابق واقف کے عم زاد بھائی مولوی محمد جان خاں رئیس دادوں متولی ہوتے ہیں۔ موصوف مدرسہ کا یہ سال کسی نہ کسی طرح پورا کرتے ہیں۔ تعطیل کلاں کے بعد جب مدرسہ کھلتا ہے تو مولانا محمد امجد علی اعظمی مولوی محمد شریف خاں دادونی، اور راقم السطور کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مدرسہ تنخواہوں کا اس قدر بار برداشت نہیں کر سکتا ہے اس لئے آپ کی خدمات سے محرومی پر افسوس ہے۔ مولانا محمد امجد علی اعظمی سات سال سے صدر مدرس تھے۔ بریلی جیسے اور دوسرے مدرسوں کے صدر مدرس رہ چکے تھے۔ کہنہ مشقی کی بنا پر درسیات میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔

مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری مرحوم تلمیذ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ہم درس اور استاد برادر ہیں۔ مولوی محمد شریف خاں مدرسہ دادوں ہی کے فارغ التحصیل اور اس کے سب سے پہلے طالب علم ہیں۔ فراغت کے بعد اسی مدرسہ میں مدرس ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے استحقاق اور قدیم علاقہ کا بھی خیال نہ کیا گیا۔ ہمارے بعد مولوی غلام امام یونس بدایونی کو صدر مدرس بنایا گیا۔ وہ بھی دو برس میں تنگ آکر شعبان ۱۳۶۵ھ

اب مدرسہ جس منزل سے گزر رہا ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ خدا، مولوی سید مسعود علی کو ثبات و استقلال بخشے۔ کہیں وہ بھی بددل ہو کر کنارہ کشی اختیار نہ کریں۔ موصوف بھی اس مدرسہ کے "السابقون الاولون" میں سے ہیں۔ رامپور اور ڈابھیل سے سند فراغت حاصل کر کے کئی سال مدرسہ قادریہ بدایوں میں مدرس رہنے کے بعد جناب مولوی امین الدین چھروی کی رحلت پر دادوں پہنچ کر مدرس ہوئے اور دو سال سے علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ چار میل پر آبائی وطن ہے اور دو میل پر والد ماجد ملازم ہیں۔ اس لئے موصوف قرب کی بنا پر دادوں اقامت گزیں ہیں۔

دادوں سے سبکدوشی کے بعد شوال ۱۳۶۳ھ میں نواب صدر یار جنگ بہادر نے اپنے کتب خانہ حبیب گنج میں بلا کر بعض اہم خدمات سپرد کیں۔ ابھی پورا سال بھی ختم نہ ہو پایا تھا کہ یہ اچانک ایک حادثے سے دوچار ہو گیا۔

اجمیر سے واپسی اور مدرسہ دادوں میں تقرر کے بعد میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ایسی جگہ سکونت اختیار کی جائے جہاں سے علمی سہولتیں حاصل رہیں۔ آبائی وطن بھاموں سڑک سے دور خام راستہ پر واقع تھا۔ بھموری خاندانِ شروانی کا مرکز اور قدیم مسکن تھا۔ یہ دو تین ہزار کی آبادی کا بڑا گاؤں سڑک کے بالکل کنارے واقع ہے۔ دو فرلانگ پر ندی بہتی ہے۔ ۴ فرلانگ پر حبیب گنج (بھیکن پور) اور دو میل پر جانب جنوب دادوں اور اتنے ہی فاصلہ پر جانب شمال قصبہ چھرہ ہے جہاں اناج کی بڑی منڈی، تار گھر اور لاری اور یکہ کا اڈا ہے۔ تمام ضروریاتِ زندگی وہاں سے پوری ہوتی ہیں۔ مویشیوں کا ہسپتال اور طبیبوں اور ڈاکٹروں کی پرائیویٹ دکانیں بھی ہیں۔ قصبہ دادوں میں مدرسہ عربیہ، تھانہ اور شفاخانہ ہے۔ مدرسہ عربیہ دادوں اور کتب خانہ حبیب گنج کے قرب سے بھموری میں مستقل سکونت اختیار کرنا طے کیا۔ اور نواب صدر یار جنگ بہادر سے معقول معاوضہ دے کر جامع مسجد سے متصل ایک بلند اور ہموار جگہ عمارت کے لئے حاصل کی۔ اور اس پر خام اور پختہ عمارت اپنی سہولت و ضرورت کے مطابق ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں تیار کر کے پیر و مرشد کے نام پر "ہادی منزل" نام رکھا۔ "شاہدِ رحمت مقصود ہے ہادی منزل" تاریخی مصرعہ ہے جس کا پتھر بیرونی برآمدہ کے وسطِ در پر نصب ہے۔ اس جگہ کے دوسرے لوگ بھی خواہشمند تھے۔ اور مدتوں سے اس کے حصول کی کوشش کر رہے تھے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے ان سب پر راقم السطور کو ترجیح دی تھی۔

میں رجب ۱۳۶۴ھ مطابق جون ۱۹۴۵ء میں ایک ہفتہ کے لئے اجمیر عرس میں چلا گیا۔ میرے متعلقین اپنی رشتہ داری میں بہادر و بھیکن پور چلے گئے۔ مکان مقفل اور دروازے پر آدمی سو رہا تھا کہ ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کی شب کو ایک منظم سازش کے ماتحت مکان میں مٹی کا تیل اور پٹرول چھڑک چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ سامان، چھتیں، در و دیوار سبھی کچھ جل کر بھسم ہو گیا۔

خدا شاہد ہے کہ اس حادثہ نے میرے دل کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔ اور میں اس بے سر و سامانی میں بالکل اسی طرح مطمئن رہا اور ہوں۔ جیسے سامان راحت کی موجودگی میں رہتا تھا اور حسب ارشاد خداوندی واما بنعمۃ ربک فحدث کہہ سکتا ہوں کہ حضرت جلیل مانکپوری کے اس شعر کا مصداق ثابت ہوا ؎

توکل کا یہ منشا ہے کہ اطمینان پیدا کر
نہ ہو سامان کا پابند یہ سامان پیدا کر

آزمائشوں کا مقصد انسان کا ثبات و استقلال دیکھنا ہوتا ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں اس امتحان میں کامیاب ہوا۔ اور امید ہے کہ زندگی کے ایسے بے شمار حوادث کا جو قومی زندگی کے لوازم سے ہیں، مقابلہ کرتا رہوں گا۔

سیاسی طور پر میرا مسلک بالکل صاف ہے! استخلاص وطن و قوم کے لئے تمام ہندستان سے اشتراک و اتحاد اور غیر ملکی حکومت کی بیخ کنی و استیصال، ہر آزادی خواہ جماعت سے تعاون اور ہر رجعت پسند گروہ سے بیزاری و تنفر، ہر شیر بیشۂ حریت کے ساتھ صف آرائی اور ہر شیر قالین سے گریز پائی، انگریز اور ہندوستانی کے سوال پر پورا...... ہندوستانی۔ اسلام و کفر کے سوال پر پکا مسلم، شیعہ سنی کے سوال پر پختہ سنی۔ یہی میرا مسلک ہے۔ اور یہی سیاست۔ یہی میرے خیرآبادی اساتذہ کا طریقہ تھا۔ اور یہی میرا وطیرہ۔

مکان کی تعمیر کے بعد ہی میرا نکاح ۲۸ر ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۵ر مئی ۱۹۴۲ء بروز جمعہ منجھلے ماموں حافظ حاجی محمد عمران خاں شروانی بھیکن پوری کی بڑی صاحبزادی سے ہو چکا تھا۔ منشی عبدالمجید خاں شروانی بھیکن پوری اور منشی لطف الرحمٰن خاں ڈھولنوی شاہد تھے چار ہزار سکۂ رائج الوقت مہر مقرر ہوا۔ مولانا شاہ سید مصباح الحسن مودودی پھپھوندوی نے نکاح پڑھایا۔ ایک سال کے بعد ۱۵ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء عہ کو رخصت ہوئی۔ مکان کے حادثۂ آتش زدگی کے ڈھائی ماہ کے بعد خدا نے کیمیا بنائی۔ یعنی ۱۰ر رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ مطابق ۲۷ر اگست ۱۹۴۵ء بروز دوشنبہ بعد عشا، فرزند بلند اقبال عطا فرمایا آثار خوش طالعی چہرہ سے ہویدا ہیں ؎

عہ ۲۰ مئی ۱۹۴۳ء بروز جمعرات۔

Mahar Online Composing Center | Mahar M. Mahar Kathia | 03037619693

بالائے سرش ز ہوشمندی　　می تافت ستارہ بلندی

نیک فالی کے طور پر محمد مجاہد خاں نام اور رجال میاں اور رشدی میاں خطاب رکھا گیا۔ مجاہد نہ صرف شاہد کا قافیہ ہی ہے بلکہ اس نے شاہد کو مفت میں "ابو المجاہد" بھی بنا دیا ہے۔ اور الاسماء تتنزل من السماء کے مطابق فال نیک بھی ہے۔ خدا زندگی دے تو صاحب رشد و ہدایت اور محقق و مجاہد بنائے یہی انسان کی سب سے بڑی معراج ہے۔ صحت و تندرستی اور حسن و خوبی میں ہزاروں میں ممتاز ہے۔ اللّٰھم احفظہ من شر النوائب۔ ذرا سی ترمیم سے محامد مجاہد خاں شروانی تاریخی نام بن جاتا ہے۔ شریک حیات عہد طفولیت ہی میں شفقت مادری سے محروم ہو چکی تھیں۔ سوتیلی ماں کے واسطہ نے درشتیٔ مزاج عادت ثانیہ بنا دی۔ ازدواجی رشتہ کے بعد بھی اس میں کمی نہ آسکی جس کی وجہ سے گھر جنت تو نہ بن سکا مگر خدا کا شکر ہے کہ جہنم بھی نہ بنا ہمیں بس است۔

اب ایک سال سے یعنی ۳۰ ستمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۲۱ شوال ۱۳۶۴ھ سے لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اورنٹیل اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدہ پر فرائض منصبی انجام دے رہا ہوں۔ لٹن لائبریری اپنے نوادر مخطوطات کی وجہ سے بڑی دولت کی مالک ہے۔ مولوی سبحان اللہ خاں گورکھپوری مرحوم مولانا عبد السلام مرحوم، سر شاہ سلیمان الہ آبادی مرحوم، مولانا احسن مارہروی مرحوم۔ اور دوسرے اکابر کے کتب خانوں کے شمول نے اسے اور بھی اہمیت دے دی ہے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے اپنا نادر الوجود کتب خانہ بھی از روئے وقف نامہ ۱۳۶۴ھ میں اپنی وفات کے بعد مسلم یونیورسٹی میں ایک علیحدہ عمارت کتب خانہ کے عمارتی فنڈ سے بنا کر منتقل کرنا تجویز کر دیا ہے۔ اس کتب خانہ کے شامل ہونے کے بعد لٹن لائبریری ہندوستان کا بے مثال مشرقی کتب خانہ بن جائے گی۔

ان دو اشعار پر جو زندگی کی صحیح تصویر بھی ہو سکتے ہیں اس بے کیف داستان کو ختم کرتا ہوں ؎

نالۂ ما صورتے بگرفت بلبل ساختند　　لختہائے دل بہ یکجا جمع شد گل ساختند
آنچہ کم از طاقتِ ما شد بہ تمکینش فزود　　صبر ما بردند و در چشمش تغافل ساختند

محمد عبد الشاہد خاں شروانی

سہ شنبہ یوم عید الاضحیٰ ۱۳۶۵ھ مطابق ۵ نومبر ۱۹۴۶ء

تکملہ

باغی ہندوستان

(مشمولہ طبع سوم لاہور)

- ● —— ایک اور سلسلۂ خیرآبادی۔
- ● —— مولانا فضل امام کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف۔
- ● —— کچھ باغی ہندوستان کے بارے میں۔

مرتبہ

مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری

استاد جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

علامۃ الدہر مولانا علامہ ہدایت اللہ خاں رامپوری ثم جونپوری قدس سرہ العزیز

استاذ الاساتذہ مولانا علامہ ہدایت اللہ خاں بن مولانا رفیع اللہ خاں قدس سرہما محلہ الف خاں رام پور میں پیدا ہوئے۔ آپکا آبائی وطن سوات تھا۔[1] روہیلہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔[2] ابتدائی کتب والد ماجد سے پڑھیں۔ صرف ونحو کی تحصیل مولانا حافظ غلام علی سے کی۔ اور میر زاہد تک معقولات کی تعلیم مولانا جلال الدین (م ۱۳۱۳ھ/ ۶-۱۸۹۵ء) سے حاصل کی۔ جب خاتم الحکماء مولانا علامہ فضل حق خیر آبادی رامپور تشریف لائے تو ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر کسب کمال کیا۔ درس حدیث مولانا سید عالم نگینوی (م ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) سے لیا۔ علامہ خیر آبادی کے شیدائی تھے۔ مختلف مقامات میں ان کے ساتھ رہے۔ اور جب علامہ محمد فضل حق خیر آبادی اسیر ہو کر انڈمان روانہ ہوئے تو آپ مغموم ومحزون رام پور میں تشریف لائے۔ اور مدرسہ عالیہ میں درس دینا شروع کیا۔ (۸-۱۸۸۷ء میں مولوی حیدر حسین کے طلب کرنے پر جونپور تشریف لے گئے۔ اور مدرسہ حنفیہ میں مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی کی جگہ صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اور تا حیات اسی مدرسہ میں علم وفضل کے خزانے لٹاتے رہے۔[3]

اپنے استاذ محترم مولانا جلال الدین کے چھوٹے بھائی حضرت شاہ چھوٹے میاں قدس سرہ کے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں مرید تھے۔ وسیع الاخلاق، کریم النفس، طلبہ پر شفیق اور مسلک اہلسنت پر ثابت قدم تھے۔ ۱۳۰۰ھ/ ۸۳-۱۸۸۲ء میں مرشد آباد میں مشہور غیر مقلد بہاری عالم عبد العزیز رحیم آبادی کے مقابلہ میں مذہب حنفیہ کی حمایت فرمائی۔ ۱۳۱۸ھ/ ۱-۱۹۰۰ء میں علماء اہلسنت کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ جو ندوہ کی اصلاح کے لئے پٹنہ میں منعقد ہوا تھا۔[4]

---

[1] محمود احمد قادری، مولانا شاہ۔ تذکرہ علمائے اہلسنت جلد اول مطبوعہ کانپور ۱۳۹۱ھ، ص ۲۶۱

[2] اقبال احمد، سید۔ تاریخ شیراز ہند جونپور۔ مطبوعہ جونپور ۱۹۶۳ء، ص ۷۸۹۔

[3] محمود احمد قادری، مولانا۔ تذکرہ علماء اہل سنت ص ۲۶۱ نیز اقبال احمد، سید۔ تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۷۹۰۔

[4] محمود احمد قادری، مولانا۔ تذکرہ علماء اہلسنت

علم وفضل میں فقید المثال شخصیت تھے۔ بالخصوص معقولات وحکمت میں اپنی مثال آپ تھے۔ حکیم عبد الحی لکھنوی لکھتے ہیں:۔

انتهت اليه رياسة المنطق والحكمة[1] منطق وحکمت کی ریاست آپ پر ختم ہوگئی۔

مولانا شاہ محمود احمد قادری لکھتے ہیں:۔

"آپ ان علماء میں سے تھے جن سے علم وفضل کو شرف حاصل ہوتا ہے"۔[2]

سید اقبال احمد لکھتے ہیں:۔

"معقولات میں یگانۂ روزگار تھے۔ اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے برابر کا کوئی عالم اس وقت نظر نہ آتا تھا"۔[3]

آپ کے تلامذہ کا احصا بہت دشوار ہے۔ آپ سے ان اساطین علم وفضل نے اکتسابِ فیض کیا جن کی برکات علم آج بھی پاک وہند کے گوشے گوشے میں بروجہِ اتم جلوہ گر ہیں۔ چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:۔

صدر الشریعہ مولانا حکیم محمد امجد علی، فقیہ العصر مولانا یار محمد بندیالوی، رئیس العلماء مولانا علامہ سید سلیمان اشرف۔ سابق چیرمین اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، مولانا عبد السلام نیازی، دہلوی۔ مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی۔ مولانا شیر علی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ مولوی محمد ابراہیم بلیاوی صدر مدرس دار العلوم دیوبند۔ مولانا عبد الاول جونپوری۔ (مصنف مفید المفتی وغیرہ) مولانا عنایت حسین خاں جونپوری۔ مولانا محمد اسماعیل جونپوری، مولانا منصب علی جونپوری[4]۔ اور جبروت جونپوری[5] وغیرہ وغیرہ۔

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ہدایت اللہ جونپوری قدس سرہ بروز اتوار یکم رمضان المبارک

---

[1] عبد الحی لکھنوی۔ مورخ۔ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔ ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء ص ۵۲۰۔

[2] محمود احمد قادری۔ مولانا۔ تذکرہ علمائے اہلسنت۔ ص ۲۶۱۔

[3] اقبال احمد۔ سید۔ تاریخ شیراز ہند جونپور۔ ص ۷۸۹۔

[4] محمود احمد قادری۔ مولانا۔ تذکرہ علماء اہلسنت ص ۲۶۲، ۲۶۳

[5] اقبال احمد۔ سید۔ تاریخ شیراز ہند جن پور ص ۷۸۲، تا ۷۹۴۔

[6] رشید احمد صدیقی۔ پروفیسر گنجہائے گرانمایہ۔ ص ۳۲۔

۲۷ ستمبر (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) دار فانی سے رخصت ہوئے۔ اور حضرت قطب الاقطاب مولانا شیخ عبد الرشید جون پوری قدس سرہ مصنف مناظرہ رشیدیہ (م ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) کی درگاہ واقع رشید آباد میں دفن ہوئے۔ مصرعہ تاریخ وفات یہ ہے:۔

شد نہاں مہر اوج فلسفیات [1]
۲۶ ۱۳ھ

سید عبد الحکیم نقوی نے تاریخ وفات لکھی:۔

مولوی ہدایت اللہ خاں   صاحب علم و زہد و عقل و شعور
چوں بماہ صیام رحلت کرد   از جہاں سوئے خلد، حور و قصور
بر دل دوستاں و شاگرداں   رنجش و کرب و غم نمودہ ظہور
داشت در جملۂ علوم کمال   بود معقول او بگو، مشہور

فکر تاریخ چوں نمود حکیم!
گفت ہاتف کہ ہاں بگو "مغفور" [2]
۱۳۲۶ھ

ذیل میں اول الذکر آپ کے تین اجلۂ تلامذہ کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:۔

صدر الشریعہ مولانا شاہ محمد امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز

خلیفۂ مجاز اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ

صدر شریعت، بدر طریقت، مولانا شاہ محمد امجد علی اعظمی بن حکیم جمال الدین بن مولانا خدا بخش بن مولانا خیر الدین (قدست اسرارہم) ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸-۹ء میں قصبہ گھوسی محلہ کریم الدین پور ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد اور جد امجد فن طب اور علم و فضل میں باکمال تھے۔ ابتدائی کتب جد امجد سے پڑھیں۔ بعد ازاں اپنے بڑے چچیرے بھائی مولانا محمد صدیق رحمہ اللہ تعالیٰ سے علوم و فنون کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر انھیں کے مشورے سے

---

[1] محمود احمد قادری۔ مولانا۔ تذکرہ علمائے اہلسنت۔ ص ۲۶۱-۲۶۲۔ [2] احمد علی خاں شوق۔ تذکرہ کاملان رامپور طبع دہلی ۱۹۲۹ء ص ۴۵۲

استاذ الکل مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری ثم جونپوری رحمۃ اللہ تعالیٰ (م ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) سے اکتساب فیض کے لئے مدرسہ حنفیہ جون پور میں داخل ہوئے۔ علوم و فنون کی تکمیل کے بعد حجۃ العصر شیخ المحدثین مولانا شاہ وصی احمد محدث سورتی قدس سرہ (م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) کی خدمت میں مدرسۃ الحدیث (پیلی بھیت) میں حاضر ہو کر درس حدیث لیا۔ اور ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں سند حاصل کی۔ ۱۳۲۳ھ میں حکیم عبد الولی جھوائی ٹولہ لکھنؤ سے علم طب حاصل کیا۔ ۲۴ھ سے ۲۷ھ تک حضرت محدث سورتی کے مدرسہ میں درس دیا۔ اس کے بعد ایک سال تک پٹنہ میں مطب کرتے رہے۔ [1]

اس اثناء میں اعلیٰحضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ کو مدرسہ منظر اسلام بریلی کے لئے ایک مدرس کی ضرورت پیش آئی۔ استاد گرامی مولانا وصی احمد محدث سورتی کے ارشاد کی بناء پر مولانا امجد علی اعظمی مطب چھوڑ کر بریلی شریف چلے گئے۔ ابتداءً تدریس کا کام شروع کیا۔ بعد ازاں مطبع اہلسنت کا انتظام اور جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی کے شعبۂ علمیہ کی صدارت کے فرائض بھی آپ کے سپرد کر دئے گئے۔ افتاء کی مصروفیات اس کے علاوہ تھیں۔ سلسلۂ عالیہ قادریہ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ اور جلد ہی خلافت سے نوازے گئے۔ قریباً ۱۸ برس شیخ کامل کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے۔ اور کمال عروج کو پہنچے۔ [2]

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی، فتاویٰ کے سلسلے میں آپ پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا:۔

> ”آپ یہاں کے موجودین میں تفقہ جس کا نام ہے وہ مولوی امجد علی صاحب میں زیادہ پائیے گا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ استفتاء سنایا کرتے ہیں اور جو میں جواب دیتا ہوں لکھتے ہیں۔ طبیعت اخاذ ہے۔ طرز سے واقفیت ہو چلی ہے۔“ [3]

---

[1] محمود احمد قادری، مولانا۔ تذکرہ علماء اہلسنت۔ (مطبوعہ بھوانی پور، بہار ۱۳۹۱ھ) ص ۵۱، ۵۲

[2] ہفت روزہ (اور اب ماہنامہ) رضائے مصطفےٰ، گوجرانوالہ۔ ۲ ذیقعدہ ۱۳۷۹ھ، ص ۳۔

[3] محمد مصطفےٰ رضا بریلوی۔ مفتی اعظم ہند۔ ملفوظات حصہ اول (مطبوعہ کراچی)۔ ص ۹۳۔

تلامذہ اور خلفاء کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

میرا امجد، مجد کا پکا!
اس سے بہت لجاتے یہ ہیں۔

بریلی شریف میں قیام کے دوران حضرت صدر الشریعۃ کی مصروفیات حیرت انگیز حد تک بڑھی ہوئی تھیں، تدریس، پریس کی نگرانی، پروف ریڈنگ، پریس مینوں کو ہدایات پارسلوں کی ترسیل اور فتویٰ نویسی وغیرہ امور تن تنہا انجام دیتے۔ فیض رضا نے دین کے لئے کام کرنے کی وہ سپرٹ پیدا کر دی تھی کہ تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بعض حضرات کہا کرتے تھے کہ:۔

"مولانا امجد علی صاحب تو کام کی مشین ہیں۔" [1]

اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ کا فقید المثال ترجمۂ قرآن مجید مسمّٰی باسم تاریخی "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" (۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء) آپ ہی کی مساعی جمیلہ سے شروع ہوا۔ اور پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

آپ نے ابتدائے شباب سے تدریس کا کام شروع کیا۔ اور آخر حیات تک جاری رکھا۔ اور ایسے نابغۂ روزگار افراد تیار کئے جن پر علم وفضل کو بھی ناز ہے۔ طویل عرصہ تک مدرسہ منظر اسلام بریلی میں فرائض تدریس انجام دیئے۔ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں بحیثیت صدر مدرس دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف چلے گئے۔ ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں پھر بریلی شریف چلے آئے [2] اور تین سال تک قیام کیا [3] بعد ازاں نواب حاجی غلام محمد خاں شروانی رئیس ریاست دادوں (علی گڑھ) کی دعوت پر بحیثیت صدر مدرس دار العلوم حافظیہ سعیدیہ میں تشریف لے گئے۔ اور سات سال تک بہ کمال حسن وخوبی فرائض تدریس انجام دیئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء میں مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں امتحان کے موقع پر

---

[1] ماہنامہ پاسبان الہ آباد (امام احمد رضا نمبر، شمارہ مارچ واپریل ۱۹۶۲ء) ص ۶۵

[2] محمود احمد قادری۔ مولانا۔ تذکرہ علماء اہلسنت، ص ۵۳۔

[3] غلام مہر علی مولانا۔ الیواقیت المہریہ، ص ۸۰۔

تقریر کرتے ہوئے آپ کے فضل و کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:۔

> "مولانا امجد علی صاحب پورے ملک میں ان چار پانچ مدرسین میں ایک ہیں۔ جنھیں میں منتخب جانتا ہوں۔"[1]

اس زمانے میں مولانا عبد الشاہد خاں شروانی اسی مدرسہ میں نائب مدرس تھے۔ انھوں نے اپنے تأثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

> "مولانا محمد امجد علی اعظمی، سات سال سے صدر مدرس تھے۔ بریلی، اجمیر، اور دوسرے مدرسوں کے صدر مدرس رہ چکے تھے۔ کہنہ مشقی کی بنا پر درسیات میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔"[2]

۱۳۲۷ھ/۱۹۴۳ء تک دادوں میں قیام رہا۔ اس کے بعد ایک سال بنارس میں رہے۔ بعد ازاں ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء تک منظر اسلام بریلی میں درس دیا۔

اجمیر شریف کے قرب و جوار میں راجہ پرتھوی راج کی اولاد آباد تھی۔ جو اگرچہ مسلمان ہو چکی تھی۔ لیکن ان میں فرائض و واجبات سے غفلت اور مشرکانہ رسوم بکثرت پائی جاتی تھیں حضرت صدر الشریعہ کے ایما پر آپ کے تلامذہ نے ان میں تبلیغ کا پروگرام بنایا۔ تبلیغی جلسوں کا خوشگوار اثر ہوا اور ان لوگوں میں مشرکانہ رسوم سے اجتناب اور دینی اقدار اپنانے کا جذبہ پیدا ہو گیا[3] پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:۔

> "اجمیر کے زمانۂ قیام میں نومسلم راجپوتوں میں مولانا امجد علی نے خوب تبلیغ کی اور اس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے۔"[4]

اس کے علاوہ اردگرد کے بڑے شہروں اور قصبات مثلاً نصیر آباد، بیاور، لاڈنوں، جے پور، جودھپور، پالی مارواڑ اور چتوڑ وغیرہ میں بھی خود آپ اور آپ کے تلامذہ تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھتے۔ مذہب اہل سنت کی اشاعت اور وہابیہ، قادیانیہ کا رد کیا کرتے تھے۔

---

[1] محمود احمد قادری، مولانا تذکرہ علمائے اہلسنت۔ ص ۵۲۔

[2] محمد عبد الشاہد خاں شروانی۔ باغی ہندوستان۔ مطبوعہ بجنور ۱۹۴۷ء ص ۲۳۷

[3] ماہنامہ پاسبان (امام احمد رضا نمبر) ص ۶۸

[4] محمد ایوب قادری، پروفیسر، یادگار بریلی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۰ء ص ۱۶۔

آپ کی تقریر خالص علمی مضامین اور قرآن وحدیث کی تفسیر وتفصیل پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ مسلکِ اہلسنت کو ٹھوس دلائل سے اس طرح بیان فرماتے کہ مخالفین تسلیم کے علاوہ چارۂ کار نہ پاتے

حضرت صدر الشریعہ اگرچہ دینی اور مذہبی قائد تھے لیکن بوقت ضرورت سیاسی طور پر ملّت اسلامیہ کی صحیح ترجمانی فرمائی

۱۴ر رجب ۲۲ر مارچ (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء) کو بریلی میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ابو الکلام آزاد کے علاوہ دوسرے لیڈر بھی شریک ہوئے۔ جمعیت کے لیڈر جو اس جوش وخروش سے آئے تھے کہ گویا "غیر شرعی اتحاد" کے مخالف علماء اہلسنت کو لاجواب کر دیں گے۔ مولانا محمد امجد علی نے جماعت رضائے مصطفےٰ (بریلی) کے شعبۂ علمیہ کے صدر کی حیثیت سے اراکین جمعیت کے غیر اسلامی اتحاد و وداد کے بارے میں نشتر سوالات پر مشتمل سوالنامہ[1] مرتب کر کے قائدین جمعیت کو بھجوایا۔ بار بار اصرار اور مطالبہ کے باوجود انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

صدر الافاضل مولانا محمد سید نعیم الدین مرادآبادی نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی (قدس سرہما) کے نام ایک مکتوب میں اس سوالنامہ کے بارے میں اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

"سیدی دامت برکاتہم!

سلام نیاز کے بعد گزارش، حضور سے رخصت ہو کر مکان پہنچا۔ یہاں آ کر میں نے "اتمام حجت تامہ" کا مطالعہ کیا۔ فی الواقع یہ سوالات فیصلۂ ناطقہ ہیں۔ اور یقیناً ان سوالات نے مخالف کو مجال گفتگو اور راہ جواب باقی نہیں چھوڑی ہے۔"[2]

ابو الکلام آزاد نے روانگی کے وقت بریلی کے اسٹیشن پر کہا:

"ان کے جس قدر اعتراضات ہیں، حقیقت میں سب درست ہیں۔ ایسی غلطیاں کیوں کی جاتی ہیں جن کا جواب نہ ہو سکے۔ اور ان کو اس طرح گرفت کا موقع ملے۔"[3]

---

[1] یہ سوالنامہ "اتمام حجت تامہ" (۱۳۳۹ھ) کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ملاحظہ ہو دوامغ الحمیر مطبوعہ مطبع حسنی۔ بریلی۔ ص ۴۰، ۴۶

[2] دوامغ الحمیر۔ مکتوب صدر الافاضل ص ۵۴، ۵۵۔ [3] ایضاً، ص ۵۶، ۵۷۔

۱۹، ۲۰ شعبان المعظم، ۳، ۴ اکتوبر (۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) کو مراد آباد میں، شاہزادہ اعلیٰ حضرت، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی کی صدارت میں اجلاس منعقد ہوا۔ اور ایک جماعت مؤتمر العلماء قائم کی گئی۔ جس کا مقصد مسلمانوں میں پیدا ہونے والے مفاسد کی اصلاح اور خارجی حملوں کا دفاع تھا۔ اس اجلاس میں حضرت صدر الشریعۃ نمایاں طور پر شریک ہوئے۔ لہ

صدر الشریعہ مولانا محمد امجد علی کو اللہ تعالیٰ نے جملہ علوم و فنون میں مہارت تامہ عطا فرمائی تھی۔ لیکن انھیں تفسیر، حدیث اور فقہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ فقہی جزئیات نوکِ زبان پر رہتی تھیں۔ اس لئے دورِ حاضر کے مجدد امام احمد رضا بریلوی نے آپ کو صدر الشریعۃ کا لقب عطا فرمایا تھا۔ کہ

آپ نے دادوں (ضلع علی گڑھ) میں قیام کے دوران امام ابو جعفر طحاوی حنفی قدس سرہٗ (م ۳۲۱ھ / ۹۳۳ء) کی حدیث کی مشہور کتاب شرح معانی الآثار پر حاشیہ لکھنا شروع کیا۔ اور سات ماہ کی مختصر مدت میں پہلی جلد پر مبسوط حاشیہ تحریر فرما دیا۔ یہ حاشیہ باریک قلم سے ۴۵۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اور ہر صفحہ میں ۳۵، ۳۶ سطریں تھیں۔ گویا دیگر مشاغلِ علمی سے فارغ وقت میں ڈھائی صفحے روزانہ قلمبند فرماتے تھے۔ افسوس کہ یہ حاشیہ طبع نہ ہو سکا۔

آپ کی دوسری تصنیف فتاویٰ امجدیہ ہے جو علمی تحقیقات پر اپنی مثال آپ ہے۔

جس زمانے میں باتصویر قاعدے جاری ہوئے۔ آپ نے ایک قاعدہ مرتب فرمایا جو صرف بے جان اشیا کی تصاویر پر مشتمل تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ بچہ بہت جلد اردو پڑھنے پر قادر ہو جاتا۔ آپ کی تحریر کی یہ خصوصیت ہے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ عام فہم انداز میں بیان فرما دیتے تھے۔

بہار شریعت حضرت صدر الشریعہ کی وہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جسے بجا طور پر فقہ حنفی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کہا جا سکتا ہے۔ اس کے کل سترہ حصے بارہا طبع ہو کر قبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اس کتاب سے نہ صرف عوام بلکہ علماء کے لئے بھی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کتاب کی ابتدا غالباً ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ اور ۱۳۶۲ھ /

لہ ابو البرکات سید احمد۔ مفتی اعظم پاکستان: قلمی یادداشت۔

کہ محمود احمد قادری۔ مولانا: تذکرہ علمائے اہلسنت۔ ص ۵۲۔

۱۹۴۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ آپ ابھی تین حصے اور لکھنا چاہتے تھے۔ مگر حالات نے اس کی مہلت نہ دی۔ چار سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے گیارہ عزیز داغ مفارقت دے گئے۔ جس کا اثر دل و دماغ پر اس قدر پڑا کہ بینائی جاتی رہی اور تصنیف و تالیف کا کام رک گیا۔

بہار شریعت کے ابتدائی چھ حصے اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی نے حرف بحرف سنے اور جابجا اصلاح فرمائی۔ اور انھیں تقریظ سے مزین کیا۔ کتب فقہ میں سے بہار شریعت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر باب میں پہلے آیات مبارکہ پھر احادیث مقدسہ۔ اس کے بعد مسائل فقہیہ بیان کئے گئے ہیں۔

آپ کے حلقۂ درس میں سینکڑوں ملکی اور غیر ملکی طلبہ شامل ہوئے۔ اور اوج کمال کو پہنچے۔ چند مشاہیر تلامذہ کے اسماء یہ ہیں:۔

۱۔ محدث اعظم پاکستان مولانا ابو الفضل سردار احمد لائلپوری۔
۲۔ مناظر اعظم مولانا حشمت علی لکھنوی۔
۳۔ مولانا محمد الیاس سیالکوٹی۔
۴۔ مولانا مفتی محمد اعجاز الرضوی۔
۵۔ مولانا غلام یزدانی سابق صدر مدرس جامعہ رضویہ منظر اسلام بریلی (رحمہم اللہ تعالیٰ)
۶۔ مولانا غلام جیلانی صاحب اعظمی برادر کلاں مولانا غلام یزدانی صاحب شیخ الحدیث براؤں شریف
۷۔ حافظ ملت مولانا عبد العزیز قدس سرہ شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ مبارک پور۔
۸۔ صدر العلماء مولانا غلام جیلانی صاحب مصنف بشیر الکامل، بشیر الناجیہ و بشیر القاری وغیرہ۔
۹۔ شمس العلماء مولانا قاضی شمس الدین احمد جعفری مصنف قانون شریعت۔
۱۰۔ مجاہد اعظم مولانا حبیب الرحمن صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت۔
۱۱۔ مولانا رفاقت حسین۔ مفتی اعظم کانپور۔
۱۲۔ مولانا وقار الدین۔ دار العلوم امجدیہ کراچی۔
۱۳۔ مولانا تقدس علی خان شیخ الجامعہ۔ جامعہ راشدیہ۔ پیر گوٹھ (سندھ)

۱۴۔ مولانا ولی النبی۔ بیکی توڑڈیر شریف (مردان) —

۱۵۔ مولانا مختار الحق خطیب اعظم دار السلام (ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور وغیرہ وغیرہ[1]

حضرت صدر الشریعہ کے تین صاحبزادے آپ کی حیات میں ہی داغ مفارقت دے گئے تھے[2]۔ اس وقت آپ کے چھ صاحبزادے موجود ہیں۔ علامہ عبد المصطفیٰ ازہری، مولانا قاری رضاء المصطفیٰ (کراچی)۔ علامہ ضیاء المصطفیٰ، مولانا ثناء المصطفیٰ، مولانا بہاء المصطفیٰ، مولانا فداء المصطفیٰ۔ علامہ ازہری جمعیۃ العلماء پاکستان کے رہنما اور قومی اسمبلی کے ممبر ہیں ——————— اور حضرت صدر الشریعہ کے ساتھ نسبت تلمذ تقریباً اول سے لیکر دورۂ حدیث تک ہے۔

حضرت صدر الشریعہ بریلی شریف کے قیام کے دوران ۱۳۳۷ھ/۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ حج و زیارت کی سعادت سے مشرف ہوئے[3]۔ دوسری دفعہ حرمین شریفین کی حاضری کے ارادے سے بمبئی پہنچے تھے۔ کہ ۲ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ ۶ ستمبر بروز دوشنبہ ۱۹۴۸ء ۱۲ بجے رات کے گیارہ بجے عالم جاودانی کی طرف تشریف لے گئے۔ درج ذیل آیہ مبارکہ مادہ تاریخ ہے۔ اِنَّ المتقین فی جنّٰت و عیون (۱۳۶۷ھ)

شاعر مشرق شفیق جونپوری نے چہلم کے موقع پر بطور ہدیۂ عقیدت یہ قطعہ پیش کیا:۔

سلامی جابجا ارض و سما دیں ٭ مہ و خورشید، پیشانی جھکا دیں
ترے خدّام اے صدرِ شریعت ٭ جدھر جائیں فرشتے پر جھکا دیں[5]

* * *

---

[1] ماہنامہ پاسبان: امام احمد رضا نمبر ص ۸۳، ۸۴

[2] رضائے مصطفیٰ: صدر الشریعہ نمبر ص ۸ –

[3] رضائے مصطفیٰ: صدر الشریعہ نمبر ص ۸ –

[4] غلام مہر علی – مولانا – الیواقیت المہریہ، ص ۸۰

[5] ماہنامہ پاسبان – امام احمد رضا نمبر ص ۴۷

فقیہ العصر مولانا یار محمد بندیالوی قدس سرہٗ

◆

استاذ العلماء، فقیہ العصر مولانا یار محمد بندیالوی ابن میاں شاہنواز قدس سرہ ۱۲۹۷ھ/ ۸۰-۱۸۷۹ء میں بندیال ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے [1]۔ موضع پکہ ضلع میانوالی میں قرآن مجید حفظ کیا۔ بعد ازاں ایک مقامی عالم کے پاس فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مولانا محمد امیر دامانی رحمہ اللہ تعالیٰ (مصنف قانونچہ امیریہ) سے صرف و نحو کے علاوہ بعض دینی کتابیں پڑھیں۔ پھر مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں موضع پنجان ضلع جہلم حاضر ہوئے اور الفیہ ابن مالک پڑھا۔ فنون عالیہ کی تحصیل مشہور زمانہ استاد مولانا غلام احمد حافظ آبادی صدر مدرس جامعہ نعمانیہ لاہور سے کی۔ جامع مسجد فتحپوری دہلی میں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے مزید دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مرکز اہلسنت بریلی شریف اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے علالت طبع اور تصنیف و تالیف کی بے پناہ مصروفیات کی بنا پر استاذ الکل مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری تلمیذ رشید خاتم الحکماء مولانا علامہ محمد فضل حق خیر آبادی کی طرف راہنمائی کی۔ مولانا یار محمد قدس سرہٗ نے جون پور

---

[1] غلام مہر علی، مولانا: الیواقیت المہریہ (مطبوعہ مکتبہ مہریہ چشتیاں شریف ۱۹۶۳ء) ص ۱۰۴۔

نوٹ: حیات استاذ العلماء (مطبوعہ مکتبہ امدادیہ مظہریہ بندیال ضلع سرگودھا ۱۳۸۹ھ) میں سن ولادت ۱۸۸۷ء لکھا ہے جس کے مطابق سن ہجری ۰۵-۱۳۰۴ھ ہے، ادوار حیات کے پیش نظر مذکورہ بالا سن ولادت صحیح معلوم ہوتا ہے۔ تذکرہ علماء اہلسنت مطبوعہ مظفر پور بہار (انڈیا) مرتبہ مولانا شاہ محمود احمد قادری میں سن ولادت ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۷ء لکھا ہے۔ اس میں سن ہجری و عیسوی کی مطابقت نہیں ہے۔

پہنچ کر معقولات کی منتہی کتب افق المبین، شرح اشارات، حواشی جدیدہ و قدیمہ پڑھ کر علوم کی تکمیل کی۔ ان دنوں صدر الشریعہ مولانا امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ (مصنف بہار شریعت) بعض اسباق میں آپ کے ہم درس رہے۔[1]

مرشد العصر حضرت مولانا صوفی محمد حسین الہ آبادی (م ۸ رجب ۱۹ ستمبر ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) خلیفۂ اعظم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہما اللہ تعالیٰ کے دست مبارک پر سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ میں بیعت ہوئے۔ اور ڈھائی سال تک بارگاہ شیخ میں حاضر رہ کر کتب تصوف کا درس لیا۔ اور منازل سلوک طے کیں۔ بالآخر اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے[2]

استاذ العلماء مولانا ہدایت اللہ جونپوری کے وصال کے بعد مدرسہ حنفیہ میں مدرس مقرر ہوئے[3] بعد ازاں الہ آباد، رام پور، بھوپال اور ٹونک کے مدارس میں بیس بائیس سال تک تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ اور قریباً تیس برس تک تشنگان علم کی علمی پیاس بجھاتے رہے۔

مولانا یار محمد قدس سرہ کو قدرت نے غضب کا حافظہ دیا تھا۔ تمام علوم میں حیرت انگیز مہارت رکھتے تھے۔ خاص طور پر فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ مناظرہ میں آپ کو معراج کمال حاصل تھا۔ قیام ہند کے دوران مولوی اشرف علی تھانوی سے آپ کی ملاقات ہوئی تو آپ نے پوچھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وعلم آدم الاسماء کلہا اس میں "اسماء" معرف بلام استغراق ہے اور "کلہا" سے مؤکد ہے۔ اس کا عموم قطعی ناقابل تخصیص ہے یہی علم کلی ہے۔ تو جو علم نص قرآنی کے مطابق آدم علیہ السلام کے لئے ثابت ہے اسے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ثابت ماننا کیونکر کفر و شرک ہوگا؟ تھانوی صاحب نے کہا حضرت آدم علیہ السّلام کو صرف اسماء کا علم عطا کیا گیا تھا نہ کہ مسمیات کا، لہٰذا یہ علم کلی نہ ہوا۔ مولانا نے فرمایا: اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے ثم عرضہم علی الملٰئکۃ فقال انبئونی باسماء ہٰؤلاء الآیۃ، پھر آدم علیہ السّلام کو فرمایا انبئہم باسمائہم

---

[1] حیات استاذ العلماء بندیالوی: ص ۱۰، ۱۶ [2] حیات استاذ العلماء بندیالوی: ص ۱۷

[3] محمود احمد قادری، مولانا: تذکرہ علمائے اہلسنت، ص ۲۶۳

اس سے صراحۃً پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام کو اسماء اور مسمیات دونوں کا علم عطا کیا گیا تھا نہ کہ صرف اسماء کا۔ تھانوی صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ [1]

استاذ الاساتذہ مولانا یار محمد بندیالوی کی تقریر میں بلا کا سوز تھا۔ تحریکِ پاکستان شروع ہوئی تو آپ نے پورا زورِ خطابت مسلم لیگ کی حمایت میں صرف کر دیا۔ اس وقت، ضلع سرگودھا اور میانوالی کے اکثر امراء یونینسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مسلم لیگ کا نام تک سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ پھر اس علاقہ میں ملک خضر حیات ٹوانہ کا بہت اثر تھا اس کے باوجود آپ نے علی الاعلان فرمایا:۔

"ایک طرف اسلام کا جھنڈا ہے۔ دوسری طرف کفر کا، چونکہ مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت ہے اس لئے اس سے کٹنا اسلام سے کٹنا ہے۔"

آپ ہر جمعہ نظریۂ پاکستان کے حق میں بیان فرماتے جس سے متأثر ہو کر سینکڑوں افراد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ [2]

حضرت استاذ العلماء سے سینکڑوں علماء نے اکتسابِ فیض کیا۔ قیامِ ہند کے دوران جن حضرات نے آپ سے استفادہ کیا۔ ان کے اسماء کا علم نہیں ہو سکا۔ آپ کی بارگاہِ علمی سے مستفید ہونے والے چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:۔

ملک المدرسین مولانا حافظ عطا محمد گولڑوی دامت برکاتہم العالیہ۔ شیخ القرآن مولانا محمد عبدالغفور ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ مولانا علامہ سید سلیمان اشرف قدس سرہ خلیفۂ اعلیٰحضرت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ و سابق چیئرمین اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا محمد سعید مدظلہ العالی (واں بھچراں)، مولانا فتح محمد، مولانا قادر بخش، مولانا عبدالرحیم (کاشغر) مولانا عبدالخالق (سوات) مفتی محمد شفیع دیوبندی (سرگودھا) مولوی احمد شاہ دیوبندی (چوکیرہ) مولوی غلام یسین دیوبندی (واں بھچراں) وغیرہ وغیرہ [3]

آپ کے تلامذہ میں سب سے زیادہ فیض رساں شخصیت ملک المدرسین استاذ

---

[1] غلام مہر علی، مولانا۔ الیواقیت المہریہ ص ۱۰۳ [2] حیات استاذ العلماء: ص ۴۲۔

[3] حیات استاذ العلماء: ص ۴۴

الاساتذہ مولانا عطا محمد گولڑوی دامت فیوضہم العالیہ زیب مسند تدریس دارالعلوم امدادیہ مظہریہ بندیال (ضلع سرگودھا) ہیں۔ دنیائے اہلسنت پر آپ کا احسان عظیم ہے کہ آپ نے افاضل مدرسین کی بہت بڑی جماعت تیار کی ہے۔ آپ کے بالواسطہ اور بلاواسطہ تلامذہ کراچی سے پشاور تک کے مدارس میں گرانقدر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت مجاہد تحریک آزادی مولانا علامہ محمد فضل حق خیر آبادی شہید قدس سرہ کے سلسلۂ تلامذہ میں سب سے عظیم مدرس آپ کی ذات گرامی ہی ہے۔

استاذ العلماء مولانا یار محمد بندیالوی کا وصال ۲۲ محرم ۶ دسمبر (۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء) کو ہوا۔ آپ کا مزارِ انور بندیال کی جنوبی جانب مرجع خلائق ہے[1] لوح مزار پر آپ کے تلمیذ ارشد مولانا عطا محمد گولڑوی مدظلہ العالی کا درج ذیل قطعہ کندہ ہے:۔

بُدہ در مرتبہ اولیٰ بہ معقول شدہ او در ایدطولیٰ بہ منقول
بیانش گنج اسرار الٰہی دلش روشن زانوار الٰہی
سراج صد ہزاراں زو فشاں مَاند وان غاب ولکن ضو فشاں ماند
ہمہ عمرش بزہد و اتقا رفت
عطا گوید بہ عشق مصطفیٰ رفت!!

آپ کی اولاد میں سے اس وقت دو صاجزادے صاحب علم وفضل تشریف فرما ہیں،

۱۔ فقیہہ جلیل مولانا محمد عبد الحق مدظلہ العالی مہتمم دار العلوم امدادیہ مظہریہ (بندیال)

۲۔ مولانا محمد فضل حق مدظلہ العالی ناظم مدرسہ مذکورہ۔

دار العلوم امدادیہ مظہریہ (بندیال) دورِ حاضر میں علوم دینیہ کی وہ عظیم یونیورسٹی ہے جہاں پاکستان بھر کے محنتی اور شائق طلبہ کھنچے چلے آرہے ہیں۔ اور شب و روز علوم دینیہ کی تحصیل میں محو ہیں۔ مجھے حضرت مبلغ اسلام مولانا شاہ محمد عارف اللہ مدظلہ العالی کا وہ فرمان آج تک نہیں بھولا۔ جو میں نے دوران تعلّم وان بھچراں میں سنا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا:۔

"بندیال میں علم پڑھایا نہیں جاتا۔ پلایا جاتا ہے۔"

مولائے کریم حضرت استاذ العلماء بندیالوی کے فیوض و برکات کو تاقیامت جاری رکھے آمین!

---

[1] حیات استاذ العلماء ص ۴۳۔

رئیس المتکلمین حضرت مولانا سید محمد سلیمان اشرف بہاری قدس سرہ

دنیائے علم وفضل کے تاجدار، میدان تحقیق و تدقیق کے شہسوار مولانا سید محمد سلیمان اشرف بہاری ابن مولانا حکیم سید محمد عبد اللہ قدس سرہما تقریباً ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں محلہ میرداد بہار۔ (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتب پڑھنے کے بعد مدرسہ حنفیہ جونپور میں، استاذ العلماء مولانا علامہ محمد ہدایت اللہ رامپوری ثم جونپوری سے علوم کی تحصیل و تکمیل کی[1] ان کے علاوہ استاذ الاساتذہ مولانا یار محمد بندیالوی قدس سرہ سے بھی استفادہ کیا[2]

طریقت کے اعتبار سے آپ چشتی نظامی فخری سلیمانی تھے۔ (آپ کے مرشد کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔) موجودہ صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی آپ کو اجازت و خلافت حاصل تھی۔

۱۳۱۹-۲۰/۱۹۰۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ آپ کے تقرر کی تفصیل جناب حافظ غلام غوث (نبیرہ مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری) نے ایک مضمون میں بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایم، اے، او کالج علی گڑھ میں دینیات کے لیکچرار کی ضرورت تھی۔ مولانا کو اطلاع دی گئی اور انٹرویو میں "معجزہ" پر مقالہ لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ اور ساتھ ہی کہا گیا کہ کتابوں کی ضرورت ہو تو جیب گنج تشریف لے جائیں۔ مولانا نے فرمایا۔ بحمد اللہ مجھے کتابوں کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف کاغذ اور قلم دوات مہیا کر دیا جائے۔ چنانچہ نماز عشاء کے بعد سے صبح کی نماز تک ایک ہی مجلس میں بائیس فل اسکیپ صفحات پر مدلل مضمون قلمبند کر دیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ پھر نماز جمعہ کے بعد "توحید" پر خطاب کرنے کے لئے کہا گیا تو آپ نے تین گھنٹے تک اس موضوع پر تقریر فرمائی جسے سن کر پرستاران وحدت جھوم گئے۔ اس تقریر میں دینیات کمیٹی کے تمام اراکین

---

[1] محمود احمد قادری۔ مولانا: تذکرۂ علمائے اہلسنت، ص ۱۰۰، [2] حیات استاذ العلماء بندیالوی: ص ۳۹۔

نواب وقار الملک مشتاق حسین اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی موجود تھے۔ اسی دن پچاس روپیہ مشاہرہ پر آپ کا تقرر کر دیا گیا[۱] آپ نے تاحیات بڑے جاہ و جلال کے ساتھ فرائضِ منصبی کو ادا کیا۔

قدرت ایزدی نے آپ کو حیرت انگیز صلاحیتوں سے نوازا تھا خطابت میں بلا کا زور تھا جس وقت آپ گفتگو فرماتے تو دریا کی روانی کا نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں:۔

"جونپور میں سیرت رسول کا جلسہ تھا۔ مرحوم (مولانا محمد سلیمان اشرف) کی تقریر ہو رہی تھی۔ جلسہ کیا ایک جمِ غفیر تھا۔ مرحوم اپنے مخصوص والہانہ جوش و وارفتگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے۔ حاضرین کی خاموشی کا عالم یہ تھا کہ سارا مجمع ایک ہی متنفس تھا۔ اتنے میں دور سے ایک بوڑھا، پستہ قد، نحیف شخص جھکا ہوا، انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا۔ جس شخص کے پاس سے گزرتا ہے وہ خوف و عقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ مرحوم کو سینہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا۔ یہ مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جبرورت جونپوری مرحوم کے استاد اور جونپور میں اس وقت علم و ہنر کے چشم و چراغ تھے۔"[۲]

جرأت اور بے باکی مولانا کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنی رائے کا اظہار بے دھڑک کر دیتے تھے کسی کے علم و فضل یا وجاہت و اقتدار سے مرعوب ہونا تو آپ نے سیکھا ہی نہ تھا۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی کے کسی ایسے اجلاس میں شریک نہ ہوتے جس میں کسی بڑے آدمی کو مدعو کیا گیا ہوتا۔ اور نہ ہی کسی کے گھر جاتے جب تک اس سے دوستانہ مراسم نہ ہوتے۔[۳]

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔

"مرحوم میں اپنے استاد ہی کا جبروت و طنطنہ تھا۔ ان کی شفقت میں بھی جبروت

---

[۱] غلام غوث، حافظ: مولانا سلیمان اشرف اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے تعلقات (سہ ماہی العلم اپریل تا جون ۱۹۸۳ء) ص ۸۲ [۲] رشید احمد صدیقی، پروفیسر: گنجہائے گرانمایہ (آئینہ ادب لاہور) ص ۳۱۔۳۲ [۳] ایضاً: ص ۳۳

کارفرما تھا۔ میں نے مرحوم کو جھجک کر یا گول مول باتیں کرتے کبھی نہ پایا۔"[1]

مولانا سید سلیمان اشرف نے متعدد کتابیں تحریر فرمائیں۔ جن میں بیان و برہان کا زور پوری طرح جلوہ گر ہے۔ آپ نے جب النور اور الرشاد ایسی کتابیں لکھ کر ملک کے سیاسی لیڈروں کا شرعی نقطۂ نگاہ سے محاسبہ کیا تو نئی لعنتوں کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ تحریر و تقریر کے ذریعہ آپ کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا۔ لیکن آپ کوہ وقار بنے رہے اور طعن و تشنیع کی پرواہ کئے بغیر اعلاء کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ اس وقت عوام تو عوام بعض خواص بھی اس مغالطے میں واقع ہو گئے کہ عام طور پر کانگریس اور جمعیۃ العلماء ہند کے لیڈر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی سو فیصد درست ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ احساس یقین کی حد کو پہنچنے لگا کہ اس افراتفری کے دور میں علماء اہلسنّت نے جو کچھ کہا تھا۔ وہی حقیقت تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔

> "سیلاب گذر گیا۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم (مولانا سلیمان اشرف) نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔ آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سارے علماء سیلاب کی زد میں آچکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے۔"[2]

فارسی شعر و ادب کی تاریخ پر الانہار لکھی۔ عربی فارسی اور اردو کے محقق اور ادیب مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے اسے شبلی کی شعر العجم سے بہتر قرار دیا۔ حج کے موضوع پر الحج تالیف کی۔ جسے مولانا شروانی نے حج کے موضوع پر سب سے بہتر قرار دیا۔ عربی زبان کی برتری اور فوقیت پر نہایت وقیع کتاب المبین لکھی۔ جسے اہل علم نے بے حد سراہا۔ مشہور مستشرق مسٹر براؤن نے اسے دیکھ کر کہا:۔

---

[1] رشید احمد صدیقی، پروفیسر: گنجہائے گرانمایہ (آئینۂ ادب لاہور) ص ۳۲ - [2] ایضاً ص ۳

[3] محمود احمد قادری، مولانا۔ تذکرہ علمائے اہلسنت، ص ۱۰۰ -

"مولانا نے اس عظیم موضوع پر اردو میں یہ کتاب لکھ کر ستم کیا۔ عربی یا انگریزی میں ہوتی تو کتاب کا وزن اور وقار بڑھ جاتا۔"[1]

مولانا نے المبین کا ایک نسخہ ڈاکٹر اقبال کو بھی بھجوایا تھا۔ اتفاقاً کچھ دن بعد اقبال علی گڑھ گئے تو دورانِ ملاقات اس کتاب کی بڑی تعریف کی۔ اور کہا:-

"مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔"[2]

مولانا کا اہل سنت پر یہ احسان بھی کچھ کم نہیں ہے کہ آپ نے مجاہد جلیل مولانا علامہ محمد فضل حق خیرآبادی کی لاجواب تصنیف امتناع النظیر پہلی دفعہ شائع کر کے اسے علمی دنیا میں متعارف کرایا ہے۔[3]

مولانا سید سلیمان اشرف نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فرائضِ تدریس انجام دیتے رہے۔ آپ سے ہزارہا افراد نے استفادہ کیا۔ چند مشاہیر تلامذہ کے نام یہ ہیں:-

۱ مبلغ اسلام مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری، بانی المرکز الاسلامی کراچی۔
۲ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مؤلف گنجہائے گرانمایہ، علی گڑھ۔
۳ ڈاکٹر عابد احمد علی مہتمم بیت القرآن۔ پنجاب پبلک لائبریری۔ لاہور (م ۲۵ر اپریل ۱۹۷۴ء
۴ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔ لاہور۔

۵ ربیع الاول، ۲۵ر اپریل (۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) میں مولانا سید محمد سلیمان اشرف قدس سرہ کا وصال ہوا۔[4] اور علی گڑھ کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

---

[1] محمود احمد قادری۔ مولانا، تذکرہ علمائے اہلسنت۔ ص ۱۰۰۔

[2] رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنجہائے گرانمایہ ص ۴۱۔

[3] محمد یعقوب ضیاء القادری، مولانا، اکمل التاریخ حصہ اول ص ۹۰۔

[4] عبدالقدوس ہاشمی، تقویم تاریخی، ص ۳۴۰

نوٹ:۔ تذکرہ علماء اہلسنت میں لکھا ہے کہ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ میں آپ کا وصال ہوا جو صحیح نہیں ہے۔

کچھ باغی ہندوستان کے بارے میں

مولانا عبدالشاہد شروانی نے پیش نظر کتاب لکھ کر علمی دنیا میں بلند مقام حاصل کیا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی وسعت نظری، علمی گہرائی، سلاست بیان اور علامہ فضل حق خیرآبادی سے والہانہ عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اہلسنت کے بطل جلیل، قائد حریت علامہ فضل حق خیرآبادی کے علمی، ادبی اور مجاہدانہ کارنامے کتابی شکل میں مرتب کر کے لافانی بنا دیا ہے۔ باغی ہندوستان کو نظر انداز کر کے علامہ پر کوئی تحقیقی مقالہ یا کتاب نہیں لکھی جا سکتی۔ عہ

مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے سب سے پہلے تحریک آزادی کی مستند دستاویز جہاد آزادی کے ہیرو علامہ فضل حق خیرآبادی کی تصنیف لطیف "الثورۃ الہندیہ" اور "قصائد فتنۃ الہند" کو اردو ترجمہ اور مفصل مقدمہ کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں شائع کروا کر علمی دنیا میں متعارف کرایا۔ بعد ازاں رسالہ اور قصائد کا یہی ترجمہ رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" میں شامل کر دیا۔ مولانا غلام مہر علی مدظلہ (چشتیاں شریف) نے کتاب مذکور بہادر شاہ ظفر سے "الثورۃ الہندیہ" کا ترجمہ اپنی کتاب دیوبندی مذہب کا علمی محاسبہ میں شامل کر دیا۔ اس کے علاوہ مولانا غلام مہر علی مدظلہ نے الثورۃ الہندیہ پر الیواقیت المہریہ کے نام سے عربی میں حاشیہ لکھ کر ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ جس میں حل کتاب کے علاوہ کثیر تعداد میں علمائے اہلسنت کے حالات قلمبند کیے ہیں۔

* * *

موافق و مخالف اس بات پر متفق ہیں کہ علامہ محمد فضل حق خیرآبادی کشور علم کے

عہ

لکھے گئے ہیں جو نظریۂ پاکستان کے مخالف اور مولانا آزاد کی بیجا، مبالغہ آمیز مدح سرائی پر مشتمل ہیں ۱۲ شرف قادری

تاجدار اور دورِ آخر میں منطق و فلسفہ کے مسلم الثبوت امام تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں اس دور کے تمام مروّجہ علوم سے فارغ ہو کر مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔ حافظہ اس غضب کا تھا کہ چار ماہ اور کچھ دنوں میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔[1] اور علم و فضل میں وہ مقام حاصل کیا جہاں تک معاصرین میں سے کوئی نہ پہنچ سکا۔

علامہ فضل حق اور غالب :-

مرزا غالب دہلوی جن کی نظر میں بڑے بڑے شعراء بھی نہ جچتے تھے۔ شعر و سخن میں علامہ فضل حق خیر آبادی سے نہ صرف مشورہ کرتے تھے بلکہ ان کی اصلاح کو بہ طیبِ خاطر قبول بھی کرتے تھے۔ علامہ ہی کے ایماء پر غالب نے مشکل پسندی کو ترک کیا تھا۔ مؤلف آبِ حیات کے مطابق موجودہ دیوانِ غالب علامہ اور مرزا خانی ہی کا انتخاب ہے۔ علامہ نے نہ صرف غالب کی ادبی رہنمائی کی بلکہ اقتصادی مشکلات حل کرنے میں بھی مرزا غالب کی حتی الوسع امداد فرمائی۔ علامہ کے احسانات کا اثر غالب کے دل پر بہت گہرا تھا۔ جس کا اندازہ مرزا غالب کی تحریرات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ علامہ کی شہادت کے بعد غالب نے شیخ لطیف احمد کو ایک خط لکھا جس میں علامہ سے گہری عقیدت کی عکاسی اور روحانی درد و کرب کا نمایاں اظہار ہے۔ لکھتے ہیں :-

"فخرِ ایجاد و تکوین، مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے۔ غالب نیم مردہ نیم جان رہ جائے :-

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی[2]

شیخ محمد اکرام، غالب پرستی میں یہاں تک کہہ گئے :-

"یہ صحیح ہے کہ مولوی فضل حق کی صحبت سے انھیں (مرزا غالبؔ) فائدہ ہوا۔ لیکن ادب و حکمت کی جن بلندیوں پر مرزا پہنچے وہاں فضل حق یا شیفتہ

---

[1] عبدالاول جون پوری، مولانا: مقدمہ مفید المفتی، ص ۱۳۹ [2] نادم سیتاپوری: غالب نام آورم ص ۹۳، بحوالہ ماہنامہ اردوئے معلی، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۷۰ء)

کیسے ساتھ دے سکتے تھے۔" ۱؎

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس کا سختی سے نوٹس لیا ہے۔ اور واضح الفاظ میں شیخ اکرام کی غلط فہمی کی نشاندہی کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

> "اب شیخ محمد اکرام (ایم۔ اے سابق آئی سی، ایس، حال سی، ایس، پی) کو کوئی کیونکر سمجھا سکتا ہے کہ ادب و حکمت کی جن بلندیوں پر مولانا فضل حق خیرآبادی پہنچے۔ غالب ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی حیثیت مولانا کے سامنے طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہے ؎
>
> چہ نسبت خاک را با عالم پاک ٭
>
> "جو شخص "نمود" اور "ثبوت" میں بھی امتیاز نہ کر سکے اسے خاتم الحکماء مولانا فضل حق مرحوم پر فضیلت دینا شیخ صاحب ہی کا حوصلہ ہے۔ اگر اکرام صاحب مولانا کا حاشیہ "برقاضی مبارک" پڑھ لیتے تو اس جسارت کا ارتکاب ہرگز نہ کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ:۔
>
> "جب تک فضل حق شامل نہ ہو انسان مولانا فضل حق کے مرتبہ سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔" ۲؎

مرزا حیرت کی غلط بیانی

حاشیۂ قاضی کی بات آگئی تو بقول نادم سیتاپوری مشہور "منکر حقائق" مرزا حیرت دہلوی کا چھوڑا ہوا ایک شگوفہ بھی ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

> "مولوی امیر احمد صاحب مرحوم نے مولوی فضل حق صاحب کی تصانیف (حواشی اشعار وغیرہ پر تیرہ سو اعتراض کئے ہیں۔ اور اس رسالہ کا نام تیرہ صدی رکھا ہے مولوی شبلی صاحب نعمانی نے ان کثیر التعداد اعتراضوں کا جواب دینا چاہا تھا مگر بن نہ پڑا۔" ۳؎

۱؎ محمد اکرام شیخ، حکیم فرزانہ۔ ص ۵۲ ۲؎ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر۔ مقدمہ شرح دیوان غالب ص ۱۶۱، ۱۶۲ ۳؎ مرزا حیرت دہلوی: حاشیہ حیات طیبہ مطبوعہ لاہور ص ۱۰۰۔

یہ درست ہے کہ بعض علماء نے حاشیۂ قاضی پر کچھ اعتراض کئے تھے لیکن علامہ نے ان اعتراضات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ مولوی محمد قاسم نانوتوی (مصنف تحذیر الناس) لکھتے ہیں:۔

> "مولانا فضل حق صاحب مرحوم و مغفور کے حاشیۂ قاضی پر بعض فضلا روزگار نے کچھ اعتراض لکھے تھے۔ مولانا نے دیکھا۔ اور لوگ امیدوار تحریر جواب تھے۔ پر آپ نے کچھ نہ لکھا۔ اور یہ فرمایا کہ اس کے جواب بھی قاضی کے حاشیہ ہی میں ہیں"[1]

لیکن "تیرہ صدی" والا مفروضہ محض مرزا حیرت کی اختراع ہے:۔

اس سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا ایک مکتوب پوری طرح حقیقت حال کو بے نقاب کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "میں نے کتاب حیات طیبہ (سوانح شاہ اسماعیل شہید) دیکھی۔ اور مرزا حیرت کا وہ حوالہ اور نوٹ دیکھا۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ میری نظر سے نہ تو تیرہ صدی رسالہ گزرا۔ اور نہ ہی اس حوالہ کے سوا میں نے اس رسالہ کا کہیں دوسری جگہ ذکر یا حوالہ دیکھا۔ بلکہ مرزا نے اس کے مرتب سید احمد رامپوری اور مؤلف امیر احمد (حاشیہ) قرار دیئے ہیں۔ میں ان دونوں شخصیتوں سے بھی ناواقف ہوں۔ اور نہ ہی یہ حوالہ کہیں نظر سے گزرا کہ علامہ شبلی مرحوم نے اس رسالہ کی جواب دہی کی کوشش کی۔
>
> تذکرہ کاملان رامپور میرے سامنے ہے اس میں سید احمد یا امیر احمد کوئی ایسے صاحب نہیں ہیں جو تیرہ صدی رسالہ کے مرتب یا مؤلف ہوں۔ حیات شبلی کو بھی دیکھا، وہاں بھی علامہ شبلی کے حال میں کوئی ایسا ذکر نہیں ہے کہ انھوں نے تیرہ صدی رسالہ کے جواب لکھنے کی کوشش کی۔
>
> میری رائے ہے کہ مرزا حیرت کی یہ سب ذہنی اختراعات ہیں۔ مرزا حیرت نے حیات طیبہ میں چند اور کتابوں مثلاً سیر دہلی، تذکرہ مشاہیر دہلی

---

[1] محمد قاسم نانوتوی، مناظرۂ عجیبہ۔ مطبوعہ بلالی پریس ساڈھورا ص ،،۔

اور تواریخ علمائے دہلی کے بھی حوالے دیئے ہیں۔ میرے خیال سے ان کتابوں کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں ہے۔

ویسے بھی مرزا کی یہ کتاب تاریخی ماخذ کے اعتبار سے بہت کمزور ہے اسی طرح امیر الروایات بھی میرے خیال سے غیر مستند ماخذ ہے۔ اس میں بھی اکثر ناقابل اعتبار روایتیں جمع کر دی گئی ہیں۔"[1]

تلامذہ

علامہ محمد فضل حق خیرآبادی تکمیل تعلیم کے بعد بہ سلسلۂ ملازمت ابتداً دہلی میں سررشتہ دار رہے۔ بعد ازاں ریاست جھجر، الور، رام پور اور اودھ میں بہ صد عزت و نیک نامی ذی وقار عہدوں پر کام کرتے رہے اس کے ساتھ درس و تدریس اور حمایت مسلک اہلسنت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ آپ کے ان گنت تلامذہ آسمان علم و فضل کے مہر و ماہ بن کر چمکے۔ اور آج تک آپ کا علمی فیض پاک و ہند کے مدارس کی فضاؤں کو منور کر رہا ہے۔ باغی ہندوستان میں علامہ کے گیارہ تلامذہ کے اسماء درج ہیں۔ راقم کی جستجو کے مطابق چند مزید نام درج کئے جاتے ہیں:[2]

۱ مولانا عبدالعزیز سنبھلی (تذکرہ کاملان رامپور، از احمد علی خاں شوق۔ ص ۲۲۴)

۲۔ مولانا عبدالعلی خاں ریاضی داں، متوفی ۱۳۰۳ھ/۶، ۱۸۸۵ء استاذ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی (ایضاً۔ ص ۲۲۸)

۳۔ مولانا حکیم محمد فیاض خاں۔ متوفی ۲۵ رجب ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء (ایضاً ص ۲۶۷)

۴۔ مولانا موسیٰ خاں، متوفی ۱۳۳۲ھ/۵-۱۹۱۴ء (ایضاً: ص ۲۴۴)

۵۔ ملا نواب متوفی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء (ایضاً ص ۴۲۲)

۶۔ مولانا قلندر علی زبیری، استاذ مولانا حالی مصنف "تنزیل التنذیر فی نظیر البشیر و النذیر" (رد تقویۃ الایمان)[3]

---

[1] مکتوب پروفیسر محمد ایوب قادری۔ بنام راقم الحروف، تحریر ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۱ء [2] اس ایڈیشن کے اندر محترم مؤلف نے کتاب میں یہ اسماء بھی شامل کر لئے ہیں۔ محمد احمد مصباحی [3] قلمی یادداشت
(بقیہ صفحہ ۴۰۸ پر)

۷ــــ مولانا حکیم سید محمد حسن امروہوی۔ متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵-۶ء (فرنگیوں کا جال۔ از امداد صابری ص ۳۰۲)

۸ــــ مولانا داد بخش پنجابی (تذکرہ علمائے حال از محمد ادریس نگرامی، ص ۸۵)

۹ــــ مولانا سید یاد علی ہسوانی (ایضاً ص ۹۹)

۱۰ــــ نواب یوسف علی خاں رامپوری (باغی ہندوستان ص ۴۴)

۱۱ــــ نواب کلب علی خاں رامپوری (؍؍ ص ۴۵)

۱۲ــــ مولانا محمد احسن گیلانی، جد امجد مولانا مناظر احسن گیلانی، (متوفی ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳-۴ء) (نزہتہ الخواطر، جلد ہشتم، از حکیم عبدالحئی لکھنوی ص ۴۰۸)

۱۳ــــ مولانا نور احمد بدایونی متوفی ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء (تذکرہ علمائے اہلسنت، از شاہ محمود احمد قادری ص ۲۵۱)

۱۴ــــ مولانا نور الحسن کاندھلوی۔ متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸-۹ء (حاشیہ تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۲۶۸)

تحریک آزادی ۱۹۵۷ء

علامہ محمد فضل حق خیر آبادی راسخ العقیدہ مسلمان اور بیدار دل و دماغ کے مالک تھے۔ انھوں نے قیام دہلی کے دوران اور اس کے بعد گہری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سفید چمڑی والے سیاہ باطن انگریز مسلمان کو معاشی طور پر مفلوج کر کے ان کی دینی حمیت

(بقیہ ص ۴۰۷ کا) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مملوکہ کرمی حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ العالی اس کی عبارت یہ ہے۔ "تنزیل التنذیر فی نظیر البشیر والنذیر" مصنفہ مولوی قلندر علی زبیری پانی پتی۔ شاگرد مولوی فضل حق خیر آبادی و شمس العلماء مولانا حالی، مطبع بدیاس جموں (کشمیر) ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء بزبان عربی صفحات ۱۰۸۔ سائز ۱۱" × ۱۴"، موجودہ کتب خانہ حکیم نور الدین بھیروی در مرکز لائبریری قادیان، مولوی محمد اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان میں لکھا تھا کہ خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر چاہے تو ایک آن میں کروڑوں انبیاء اولیا جو جبریل اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند ہوں، پیدا کر ڈالے۔ مولوی قلندر علی نے متذکرہ بالا رسالہ اپنے استاد مولوی فضل حق کی وصیت کی تعمیل میں اس عقیدہ کی تردید میں لکھا تھا۔ ۱۲

وغیرت ختم کر دینا چاہتے ہیں ۔ ذیل میں علامہ کے ایک نامکمل فارسی مکتوب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے ۔ جس میں انگریزی حکومت کے اوچھے ہتھکنڈوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۔ یہ مکتوب غالباً خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے نام ہے ۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس وقت کا ایک عالم دین حالات حاضرہ سے کس قدر باخبر اور اقتصادیات پر کتنی گہری نظر رکھتا تھا ۔ علامہ فرماتے ہیں :۔

> اس ملک کے باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ، ان میں کچھ کسان اور کاشت کار ہیں ۔ کچھ روزگار پیشہ ، کچھ تاجر اور اہل حرفہ ، کچھ لوگ لاخراجدار اور روزینہ دار ہیں ۔ کچھ کی معاش محض دریوزہ گری پر ہے ۔
>
> یہاں کے سکان باشندے بیشتر اور ہندو کمتر ایسے ہیں جو اپنا اصلی وطن ترک کر کے کسی زمانے میں یہاں آ کر آباد ہوئے ۔ جب تک ہندوستان کی حکومت بادشاہوں اور راجاؤں کے تصرف میں رہی ۔ اس ملک کے باشندوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہ تھی ۔ کیونکہ ہر قسم کی سرکاری خدمات خواہ وہ سپاہ کی نوکری ہو یا دوسری خدمات ، اس ملک کے باشندوں کے واسطے مختص تھیں ۔ اور یہاں کے باشندوں میں ہر شخص اپنے حوصلے اور لیاقت کے موافق تجارت ، حرفہ ، سپاہ یا مناصب میں اپنا روزگار پا لیتا تھا ۔ مگر جب سے انگریزوں کی عملداری ہوئی ہے ۔ اس وقت سے بتدریج معاش کی تنگی اور روزگار کا فقدان اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عوام کی حالت تباہ ہو گئی ہے کیونکہ انگریز سرکار کے زمانے میں معاش کے سارے وسائل مفقود ہیں ۔ اور روزگار کے دروازے بند ہو گئے ہیں ۔ سوائے معدودے چند لوگوں کے جنھیں عدالت ، دیوانی ، کلکٹری ، فوجداری پرمٹ ، تھانہ یا تحصیل کے عملے میں معمولی سی تنخواہ کی نوکری مل جاتی ہے ۔ وہ بھی اب دفتروں کے تبدیل ہونے اور سرکاری کام کا ڈھانچہ بدل جانے کے بعد ایسا نظر آ رہا ہے کہ ان لوگوں سے چھن جائے گی ۔

چنانچہ اس شہر کے باشندوں کا حال اور یہاں کے تاجروں کی کیفیت یہ ہے کہ سرکار انگریز نے تجارت کے سارے گر اپنے قبضے میں رکھے ہیں۔ اور تمام اجناس مثلاً کپڑا، سوت، برتن، گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ملک انگلستان سے لاتے ہیں۔ اور اس ملک کے ہر ہر شہر اور گاؤں میں فروخت کر کے خود نفع کماتے ہیں۔ اور یہاں کے باشندوں کو نفع اندوزی کا کوئی موقع نہیں دیتے۔ اس لئے ہمارے ملک کے تاجر اپنے پیشوں سے دستبردار ہو گئے ہیں۔

اور معافی داروں کا حال یہ ہے کہ ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۵ء کے قوانین کی رو سے اگرچہ انگریز سرکار نے عہد و پیمان کئے تھے، کہ ساری لاخراجی زمینیں جو یکم جنوری ۱۸۰۱ء اور یکم جنوری ۱۸۰۳ء سے پہلے لاخراجی دار کے تصرف میں ہو گی۔ چاہے وہ ان کی سند رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اور خواہ ان کے واہب کو عطا کا اختیار رہو یا نہ ہو۔ ایسی زمینوں کو ضبط نہ کیا جائے گا۔ مگر اب بغیر کسی تحقیقات کے ہر ضلع میں معافیاں ضبط کر لی گئیں۔ اور معافی داروں کے لئے کوئی وجہ معاش باقی نہیں چھوڑی۔

اور کسانوں کا یہ حال ہے کہ ان پر اتنے محاصل واجب کر دیئے گئے ہیں، کہ ان میں ادا کرنے کی سکت نہیں ہے۔ ان کی بے استطاعتی، اور بے مقدوری خود دفتر کلکٹر کے ریکارڈ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ پس جب کسی کے لئے اس ملک میں روزگار باقی نہ رہا۔ تو اب اہل حرفہ کس کے لئے کام کریں جو ان کا پیٹ بھرے۔ اور جب سارے ہی لوگ تنگیٔ معاش میں مبتلا ہوں تو بھیک منگے کو کون خیرات دے۔ یہ مختصر سی کیفیت رعایائے ہندوستان کی معاشی تنگی کی ہے۔

در علاقہ شاہجہان آباد کی رعایا کا اقتصادی حال بطور اجمال یہ ہے کہ ابتدائے عمل سرکار انگریزی میں ہوڈل، دیول وبتین و نجف گڑھ و سالکہ

وفیروز آباد و ڈیگ و لبونا ہانہ، و سانگرس و بجنور و سونی پت و گوہانہ و جرسوٹھ وکھرکھودہ و روہتک و ہم و ہانسی و حصار یہ سارے پرگنے جاگیر میں تھے۔ اور جاگیرداروں کی سرکار میں ہزارہا آدمی فوج، انتظامیہ اور شاگرد پیشہ کی خدمات پر مامور رہتے تھے۔ ان میں اکثر دیہات معافی کے تھے۔ اب یہ سب پرگنے، اور دیہات و آراضیات سرکار انگریز نے ضبط کرلی ہیں۔ اور لاکھوں کسان یکلخت بے روزگار ہو گئے۔ اور تمام عالم میں روزگار عنقا کی طرح ناپید ہوگیا۔ سینکڑوں بیوائیں اور محتاج اپنی روزی کا دارومدار چرخہ کاتنے، ریسمان بٹنے یا چکی پیسنے پر موقوف کئے ہوئے تھے۔ اب ریسمان کی تجارت سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں۔ تو یہ ذریعۂ معاش بھی جاتا رہا۔ اسی طرح اہل حرفہ اور ساہوکار عوام کی بے بضاعتی کے باعث نفع اندوزی سے محروم ہو گئے۔ اور جو کچھ سرمایہ ان کے پاس تھا کھا پی کر برابر کر دیا۔ اور اپنے دیوالے نکال دیئے۔

ان ساری دشواریوں کے باوجود سر چارلس مٹکاف بہادر کی پیشی سے حکم ہوا کہ ہم غریب "زرِ چوکیداری" ادا کریں۔ اگرچہ کبھی سلاطین کے زمانے میں یہ رسم نہیں ہوئی مگر "حکم حاکم مرگِ مفاجات" سمجھ کر اسے بھی قبول کیا۔ اور اب تک ادا کرتے رہے۔ اب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا نیا حکم آیا ہے جس میں انھوں نے ہر گلی کوچہ میں پھاٹک تیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس کا فائدہ نہ پہلے کچھ تھا نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ ہم غریبوں نے فاقہ کشی کی مصیبت جھیل کر سامان گروی رکھ کر یا بیچ کھوچ کر ہزارہا روپیہ خرچ کیا اور اس حکم کی تعمیل بھی کر دی۔ اب ان نوتعمیر پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات یا چوکیدار کے تساہل سے ہم لوگوں کو آئے دن تکلیف کا سامنا ہے مگر اسے بھی جھیل لیا۔ اس خبر کے علاوہ اب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے ہر محلہ میں پانچ پانچ پنچوں کے مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔" لہ

(حاشیہ اگلے صفحہ)

اس طویل مگر نامکمل مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی حکومت نے اہل ہند کو بے بس اور لاچار بنانے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کئے۔ اور مجبور انسانوں کو کس طرح بے دست و پا بنایا۔ علامہ کے نزدیک تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء کے یہی عوامل تھے جن کی بناء پر مجاہدین کفن بر دوش میدان عمل میں نکل آئے تھے علامہ نے اپنی داستانِ اسیری میں بڑے اختصار اور جامعیت سے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

۱۔ انگریزوں نے بچوں کو اپنا دین اور اپنی زبان سکھلانے کے لئے جگہ جگہ اسکول کھولے اور دینی مدارس کو ختم کرنے کے لئے پوری کوشش کی۔

۲۔ ملک کی تمام پیداوار خرید کر غلے کی قیمت اور سپلائی پر اجارہ داری قائم کر لی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خلق خدا ہماری دست نگر ہو جائے۔ اور بے چون و چرا ہمارے احکام کی تعمیل کرے۔

۳۔ مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنے اور پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانے کی کوشش کی

۴۔ مسلمانوں کو سور کی چربی والے اور ہندوؤں کو گائے کی چربی والے کارتوس دیئے گئے جو منہ سے کاٹنے پڑتے تھے۔ ان کی نظر میں اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کا یہی طریقہ تھا کہ مذہبی اختلافات ختم کر کے تمام رعایا کو ملت کفر و الحاد پر متفق کر دیا جائے[۱]

علامہ فضل حق کا تحریکِ آزادی میں حصہ

اس تجزیئے کے پیش نظر کون سا ایسا مسلمان ہوگا جو انگریزوں سے متنفر اور بیزار نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ کے دل کے کسی گوشہ میں انگریزوں سے محبت اور ہمدردی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی بلکہ علامہ "قصائد فتنۃ الہند" میں تو یہاں تک فرماتے ہیں :۔

"نص قرآنی سے ثابت ہے کہ ان کی محبت کفر ہے۔ کسی حق پرست انسان کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا، نصاریٰ سے محبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے

(بقیہ صـ۴۱۱ کا) نثار احمد فاروقی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط سہ ماہی رسالہ نوائے ادب بمبئی ص ۴۲-۴۹

[۱] محمد فضل حق خیرآبادی علامہ، الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) ص ۱۵۶ - ۱۶۰

جب کہ یہ لوگ اس ذات اقدس (صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے دشمن ہیں۔
جن کے طفیل ارض وسما پیدا کئے گئے"۔[1]

جنگِ آزادی کی ابتدا رمئی، ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ اس وقت علامہ محمد فضل حق خیرآبادی، الور میں مقیم تھے۔ انھیں خاص طور پر دہلی سے بلایا گیا۔ علاّمہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

واذ کان فی دھلی کثیر من عیالی و اھلی ومع ذلک
کنت مدعوّا وکان الفلاح والافلاح مرجوا والفرج
والفرح مظنونا[2]

"چونکہ دہلی میں میرے بہت سارے اہل وعیال تھے۔ اس کے باوجود مجھے بلایا بھی گیا تھا اور کامیابی وکامرانی کی قوی امید تھی"۔

یہ امر تو باغی ہندوستان کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ بہادر شاہ ظفر کے علامہ کے ساتھ گہرے مراسم تھے اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ صلاح ومشورہ کے لئے انھوں نے ہی علامہ کو بلایا ہوگا۔

اُس دور کے روزنامچوں سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ شریکِ دربار ہوتے رہے۔ اور اپنے مشوروں سے راہنمائی کرتے رہے۔ اس زمانے کی پوری تفصیل نہ تو روزنامچوں سے ملتی ہے اور نہ ہی علامہ نے اسے قلبند کیا۔ صرف اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ علامہ فرماتے ہیں:۔

واشرت الی الناس بما اقتضی رائی وقضی بہ عقلی
فلم یأتمروا بما اشرت[2]

"اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا۔ لیکن نہ انھوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی"۔

ظاہر ہے کہ علاّمہ ایسا مفکر صحیح رائے اور فکرِ صائب ہی سے راہنمائی کر سکتا تھا اور یہ بھی مسلم ہے کہ میدان جنگ میں لڑنے والی فوج وہ کام نہیں کر سکتی جو ایک دانشور

---

[1] محمد فضل حق خیرآبادی۔ علامہ: قصائدِ فتنۃ الہند ص ۴۴۸ [2] ایضاً الثورۃ الہندیہ ص ۳۷۸

کی راہنمائی کر سکتی ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

”میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا۔ اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا۔ میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا۔ یہ میں نے بڑا جرم کیا جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لئے پکارا تو میں حاضر نہ ہوا۔ یا میں شہادت سے محروم رہا۔ جب کہ سعادتمندوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔“ [1]

اس اقتباس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو صرف اس بات کا افسوس تھا کہ وہ عملی جہاد میں حصہ لے کر جامِ شہادت نوش نہ کر سکے۔ ورنہ وہ ترغیب جہاد اور فکری راہنمائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اسیری اور جلا وطنی کی موت نے شوق شہادت بھی پورا کر دیا۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ علامہ دہلی سے اپنے اہل و عیال کو لے کر چلے نہیں گئے بلکہ انگریزوں کے تسلط کے بعد بھی پانچ دن تک وہیں ٹھہرے رہے۔ اگر علامہ کا تحریک آزادی سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ تو اتنی دیر وہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ فوراً کسی اور جگہ چلے جانا چاہیے تھا۔

سوءِ اتفاق کہ منظم تیاری نہ ہونے اور اپنوں کی غداری اور غفلت کی وجہ سے انگریز دہلی پر مسلط ہو گئے۔ اور جی بھر کر خونریزی کی۔ اس دوران علامہ پانچ دن بھوکے پیاسے دہلی میں رہے۔ پھر اہل و عیال سمیت چھپتے چھپاتے خیرآباد پہنچ گئے۔ سقوطِ دہلی کے باوجود اودھ کی ملکہ حضرت محل نے کمال جرارت و ہمت کا مظاہرہ کیا۔ بھاگ کر آنے والے فوجیوں کو پناہ دی اور شمالی علاقے میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قیام پذیر ہو گئیں۔ افواج کو علاقہ کا انتظام کرنے اور دریا کے گھاٹوں پر حفاظت کے لئے متعین کر دیا۔ اور انھیں حکم دیا کہ اگر دشمن اس طرف رخ کرے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔

---

[1] محمد فضل حق خیرآبادی: علامہ، قصائد فتنۃ الہند، ص ۳۵۶۔

علامہ اس جگہ بھی مشیرِ خاص کے طور پر شریک ہوئے۔

علامہ پر قائم کردہ مقدمہ کی رپورٹ میں لکھا ہے:۔

"یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیرانِ خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی "اربعہ شوریٰ" کے نام سے شہرت تھی بلکہ کبھی کبھی انھیں "کچہری پارلیمنٹ" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم (علامہ فضل حق) بہت ممتاز تھا۔"[1]

فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے:۔

وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے انصاف اور امن عامّہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔"[2]

علامہ پر الزام قائم کیا گیا کہ انھوں نے بیگم حضرت محل کے مشیر ہونے کی حیثیت سے بوندی میں دو ایسے شخصوں کے قتل کا فتویٰ دیا تھا جو انگریز کے وفادار تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص عبدالحکیم نے بیان دیتے ہوئے کہا:۔

"مجھے ممّو خاں اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا۔ ممّو خاں نے مولانا فضل حق سے دریافت کیا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مولانا نے فتویٰ دیا کہ یہ شخص فرنگیوں کا ملازم ہے۔ اس لئے سزائے موت کا مستحق ہے۔"[3]

خود علّامہ نے صحیح صورتِ حال کا انکشاف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تند خو افراد (عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین) نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مُصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔"[4]

علامہ فضل حق خیرآبادی نے اپنی تحریرات میں اپنے مجاہدانہ کارناموں کو اجاگر

---

[1] ماہنامہ تحریک دہلی: شمارہ جون ۱۹۶۰ء، ص ۱۶ [2] ایضاً ص ۱۶ [3] ایضاً ص ۱۰
[4] محمد فضل حق خیرآبادی، علامہ: الثورة الہندیہ ص ۴۱۷۔

کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ضمناً اشارۃً کوئی بات آگئی ہو۔ بوندی مین بیگم حضرت محل کے مشیر ہونے کی حیثیت سے اپنی کارروائی کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔ جب کہ قیام دہلی کے بارے میں کئی باتیں کہہ گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سرگرمیاں بوندی کی نسبت دہلی میں زیادہ تھیں۔

مسٹر جارج کیمبل جوڈیشنل کمشنر اودھ اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیر آباد نے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا:۔

> ”بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے دیدہ و دانستہ دہلی آیا۔ اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے۔ اور اسے خاص طور پر، ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔“ [1]

اپیلوں اور کوششوں کے باوجود جلاوطنی کا فیصلہ بحال رہا۔ اور علامہ کو کلکتہ سے فائر کوئین نامی جہاز میں سوار کر کے انڈیمان بھیج دیا گیا۔ یہ جہاز ۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہونچا۔ [2]

فتوائے جہاد

علامہ فضل حق خیر آبادی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے نامور مجاہد تھے۔ یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک عرصہ تک ان کے فتوائے جہاد میں شریک ہونے کو بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کیا جاتا رہا۔ قریباً جس نے بھی علامہ کا ذکر کیا ہے اس فتوے کا ضرور ذکر کیا ہے۔ مثلاً عبد الشاہد خاں شروانی نے باغی ہندوستان ص ۱۵۶، مولانا حسین احمد مدنی نے نقش حیات جلد دوم ص ۴۶، مفتی انتظام اللہ شہابی نے ”ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء“ ص اور ”مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء“ ص ۳۷۔ غلام رسول مہر نے ”اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد“ ص ۲۰۶، پروفیسر محمد ایوب قادری نے ”مولانا فیض احمد بدایونی“ ص ۲۱، ۲۲۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنے ایک مضمون ”مولانا فضل حق خیر آبادی

---

[1] ماہنامہ تحریک دہلی: ص ۱۷

[2] ایضاً: ص ۲۰۔

"سراپا فضل، سراپا حق، سراپا خیر" (ہفت روزہ زندگی (اذان حق) شمارہ ۱۲؍ نومبر ۱۹۷۲ء) میں مولانا عبدالسلام ندوی نے "حکمائے اسلام" جلد دوم ص ۳۲۳ میں۔ اور مولانا ریاست علی نے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ (اکتوبر ۱۹۴۴ء) ص ۳۱۲ میں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ماضی قریب میں بعض لوگوں نے علامہ کے فتوائے جہاد کا انکار کیا ہے (جس کا تنقیدی جائزہ اس ایڈیشن میں شامل کتاب ہے) —— علامہ فضل حق خیرآبادی کے ساتھ یہ ٹریجڈی ہوئی کہ اول تو ان کی حیات پر بہت کم کام کیا گیا۔

دوسری طرف بعض مؤرخین نے مذہبی مخالفت کی بنا پر ان پر رکیک حملے کئے اور ان کے بلند کردار کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جناب نادم سیتاپوری نے بجا لکھا ہے:۔

> "مولانا فضل حق خیرآبادی گذشتہ انقلابی صدی کا وہ بدنصیب کردار ہے جسے دشمنوں سے زیادہ دوستوں نے نقصان پہنچایا۔ انگریز اور ان کے ہواخواہ تو مولانا سے اس لئے ناراض تھے کہ انقلاب سن ستاون کے سلسلہ میں کسی نہ کسی نہج سے ان کا نام آگیا تھا، لیکن خود مسلمانوں کا ایک "پروپیگنڈسٹ گروپ" مولانا سے اس لئے بیزار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ یہ باوقار علمی مباحثہ کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔
>
> مولانا کے اکثر سیرت نگاروں نے نادانستہ نہیں، دانستہ مولانا کی مدح اس انداز سے کی کہ خود "مدح" اور "ہجو ملیح" سر بگریباں ہو گئے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج جب ریسرچ اور تحقیق کی نگاہیں تاریخ کے ان اوراق تک پہنچیں، تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی"۔[1]

---

[1] نادم سیتاپوری۔ غالب نام آورم۔ طبع لاہور ۱۹۶۹ء ص ۱۰۱

مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری کا ایک مقالہ "مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتوائے جہاد" ماہنامہ تحریک دہلی میں اگست ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا جس میں انھوں نے علامہ کے فتوائے جہاد جاری کرنے، جج کے سامنے اقرار جرم کرنے اور جج کے بادل ناخواستہ حبس دوام کا فیصلہ کرنے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس ضمن میں انھوں نے نواب یوسف علی خاں والئ رامپور کے نام علامہ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر تین الزام قائم کئے گئے تھے۔

۱ — نواب خاں بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا۔ اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

۲ — جب انگریزوں نے بریلی فتح کر لی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار (منتظم) مقرر ہوئے۔

۳ — مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔[۱]

اس مکتوب کو تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ علامہ کا تحریک آزادی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ ایک دوسرے شخص فضل حق شاہجہاں پوری کے شبہے میں انھیں اسیری اور جلاوطنی کے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ جیسا کہ مولانا عرشی نے یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں چند امور قابل توجہ ہیں:۔

۱ — علامہ فضل حق خیرآبادی کا جنگ آزادی میں حصہ لینا مسلمات سے ہے۔ لہٰذا اسے جھٹلانے کے لئے اس مکتوب کا عکس شائع کرنا ضروری تھا۔[۲]

۲ — جناب مالک رام نے علامہ کے مقدمے کی کارروائی ماہنامہ تحریک دہلی کے شمارہ جون ۱۹۶۰ء میں شائع کرا دی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ پر مذکورہ بالا الزامات میں سے کوئی الزام بھی قائم نہیں کیا گیا۔ بلکہ مخبروں کے بیانات

---

[۱] امتیاز علی عرشی رامپوری: ماہنامہ تحریک دہلی۔ اگست ۱۹۵۷ء

[۲] اس ایڈیشن میں مولانا عبدالشاہد شروانی لکھ چکے ہیں کہ وہ مکتوب میں دیکھ چکا ہوں۔ علامہ کا خط نہیں ۱۲ محمد احمد مصباحی۔

سے ثابت ہونے والے الزامات کی بنا پر ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کیا گیا۔ جن کا تعلق بوندی (اودھ) کے ساتھ تھا۔ بریلی یا محمدی کے واقعات سے نہ تھا۔ الثورۃ الہندیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

۳ — مولانا عرشی نے علامہ کے شریک فتویٰ نہ ہونے کے ضمن میں کہا ہے:۔

> "مولانا نے علمائے زہاد اور ائمۂ اجتہاد کے فتوے دینے کا تو ذکر کیا ہے۔ مگر اپنا حوالہ بالکل نہیں دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شریک فتویٰ بھی ہوتے تو جیسا کہ آگے چل کر (ص ۸، ۲۷ پر) ارباب حکومت کو اپنے مشورے دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ یہاں بھی فتوے کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور کرتے"۔[1]

اسی طرح یہاں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر علامہ تحریکِ آزادی سے یکسر علیحدہ ہوتے اور ان کے خلاف تمام کارروائی محض اشتباہ کی وجہ سے ہوئی ہوتی تو علامہ اپنی نجی خود نوشت الثورۃ الہندیہ میں ضرور اپنی "بے گناہی" کا تذکرہ کرتے۔ حالانکہ انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ انھوں نے قید و بند کی دو وجہیں بیان کی ہیں:۔

(۱) انگریزوں کو اس بات کا علم تھا کہ میں ایمان و اسلام میں راسخ العقیدہ ہوں۔ اور علامۂ وقت ہونے کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہوں۔ مجھے سزا دینے کا مقصد یہ تھا کہ علم دین کے آثار کو صفحات کتب سے بھی مٹا دیا جائے۔[2]

(۲) حاکم نصرانی کے سامنے دو مرتد، سخت دل دشمنوں (عبد الحکیم اور مرتضیٰ حسین) نے چغلی کھائی۔ وہ دونوں میرے ساتھ قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ کے بارے میں جھگڑا کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ اور ان دونوں کو نصاریٰ کی دوستی پر اصرار تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایمان کے بدلے کفر اپنا لیا۔[3]

۴ — علامہ کا اشتباہ کی بنا پر اسیر ہونا اس اعتبار سے بھی محل نظر ہے کہ علامہ کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ دہلی وغیرہ میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے۔ مسٹر جارج کیمبل،

---

[1] امتیاز علی عرشی رامپوری۔ ماہنامہ تحریک دہلی۔ اگست، ۱۹۵۷ء

[2] محمد فضل حق خیر آبادی علامہ: الثورۃ الہندیہ ص ۳۵۴، ۳۵۵ [3] ایضاً۔ ص ۳۱۷۔

اور مسٹر باروے نے اپنے فیصلے میں لکھا:

"ایک زمانے میں وہ خود بھی سرکاری ملازمت ترک کر کے اودھ، رام پور، الور وغیرہ متعدد دیسی ریاستوں میں معقول عہدوں پر ممتاز رہا ہے۔ اس کی ہمیشہ بہت شہرت رہی ہے۔ جن گواہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ بھی مولوی فضل حق کا نام اکثر سنتے آئے تھے۔" [1]

بلکہ یہ بھی لکھا کہ:

"اس نے مقدمے کے دوران ایک موقع پر یہ صفائی پیش کی تھی کہ اودھ میں دو مشہور فضل حق ہیں۔ لیکن یہ بات صاف ہو گئی کہ وہ دوسرا شخص (فضل حق شاہجہاں پوری) ضلع بریلی کا تحصیلدار رہا ہے۔ اور پچھلے دنوں چکلہ دار اور باغیوں کا سرغنہ رہا ہے۔ لیکن ملزم تو کبھی صاحب سیف رہا ہی نہیں بلکہ اس کی ہمیشہ صاحب رائے و مشورہ کی حیثیت سے شہرت رہی ہے۔" [2]

جناب ڈاکٹر محمد ریاض اپنے ایک مضمون میں مالک رام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولوی فضل حق اتنا مسکین آدمی نہیں تھا کہ اسے کسی دوسرے شخص کے بدلے میں عمر قید کی سزا دی جاتی۔ اور اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ شاید انھیں (مالک رام وغیرہ کو) یہ معلوم نہیں کہ اس کا چھوٹا بھائی سردار فضل الرحمٰن ریاست پٹیالہ کا وزیر تھا اور نواب والاجاہ بہادر آف کرناٹک اس کا عزیز قریب تھا۔ اور نواب سید برکت علی خاں بہادر جو انگریز سرکار میں بڑا مقتدر تھا۔ اس کا بھانجہ تھا۔ کیا یہ سب حضرات اتنے سنگ دل ہو گئے تھے کہ اپنے خاص اثرات، خاندان کے ایک بزرگ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے استعمال نہیں کر سکتے تھے؟" [3]

انگریز حکومت اگر چاہتی تو مقدمہ چلائے بغیر علامہ کو کوئی بھی سزا دے سکتی تھی۔ لیکن

---

[1] ماہنامہ تحریک دہلی: شمارہ جون ۱۹۶۰ء، ص ۱۷ [2] ایضاً ص ۱۶

[3] محمد ریاض، ڈاکٹر، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، ماہِ نو کراچی، مئی ۱۹۶۹ء، ص ۵۴۔

اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ تحقیق و تفتیش کے بعد عائد کردہ الزامات کے ثابت ہو جانے اور اشتباہ کے صاف ہو جانے پر فیصلہ صادر کیا۔ ان امور کی بنا پر مولانا عرشی کے نقل کردہ مکتوب کی اصلیت مشکوک ہو جاتی ہے۔

۵ــــ مولانا عرشی رامپوری نے فتوائے جہاد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :-

> "اس وقت کے حالات کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دستخط کرنے والوں میں کچھ اہلِ علم ایسے بھی تھے جو دل و جان سے انگریزی تسلّط کے مخالف تھے۔ اور انگریزوں کے خلاف جنگ کو مذہباً ضروری جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے یہ فتویٰ مرتب کیا اور اپنے اختیار اور رضامندی سے دستخط کئے۔ بقیہ نے مجبوراً توثیق کی۔ شکست کے بعد جان بچانے کی صرف یہی ایک تدبیر تھی کہ جبر کی پناہ لی جائے۔ اس بنا پر جس سے باز پرس ہوئی، اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔"[1]

اگر مولانا عرشی کے نقل کردہ مکتوب کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ علامہ نے بھی جان بچانے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی ہو کہ فضل حق دو ہیں۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ جسے مجرم گردانا جا رہا ہے وہ میں ہی ہوں؟

حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کے پوتے نواب خاں بہادر خاں شہید جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کے ممتاز مجاہدین میں شمار ہوتے ہیں۔ جناب سید مصطفٰی علی بریلوی نے اپنی تالیف "نواب خان بہادر خاں شہید" (طبع آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی) میں ان کے مجاہدانہ کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اور تفصیلاً بیان کیا ہے کہ نواب خاں بہادر خاں نے کس طرح افواج کو منظم کیا، اور کس طرح انگریزی افواج کے مقابل دادِ شجاعت دی۔ اور کیونکر گرفتار ہو کر تختۂ دار پر چڑھائے گئے۔

لیکن جب خان بہادر شہید پر مقدمہ چلایا گیا تو انھوں نے جنگِ آزادی سے اپنی برارت کا اظہار کیا۔ جناب نادم سیتاپوری نے لاہور کے قدیم اخبار کوہِ نور کی فائل سے

---

[1] ماہنامہ تحریک دہلی۔ اگست، ۱۹۵۷ء

نواب خان بہادر شہید کے مقدمہ کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔ نواب صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے:

> "جب تک فوج باغی بریلی میں رہی کسی نے اطاعت نہیں کی۔ اور میرے پاس فوج نہ تھی کہ ان کو شرارت سے باز رکھتا۔ میں نے کسی صاحب بہادر کے مارے جانے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ میں نے ملک کو بدمعاشوں کی یورشوں سے بچانے کے واسطے کوششیں کیں۔ میں بیکس تھا اور انتظام شریروں کا نہ کر سکا۔ انھوں نے میرے حکم کو نہیں مانا بلکہ وے سب مرضی خود (پر) کاربند رہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ ایک اشتہار بھی درباب قتل صاحبان انگریزی کے جاری ہوا تھا۔ وے کہتے تھے کہ فرنگی اب نہیں آویں گے۔ جب میں نے آمد آمد انگریزوں کی سنی تو میں فوراً بریلی سے نکل گیا۔ اور فوج انگریزی سے صف آرا نہیں ہوا۔" [1]

کیا نواب صاحب کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ انھوں نے پہلی جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ نواب خان بہادر شہید نے اپنی جان بچانے کی خاطر یہ بیان دیا تھا تو علامہ کے بارے میں یہی توجیہ کیوں قابل قبول نہیں ہو سکتی۔؟

۶۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کو بھی تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس بارے میں مستند مواد دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن ان کے معتقدین جوشِ عقیدت کی بنا پر انھیں صف مجاہدین میں شامل کرنے پر مُصر ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:۔

> "ان بزرگوں (مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی) نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں حصہ لیا تھا۔ انسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں۔" [2]

---

[1] سہ ماہی رسالہ العلم : اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۱ء، ص ۲۱

[2] غلام رسول مہر : اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد، ص ۲۵۰

جہاں تک ان کے سوانح نگار مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان ہے۔ اس سے قطعاً یہ پتہ نہیں چلتا کہ مولانا گنگوہی جنگ آزادی میں شریک تھے۔ بلکہ ان کے بیان سے تو "خیر خواہ سرکار" ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی جنگ آزادی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"بدنصیب خانماں برباد بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کا وہ بلاخیز سماں تھا۔ جس میں کارتوسوں پر چربی لپیٹنے کی جھوٹی افواہ اڑی اور غدر برپا کرنے کے چھپے کھلے مجمعوں میں چرچے شروع ہوئے تھے۔ تباہ ہونے والی رعایا کی نحوست تقدیر نے ان کو جو کچھ سمجھایا اس کا انھوں نے نتیجہ دیکھا اور ان کی نسل دیکھ رہی ہے جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی۔ انھوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا۔ اور اپنی رحمدل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا عَلَم قائم کیا۔" [1]

تحریک آزادی کا دَور گزر گیا تو بعض لوگوں نے کسی مخاصمت کی بنا پر مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے "باغی" ہونے کی مخبری کر دی۔ مولانا عاشق الٰہی کے الفاظ یہ ہیں:-

"جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا۔ اور رحمدل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں۔ انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا۔" [2]

حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ:-

"یہ حضرات حقیقۃً بے گناہ تھے۔ مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی و مفسد اور مجرم و سرکاری خطاوار ٹھیرا رکھا تھا۔ اس لئے گرفتاری کی تلاش تھی مگر حق تعالیٰ کی حفاظت بر سر تھی۔ اس لئے کوئی آنچ نہ آئی۔ اور جیسا کہ آپ حضرات

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، جلد دوم (طبع ثانی) ص ۷۳۔ [2] ایضاً ص ۷۶۔

اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے۔ تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔"[1]

ان دنوں خوف و ہراس کی لہر ہر شخص کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ مولانا گنگوہی کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا نام بھی قابل اخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ:۔

"آپ کوہ استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے۔ اسے اختیار ہے، جو چاہے کرے۔"[2]

ایک دفعہ مولانا گنگوہی، مولانا نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، اور حافظ ضامن کہیں جا رہے تھے کہ باغیوں کا سامنا ہو گیا۔ پھر کیا ہوا۔ مولانا عاشق الٰہی کی زبان سنئے:۔

"یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا۔ اور سرکار پر جاں نثاری کے لئے طیار ہو گیا۔"[3]

مولانا گنگوہی کو مظفر نگر کی عدالت میں پیش کیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا۔ اور فساد کیا۔ تو انھوں نے کہا "ہمارا کام فساد کا نہیں، نہ ہم مفسدوں کے ساتھی ہیں"[4] تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ انھیں بغاوت سے کوئی تعلق نہیں تو رہا کر دئے گئے۔

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید جلد دوم، ص ۷۰، [2] ایضاً: ص ۸۰۔

[3] ایضاً: ص ۷۵، (نوٹ) مولانا مہر نے علمائے دیوبند کو مجاہد ثابت کرنے کے لئے اس عبارت کی عجیب توجیہ کی ہے فرماتے ہیں "مبادا "سرکار کے باغیوں" کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو۔ یہاں سرکار سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرفدار ہو کر آئے تھے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۲۵۴) ہمیں اس توجیہ میں سوائے غلو فی العقیدت کے اور کچھ دکھائی نہیں دیا جس توجیہ کو مولانا مہر قطعی طور پر صحیح قرار دے رہے ہیں۔ ہماری سمجھ سے دور ہے۔ کیونکہ اس جتھے میں خود حاجی صاحب بھی شریک تھے جو بقول مولانا میرٹھی "اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ تو کیا حضرت حاجی صاحب اپنی سرکار آپ تھے یا للعجب!! شرف قادری۔ [4] عاشق الٰہی میرٹھی۔ تذکرۃ الرشید جلد دوم۔ ص ۸۵۔

علامہ فضل حق خیر آبادی اور نواب خان بہادر خاں کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ظالم و جابر حاکم کے سامنے، جان بچانے کی خاطر ایسی باتیں کہہ دیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا تحریکِ آزادی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن مولانا گنگوہی تو ظالم حاکم کے سامنے نہیں بلکہ اپنی جگہ یہ کہہ رہے ہیں "اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے" ایسے ارشادات کے باوجود اگر مولانا گنگوہی مجاہدین میں شامل ہیں تو علامہ فضل حق خیر آبادی کا کیا قصور رہے کہ انھیں یک قلم تحریک سے غیر متعلق قرار دیا جائے۔ ؟

مولانا گنگوہی بے قصور ثابت ہونے تک چھ ماہ قید میں رہے۔ مولانا نانوتوی کے گرفتار ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔ لیکن علامہ خیر آبادی کے جلا وطن ہونے اور غریب الوطنی کی حالت میں انڈمان میں وصال فرمانے میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔؟ ان کا جہادِ آزادی سے کسی قسم کا تعلق ثابت نہ بھی ہو تو ان کے شہید ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت کے جور و تشدد کا تختۂ مشق بنے اور جلا وطنی میں مالکِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہو گئے۔

غالب کے مشہور محقق مالک رام نے علامہ فضل حق خیر آبادی کے مقدمہ کا فیصلہ اپنے مضمون میں ماہنامہ تحریک، دہلی جون ۱۹۶۰ء میں پیش کیا ہے۔ اور اس بنا پر کہ علامہ فتوائے دہلی میں شامل نہیں ہوئے۔ (کیونکہ اس وقت دہلی میں موجود ہی نہ تھے۔) اور انھوں نے ایک موقعہ پر یہ بیان دیا تھا کہ دوسرے شخص کے شبہے کی بنا پر میرے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے۔ یہ نظریہ قائم کر لیا کہ:

> "مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انھوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو (اور اس کی طرف انھوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے) لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے، انھوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار اٹھائی۔"[1]

---

[1] مالک رام، ماہنامہ تحریک دہلی، ص ۲۵۔

تفصیل سابق کو کافی سمجھتے ہوئے اس جگہ جناب نادم سیتاپوری کی ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:۔

"آج کی نئی ریسرچ و تحقیق نے محققانہ زاویۂ نگاہ سے کم، ایرادی اور جوابی نقطۂ نظر سے زیادہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ مولانا خیرآبادی نے اس جنگِ آزادی میں کسی قسم کا حصّہ لیا ہے۔ اس سلسلہ میں کئی مضامین سامنے آچکے ہیں جن کی فاضلانہ اور محققانہ بصیرت افروزی کے اعتراف کے باوجود میں اپنے آپ کو اس زاویۂ نگاہ سے متفق نہیں کر سکا۔" [1]

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے مجاہدانہ کارناموں کا سب سے زیادہ مستند ماخذ علامہ کا عربی رسالہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند ہیں۔ جناب نادم سیتاپوری نے انھیں مشکوک قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"جس زمانے میں کوئلہ اور پنسل کے لکھے ہوئے یہ منتشر پرچے شمس العلماء مولوی عبدالحق کو پہنچے تو اس زمانے میں وہ اپنے بوڑھے باپ کی رہائی کے لئے کوشاں تھے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ منتشر پرچے ایک سیاسی قیدی کے ساتھ صحیح وسلامت حالت میں جزائر انڈمان سے ہندوستان کے ساحل تک پہنچ گئے۔ تو بھی یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کہ ان کی ترتیب و تدوین کے وقت شمس العلماء مولوی عبدالحق نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہو کہ یہ اوراق اگر حکومتِ ہند تک پہنچ گئے، تو مولانا کی رہائی دشوار ہی نہیں محال ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں اس کا قوی امکان ہے کہ ان کتابوں میں کچھ نہ کچھ تحریف ضرور کی گئی۔ وہ تحریف یا ترمیم یا اضافہ کیا تھا؟ اس کے بارے میں قطعی طور پر تو کوئی بات کہی نہیں جا سکتی لیکن روایت بالا (کہ رسالہ اور قصائد مختلف پرزوں پر کوئلہ سے لکھے ہوئے تھے) کی روشنی میں انھیں کلیۃً مولانا کی تصنیف سمجھنا ایک حل طلب معمہ ضرور ہے۔" [2]

---

[1] نادم سیتاپوری۔ غالب نام آورم، ص ۱۰۸، ۱۰۹

[2] ایضاً : ص ۱۲۴

پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس روایت کی تردید کی ہے کہ رسالہ اور قصائد کوئلے سے مختلف پرزوں پر لکھے ہوئے تھے۔ کیونکہ جزائر انڈمان اور نکوبار میں دفتر قائم ہو چکا تھا اسکول کھل چکا تھا۔ عدالتی کارروائیاں جاری تھیں۔ وہاں کے انگریز حکام کی اجازت سے تصنیف و تالیف کا کام جاری تھا۔ تو پھر کوئلے سے لکھنے کا کیا قرینہ ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نادم سیتاپوری کی تشکیک کا محاسبہ کیا ہے۔ ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:-

۱ـــ داخلی یا خارجی شواہد پیش کئے بغیر محض ظن و تخمین سے قصائد کو مشکوک قرار دینا درست نہیں ہے۔

۲ـــ مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی انڈمان سے رہا ہو کر آئے تو اپنے ساتھ اپنی تین کتابیں لائے جن میں سے تواریخ حبیب الٰہ اور علم الصیغہ شائع ہو کر مقبول عام ہوئیں جب یہ تین کتابیں بحفاظت پہنچ گئیں تو رسالہ اور قصائد کے پہنچنے سے کیا مانع تھا؟

۳ـــ ۱۲۷۷ھ میں مفتی عنایت احمد کاکوروی رہا ہو کر آئے۔ ایک دو ماہ بعد رسالہ، اور قصائد مولانا کو پہنچے ہوں گے۔ ۱۲/صفر ۱۲۷۸ھ کو علامہ فضل حق کا وصال ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ مولانا عبدالحق نے علامہ کے وصال کے بعد رسالہ و قصائد کی طرف توجہ دی ہوگی۔ لہٰذا علامہ کی رہائی کے لئے کوشش ان کی ترتیب سے مانع نہ ہوئی ہوگی۔

۴ـــ یہ رسالہ اور قصائد مولانا عبدالحق کی زندگی میں شائع نہیں ہوئے۔ لہٰذا حکومت کے خوف کی بنا پر تحریف و ترمیم کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

۵ـــ اس رسالہ و قصائد میں حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اگر حکومت کے خوف سے ترمیم کی گئی ہوتی تو لب و لہجہ نرم ہوتا۔[1]

آخر خاتم الحکماء، مجاہد جلیل مولانا فضل حق خیرآبادی نے ایک سال نو ماہ ۱۹ دن جزیرۂ انڈمان میں سیاسی قیدی رہ کر ۱۲/صفر - ۲۰/اگست (۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کو جام شہادت نوش کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و ارضاہ[2]

---

[1] محمد ایوب قادری جزائر انڈمان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات سہ ماہی اردو جنوری ۱۹۶۸ء ص ۶۳ - ۶۴ -

[2] نادم سیتاپوری - غالب نام آورم، ص ۱۲۱

خان بہادر سید مسعود حسن مسعود نے تاریخ وفات کہی :

باعمل سے تھے حضرت فضل حق　　　کر دیا نیرنگ نے جینا محال
انڈمن کو لے گئی قید فرنگ　　　ہو گیا آخر وہیں پہ انتقال
سال ہے مسعود "بے ہادئی ہند"
فضل حق خیرآبادی باکمال [1]
۶۱ ھ ۱۸

مولانا محمد سعید حسرت (م ۱۳۰۴ھ) مرید مولانا نذر محمد لاہوری خلیفہ سید احمد بریلوی نے عربی میں قطعۂ تاریخ کہا :-

قد توفی الالہ فضل الحق　　　عالماً جیداً بلا ریب
ان نفاہ الولاۃ من بلدہ　　　بجفاء فلیس من عیب
قال تاریخہ " لا ادرکہ　　　فضل حق "ھو الف الغیب
۷۸ ھ ۱۲

(ولہ ایضاً) مادہ مذکورہ کی فارسی میں تضمین کی ہے :-

مولوی فضل حق چو رحلت کرد　　　جنتی گشت، نیست ریب مرا
گفت تاریخ " لا ادرکہ　　　فَضْلُ حَقّ " سروش غیب مرا [2]
۷۸ ھ ۱۲

شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تحریک

شاہ اسماعیل دہلوی اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے مسلکی اختلاف سے متعلق کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان حضرات کا اختلاف صحابۂ کرام کے مشاجرات کی طرح تھا، اور یہ اختلاف علمی و فروعی نوعیت کا حامل تھا۔ حالانکہ فریقین کی تصانیف کے مطالعہ سے ہر انصاف پسند

---

[1] مسعود حسن مسعود، عندلیب تواریخ (ادارہ انیس الہ آباد) ص ۱۱۰۔

[2] محمد سعید حسرت، قسطاس البلاغہ (مطبوعہ احسن المطابع عظیم آباد ۱۳۰۰ھ) ص ۲۱۰

اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ اختلاف صرف علمی نہیں بلکہ اصولی اور اعتقادی تھا۔ اور ایسے اختلاف کے ہوتے ہوئے ہر دو فریق کو حق پر نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا عبدالشاہد (جو اسماعیل دہلوی کے بھی نیاز مند و معتقد رہ چکے ہیں) بھی مانتے ہیں کہ شاہ اسماعیل نے غلو اور تشدد سے کام لیا۔ اور تقویۃ الایمان میں ان امور کو جو شرک خفی تھے شرک جلی لکھ دیا۔[1] اور ان تحریرات سے متوقع شورش کے بارے میں یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ:

"گو اس سے شورش ہو گی مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے"[2]

تقویۃ الایمان کا منظر عام پر آنا تھا کہ واقعی زبردست اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور سوادِ اعظم اہل سنت کی طرف سے بیسیوں کتابیں[3] اس کے رد میں لکھی گئیں۔ اس کتاب نے اختلاف و انتشار کا ایسا دروازہ کھولا کہ "شورش بھی ہوئی" "لڑائی بھڑائی" بھی ہوئی مگر، "ٹھیک ہونے" کا مرحلہ شاید صبح قیامت تک نہ آ سکے۔

مولوی اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں شفاعت کی تین قسمیں بیان کیں۔ (۱) شفاعت وجاہت (۲) شفاعت محبت (۳) شفاعت بالاذن، اور پہلی دو قسموں کا بڑی شد و مد سے انکار کیا[4] کسی نے یہ عبارت نقل کر کے علامہ فضل حق خیر آبادی کی خدمت میں استفتاء پیش کیا۔ اور پوچھا یہ کلام حق ہے یا باطل؟ اس میں سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس کا استخفاف ہے یا نہیں؟ اور اس کے قائل کا کیا حکم ہے؟ علامہ نے اس کے جواب میں ایک مبسوط کتاب تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ کی طرح ڈالی اور اسے چار مقامات پر تقسیم کیا، آخر کتاب میں قائل کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

"جواب سوال ثالث ایں است کہ قائل ایں کلام از روئے شرع مبین بلاشبہ کافر و بے دین است، ہرگز مومن و مسلمان نیست و حکم او شرعاً قتل و تکفیر است"[5]

---

[1] عبدالشاہد خاں شروانی، باغی ہندوستان، ص ۱۱۵ [2] حکایات اولیاء، (ارواح ثلاثہ کا نیا ایڈیشن) طبع عتیق دار الاشاعت کراچی، ص ۱۰۲ [3] تفصیل کیلئے، سیف الجبار، از مولانا شاہ فضل رسول قادری قدس سرہ العزیز۔ مطبوعہ مکتبہ رضویہ لاہور، حاشیہ ص ۹۱، ۹۲ ملاحظہ ہو۔ [4] اسماعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان (دفتر اخبار محمدی دہلی) ص ۳۵، ۳۷ [5] محمد فضل حق خیر آبادی، علامہ: تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ (قلمی) ص ۱۲

> "ترجمہ: تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس بے فائدہ کلام کا قائل از روئے شریعت کافر و بے دین ہے۔ ہرگز مومن اور مسلمان نہیں ہے۔ اس کا شرعی حکم قتل اور تکفیر ہے۔"

اگر ایمان و کفر دونوں برحق ہو سکتے ہیں تو علامہ اور مولوی اسمٰعیل دہلوی دونوں برحق ہو سکتے ہیں۔ وَدُوْنَہٗ خَرْطُ الْقَتَاد!

علامہ کا یہ نظریہ وقتی نہیں تھا۔ بلکہ بحالت اسیری انڈیمان جاتے ہوئے اپنے شاگرد مولانا قلندر علی زبیری کو خاص طور پر نصیحت کی کہ میں تقویۃ الایمان کا بالاستیعاب رد نہیں کر سکا اس لئے یہ کام تم سر انجام دینا۔ ایسے حالات میں یہ کس طرح مان لیا جائے کہ علامہ نے ایک موقع پر فرمایا:

> "میں اور مولوی اسمٰعیل پر تبرّا کروں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ مجھ سے ہو چکا ہے وہ بھی بہکائے، سکھائے سے ہوا تھا۔ اور اب تو وہ بھی نہیں ہو سکتا۔"[1]

"اور جب مولوی اسماعیل دہلوی کی شہادت کی خبر پہنچی تو سناٹے کے عالم میں کئی گھنٹے خاموش بیٹھے روتے رہے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اسماعیل کو ہم مولوی نہیں جانتے تھے۔ بلکہ وہ امت محمدیہ کا حکیم تھا،" کوئی شے نہ تھی جس کی کیفیت اور لمیّت اس کے ذہن میں نہ ہو۔ امام رازی نے اگر حاصل کیا تو دو دو چراغ کھا کر۔ اور اسماعیل نے محض اپنی قابلیت اور استعدادِ خداداد سے علم۔[2]

ایسی خود ساختہ حکایات کو خوش عقیدگی کا نتیجہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اس بحث میں مولوی اسماعیل دہلوی نے یہ بھی کہہ دیا:۔

> "اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُن سے چاہے تو کروڑوں جہاں ولی اور جن اور فرشتہ جبریل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔"[3]

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی، حکایات اولیا، طبع کراچی، ص ۴۳۹ [2] فضل حسین بہاری: الحیات بعد الممات، طبع کراچی، ص ۱۹۷ [3] اسماعیل دہلوی۔ مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۶۔

علامہ نے اس پر گرفت کی اور فرمایا :۔

"باید دانست کہ ایں کلام ناتمام کاذب و دروغ و گزاف بے فروغ است۔"[1]

اور شرح و بسط سے اس پر تنقید کی ۔ اور بتایا کہ اوصاف کاملہ میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر بالذات ناممکن ہے ۔ اس کا جواب دینے کی کوشش کی گئی تو علامہ نے امتناع النظیر ایسی محققانہ کتاب لکھی جواب تک لاجواب ہے ۔

علامہ ارشد القادری مدظلہ (حال بریڈفورڈ) نے اپنی قابل قدر کتاب زلزلہ میں علمائے دیوبند کا فکری تضاد جس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے ۔ لائق داد ہے ۔ اس میں انھوں نے تقویۃ الایمان وغیرہ کتب سے ایسے حوالے پیش کئے ہیں کہ جن سے سرورِ دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تصرف اور علم غیب کے انکار کا پتہ چلتا ہے ۔ دوسری طرف دیوبندی لٹریچر ہی سے ایسے اقتباس پیش کئے ہیں جن میں اکابر دیوبند کے علومِ غیبیہ اور شانِ تصرف کو نمایاں کر کے بیان کیا گیا ہے ۔

زلزلہ کی وقعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مولانا عامر عثمانی نے ماہنامہ تجلّی دیوبند میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"ہمارے نزدیک جان چھڑانے کی ایک ہی راہ ہے کہ یا تو تقویۃ الایمان، اور فتاوی رشیدیہ اور فتاوی امدادیہ اور حفظ الایمان جیسی کتابوں کو چولہے پر رکھ کر آگ دے دی جائے ۔ اور صاف اعلان کر دیا جائے کہ ان کے مندرجات قرآن و سنت کے خلاف ہیں اور ہم دیوبندیوں کے صحیح عقائد ارواحِ ثلاثہ اور سوانح قاسمی اور اشرف السوانح جیسی کتابوں سے معلوم کرنے چاہئیں ۔ یا پھر ان موخر الذکر کتابوں کے بارے میں اعلان فرمایا جائے کہ یہ تو بس قصے کہانیوں کی کتابیں ہیں جو رطب و یابس سے بھری ہوئی ہیں ۔ اور ہمارے صحیح عقائد وہی ہیں جو اول الذکر کتابوں میں مندرج ہیں۔"[2]

---

[1] محمد فضل حق خیر آبادی ۔ علامہ : تحقیق الفتویٰ (قلمی) ص ۵۹ ۔

[2] زلزلہ ، بحوالہ تجلی (مطبوعہ مظہر فیض رضا ، برج منڈی ، لائلپور ، جون ۱۹۷۳ء) ص ۱۸۷ ۔ ۱۸۸

مولوی اسمٰعیل اور سید صاحب صوبہ سرحد میں

مولانا عبدالشاہد شروانی نے باغی ہندوستان میں جابجا مولوی اسماعیل دہلوی کے جہاد بالاکوٹ کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد کی کارروائی کا مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا بیان ہے کہ:

"سید صاحب نے پہلا جہاد یار محمد خاں حاکم یاغستان سے کیا تھا"[1]

اس جہاد کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ پشاور اور کوہاٹ قبضے میں آ گئے۔ سید مراد علی خشی سرحد چکی دربند (ہزارہ) لکھتے ہیں:۔

"راویانِ معتبر بچشم دیدہ نقل کرتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء میں خلیفہ سید احمد سرگروہ وہابیاں نے یار محمد حاکم پشاور و کوہاٹ، برادر دوست محمد خاں والیٔ کابل کو بہ پشت گرمی لشکر غازیاں شکست دی اور ملک پشاور و کوہاٹ پر قبضہ کر کے اپنے تھانہ جات مقرر کئے۔ اور بہ لقب سید بادشاہ مشہور ہوا"[2]

اس کے بعد فتح خاں رئیس پنجتار اور پلال قوم کے سربلند خاں وغیرہ سید صاحب کے مرید ہو گئے۔ لیکن اپنے دور کے مشہور باہمت سردار پایندہ خاں نے بیعت نہ کی۔ سید صاحب اور مولوی اسماعیل دہلوی نے بمقام عشراہ ان سے ملاقات کی۔ اور بیعت کی دعوت دی۔ لیکن وہ تیار نہ ہوئے۔ اسی اثنا میں سردار پایندہ خاں کا چھوٹا بھائی سردار مدد خاں سید صاحب سے بیعت ہوا۔ اور بتایا کہ میرا بھائی میرا جانی دشمن ہے۔ میں اس کے ہاتھوں بہت پریشان ہوں۔ سید صاحب نے اسے تسلی دی اور پایندہ خاں پر کفر کا فتویٰ لگا دیا (اس لئے کہ وہ بیعت نہیں ہوا تھا) اور اس سے جہاد کرنے کے لئے پنجتار سے موضع کنیزڑی پہنچ گئے۔ پایندہ خاں کو پتہ چلا تو وہ بھی مقابل آکر صف آرا ہوئے سخت کشت و خون کے بعد پایندہ خاں کو شکست ہو گئی۔ اور وہ جان بچا کر

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید جلد دوم ص ۲۷۰۔

[2] مراد علی۔ سید: تاریخ تناولیاں (مطبع کوہ نور، لاہور ۱۸۶۷ء) ص ۴۷۔

موضع بانڈی سے ہوتا ہوا موضع شمدہڑہ (علاقہ اگرور) چلا گیا۔

سردار پایندہ خاں اس سے پہلے بھی سکھوں سے ٹکرا چکا تھا۔ اور اس کے بعد بھی ان سے برسرپیکار رہا۔ لیکن اس وقت اسے اپنی حفاظت کی یہی صورت نظر آئی۔ کہ ہری سنگھ سے امداد کی اپیل کی جائے جو اس وقت مانسہرہ میں مقیم تھا۔ ہری سنگھ نے امداد دینے کے لئے یہ شرط عائد کر دی کہ تمہیں اپنا لڑکا جہانداد خاں بطور ضمانت میرے سپرد کرنا ہوگا تاکہ تم میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکو۔ پایندہ خاں نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ اور سکھوں کی دو پلٹن فوج لے کر پھلڑہ کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے سرن کے راستے پر سید صاحب کے بھانجے مولوی احمد علی اور اس کے ساتھیوں نے مزاحمت کی۔ میدانِ کارزار گرم ہوا، بے شمار سکھ مارے گئے۔ مولوی احمد علی اور (چند ایک کے سوا) ان کے تمام ساتھی مارے گئے۔ اس کے علاوہ موضع چھترباٹی میں مقابلہ ہوا۔ اور سید صاحب کے رفقاء کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد سید صاحب پنجتار چلے گئے۔ ۱؎

اس طرح پایندہ خاں کی جان بھی بچ گئی اور علاقہ بھی خالی ہوگیا لیکن ہری سنگھ نے حسب وعدہ اس کا لڑکا جہانداد واپس نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ پایندہ خاں خود آ کر اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے التجا کرے۔ لیکن پایندہ خاں کسی صورت میں بھی ملاقات پر آمادہ نہ ہوا۔ کیونکہ اس کے باپ کی وصیت تھی کہ کسی حاکم سے نہ ملنا۔ اسی سلسلے میں اسے سکھوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اور جانگسل معرکے ہوئے۔ ہری سنگھ نے جہانداد کو رنجیت سنگھ کے پاس لاہور پہنچا دیا۔ جہاں سے سات سال بعد اس کی واپسی ہوئی ۲؎

اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سردار پایندہ خاں تمام عمر سکھوں سے برسرپیکار رہا۔ اور بالآخر ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۰ء میں فوت ہوا۔ ۳؎

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ سید صاحب مسلمانوں سے بھی شمشیر بکف ہوتے رہے

۱؎ مراد علی، سید: تاریخ تناولیاں، ص ۴۷، ۵۴

۲؎ ایضاً: ص ۵۴ - ۶۱ ۳؎ ایضاً: ص ۶۸

اور انھیں مجبور کر دیا، کہ وہ سکھوں کی امداد حاصل کریں۔ اور سرحد میں سید صاحب کی ناکامی کی بڑی وجہ وہابیانہ عقائد، بیجا تشدّد اور بات بات پر کفر کے فتوے تھے۔ کیونکہ سرحد کے اکثر باشندے سنّی، حنفی، دیندار، بہادر اور غیرت مند تھے۔ اگر تشدد اور وہابیت ایسے امور درمیان میں حائل نہ ہوتے تو شاید سید صاحب کو کبھی ناکامی کا منھ نہ دیکھنا پڑتا۔ بالآخر مولوی اسماعیل دہلوی اور سید صاحب ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں قلعہ بالاکوٹ کے قریب معرکے میں کام آئے۔ اور عقیدت مندوں نے شہید مشہور کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب نے سرحدی مسلمانوں کے علاوہ سکھوں سے بھی جہاد کیا۔ مگر یہ بات ابھی تشنۂ تحقیق ہے کہ وہ کسی سکھ کے ہاتھوں مارے گئے۔ یا کسی سرحدی پٹھان کے ہاتھوں۔ سرسیّد لکھتے ہیں:۔

> "۱۸۲۴ء میں وہابیوں نے پہاڑوں میں جا کر قیام کیا۔ اور انھوں نے اس بات کا قصد کیا کہ سکھوں پر ہم لوگ جہاد کریں۔ اور شہید ہوں۔ لیکن چونکہ پہاڑی قومیں ان کے عقائد کے مخالف تھیں۔ اس لئے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھے۔
>
> مگر چونکہ وہ سکھوں کے جور و ستم سے نہایت تنگ تھے۔ اس سبب سے وہابیوں کے اس منصوبہ میں بھی شریک ہو گئے کہ سکھوں پر حملہ بھی کیا۔ لیکن چونکہ یہ قوم مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے۔ اس سبب سے اس قوم نے اخیر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا۔ اور مولوی محمد اسماعیل صاحب اور سید احمد صاحب کو شہید کیا۔"[1]

جناب یوسف جبریل جن کا کہنا ہے کہ میرے جد امجد سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لکھتے ہیں:۔

> "اسمٰعیل شہید جیسے لوگ سر سے کفن باندھ کر لوگوں کو سکھوں کے عذاب سے

---

[1] سرسید: مقالات سرسید حصہ نہم۔ (مجلس ترقی ادب لاہور) ص ۱۳۹، ۱۴۰

[2] یوسف جبریل: المیہ ہسپانیہ کے عوامل، نوائے وقت لاہور ۲۵ اگست سنہ ۱۹۷۶ء

نجات دلانے آئے۔ اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی سے شہید ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔"[۱]

سید صاحب کی تحریک سے متعلق مولانا حسین احمد دیوبندی کی عبارت کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلّط اور اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ اور صاف صاف انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے بدیسی لوگوں کا اقتدار ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد حکومت کیس کی ہوگی؟ اس سے آپ کو غرض نہیں ہے جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو یا مسلمان یا دونوں۔ وہ حکومت کریں گے۔"[۲]

اس پر علامہ ارشد القادری نے یہ نوٹ لکھا :۔

"آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ مذکورہ حوالہ کی روشنی میں سید صاحب کے اس لشکر کے متعلق سوا اس کے اور کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ ٹھیک انڈین نیشنل کانگریس کے رضا کاروں کا ایک دستہ تھا۔ جو ہندوستان میں سیکولر اسٹیٹ (لادینی حکومت) قائم کرنے کے لئے اٹھا تھا۔"[۳]

اس پر عامر عثمانی ایڈیٹر ماہنامہ تجلی دیوبند نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"ہم کتنی ہی جانب داری سے کام لیں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ریمارک میں لفظاً تلخی آ گئی ہے۔ لیکن معنوی اور منطقی اعتبار سے بھی اس میں کوئی نقص ہے؟ کوئی افترا ہے؟ کوئی زیادتی ہے؟

کوئی شک نہیں۔ اگر استاذ محترم حضرت مدنی کے ارشاد گرامی کو درست

---

[۱] یوسف جبریل۔ المیہ ہسپانیہ کے عوامل نوائے وقت لاہور۔ ۲۵ر اگست ۱۹۷۳ء

[۲] حسین احمد دیوبندی، نقش حیات ج ۲ ص ۱۳ (بحوالہ زلزلہ ص ۱۸۶) [۳] زلزلہ ص ۱۰۰

مان لیا جائے تو حضرت اسماعیل کی شہادت محض افسانہ بن جاتی ہے۔ مادی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لئے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کرنا ذرا بھی مقدس نصب العین نہیں۔ اس نصب العین میں کافر و مومن سب یکساں ہیں۔ اس طرح کی کوشش کے دوران مارا جانا اس شہادت سے بھلا کیا تعلق رکھے گا جو اسلام کی ایک معزز ترین اور مخصوص اصطلاح ہے۔ اور اس طرح کی کوششوں کے نتیجہ میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانا اجر آخرت کا موجب کیوں ہو گا؟"[1]

مولوی حسین احمد مدنی خلقۂ دیوبند کی کسی معمولی شخصیت کا نام نہیں۔ انھیں "شیخ الاسلام" کا لقب ملا ہے۔ اور دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث بھی رہ چکے ہیں۔ اگر ان کا بیان صحیح ہے تو ان کے شاگرد عامر عثمانی فاضل دیوبند کو اعتراف ہے کہ مولوی اسماعیل دہلوی کی شہادت محض افسانہ ہے ——— اور اگر ان کا بیان غلط کہا جائے تو یہ ماننے سے مفر نہیں کہ اس حلقہ میں شخصیات کو ایسے من مانے روپ میں پیش کرنے کا فن رائج ہے جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور اس جرم میں حلقۂ دیوبند کے اصاغر سے لے کر شیخ الاسلام تک کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ اسی لئے محققین کا کہنا ہے کہ ان لوگوں کے یہاں تاریخ نگاری کم، تاریخ گری زیادہ ہوتی ہے۔"

وضع احادیث

سید صاحب کے مریدین کو عقیدت میں اس قدر غالی بنا دیا گیا تھا کہ وہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے سید صاحب کی مدح و ثنا کرنے کے خوگر ہو گئے تھے۔ یہ سلسلہ یہاں تک پہونچا کہ من گھڑت روایات کو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ شیخ الحدیث مولانا عنایت اللہ اثری، مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"آپ (مولوی فضل الٰہی) نے اس جماعت کا شائع کردہ رسالہ بنام خلاصہ مجھے دکھایا جس میں یہ حدیث تھی کہ "اذ مضت الف و مأتان واربعون

---

[1] تبصرہ بر زلزلہ ص ۱۸۶۔

سنة بعث الله المهدی فیبایع علی یده خلق کثیر ثم یغیبه الله تعالیٰ فیرتدون الیٰ دین اٰبائهم الا من اتبع کتاب الله وسنة نبیه"[1]

ترجمہ:۔ "۱۲۴۰ھ گزرنے پر اللہ تعالیٰ مہدی کو بھیجے گا جس کے ہاتھوں پر خلق کثیر بیعت ہو گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے غائب کر دے گا تو لوگ اپنے آبا کے دین کی طرف لوٹ جائیں گے۔ سوائے کتاب و سنّت کے متبعین کے"۔

چونکہ اس وقت لاہور پر سکھ حکمراں تھے۔ اس لئے روایت سابقہ پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ایک روایت میں یہ بھی بڑھا دیا:۔

"فیقاتل کفرة لاهور"[2]

مولانا عنایت اللہ اثری (حال گجرات) نے اس روایت کے بارے میں کچھ اس طرح اظہار خیال کیا ہے:۔

"یہ روایت کسی حدیث کی کتاب میں نہیں دیکھی۔ بلکہ ______ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علمائے کرام نے جمع فرمایا ہے۔ یہ روایت اس میں بھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب کی شہادت کے بعد اسے وضع کیا گیا ہے"[3]

مولانا ابوالکلام آزاد

حیرت ہے کہ باغی ہندوستان میں جابجا مولانا ابوالکلام آزاد کو علامہ فضل حق کے ہمسر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے جو نظریہ ابتداً قائم کیا تھا تاحیات اس پر قائم رہے۔ جب کہ مولانا آزاد ابتدا میں بڑے زور سے مسلمانوں کی انفرادیت کا پرچار کرتے اور فرمایا کرتے تھے:۔

"مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں

---

[1] عنایت اللہ اثری: مکاتیب الجابر فی مکاتیب الغایہ۔ (جنوری ۱۹۶۹ء) ص ۸۵، ۸۶۔

[2] ایضاً: ص ۸۶ [3] ایضاً: ص ۸۶۔ عه نوٹ:۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مجاہدین "صرف سکھوں کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اسی لئے لاہور کا نام لیا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کے عزم کا مفروضہ بعد میں وضع کیا گیا"۔

شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں۔ اور صدیوں تک چلا سکتے ہیں۔ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے جھکیں۔" [1]

اور یہ بھی فرمایا:۔

"ہم تو خود مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انھوں نے اپنے سامنے دو راستے ہی دیکھے ہیں یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت۔" [2]

لیکن خود مولانا آزاد ایک طرف شاہ برطانیہ کی تاجپوشی کے موقع پر یوں قصیدہ خواں نظر آتے ہیں:۔

ہوئی لندن میں از فضلِ الٰہی — نہایت شان سے جب تاجپوشی
کہا آزاد نے بڑھ کر ادب سے — مبارک شاہ کو اب تاجپوشی [3]

۱۳۳۰ھ
اسی موقع پر ایک طویل قصیدے کے آخر میں یوں دعا گو ہیں:۔

دستم بدعا کنوں برآرم — کاے رب قدیر کردگارم
باشد بادب قیام شاہی — باصولت و رعب عز و جاہی [4]

دوسری جانب جب ہندو نوازی کا دور شروع ہوا تو بڑے زور سے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے کی تلقین کی۔ چنانچہ ایک بیان میں کہا:

"مسلمانوں کو اپنے (حقوق) کے تحفظات کے لئے گورنمنٹ برطانیہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے۔ انھیں برادران وطن (ہندوؤں) کی طرف دیکھنا چاہیئے۔ ان سے بدگمان نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیئے۔ کانگریس کے ہاتھوں میں ان کے حقوق بالکل محفوظ ہیں۔" [5]

---

[1] حبیب احمد چوہدری: تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۲۱۱، بحوالہ روزنامہ الہلال [2] ایضاً ص ۲۱۲ ۱۹ دسمبر ۱۹۱۲ء [3] ابو سلمان شاہجہاں پوری: ارمغان آزاد ص ۷۵ [4] ایضاً: ص ۷۲، ۷۵ [5] حبیب احمد چوہدری تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۲۱۲، بحوالہ اسٹیٹسمین ۱۹ فروری ۱۹۴۰ء۔

علمائے اہلسنّت نے جب انھیں ان کی فکری وعملی خامیوں سے مطلع کیا تو وقتی اقرار کے باوجود اپنی روش میں تبدیلی پیدا نہ کی

ایک وقت وہ تھا جب مولانا آزاد پوری کی پوری ملّت اسلامیہ کو جسم واحد قرار دیتے تھے۔ اور ایک وہ وقت بھی آیا کہ شرقی اور مغربی پاکستان کی وحدت کو صحیح نہیں مانتے تھے بلکہ یہاں تک کہہ گئے:۔

"یہ کہنا کہ مذہبی ہم آہنگی ان علاقوں کو جو جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور تمدنی طور پر مختلف ہیں، متحد کر سکتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ سب سے بڑا فریب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی کوشش کی، جو نسلی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی حدود سے بالاتر ہو۔ لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ پہلے چند قرنوں یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد اسلام صرف اسلام کی بنا پر تمام مسلم ممالک کو ایک اسٹیٹ میں منسلک کرنے میں ناکام رہا۔"[1]

اس اقتباس کو پڑھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد کے دل و دماغ پر دنیا پرستی اور اہل باطل سے مرعوبیت کا اس قدر غلبہ ہو گیا تھا کہ وہ صرف برائے نام مسلمان رہ گئے تھے۔ ورنہ وہ اس طرح بے دھڑک ہو کر اسلام کو ناکام قرار دینے کی جرأت نہ کرتے۔

الحاصل مولانا آزاد کے دونوں اَدوار کو سامنے رکھئے تو افکار وخیالات اور کردار وعمل میں کھلا ہوا تضاد نظر آئے گا۔ کیا علامہ فضل حق کی حیات میں بھی کہیں ایسی فکری سراسیمگی اور عملی تضاد ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں! پھر علامہ کے مقابلے میں آزاد کو لانا قطعاً بے جا ہے۔

۲۹ شعبان ۱۳۹۴ھ / ۱۷ ستمبر ۱۹۷۴ء

محمد عبدالحکیم شرف قادری لاہور

---

[1] حبیب احمد چوہدری: تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، ص ۲۲۱ - (بحوالہ انڈیا ونس فریڈم ص ۲۲۷)

مولانا عبدالشاہد شروانی کا ایک[1] خط

جس کا عکس تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ طبع اول لاہور
کے مقدمہ میں شائع ہوا۔

زاویہ علمیہ دفتر جمہور اوپر کوٹ علی گڑھ ۱ ۵/۷۹ ۶

محترم المقام دام لطفکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

مرسلہ کتابوں کا پیکٹ ۶ ۴/۷۹ء کو اور مکرمت نامہ مورخہ ۷ ۴/۷۹ء کو اس کے بعد ملا۔ پیکٹ میں باغی ہندوستان اور امتیاز حق کی دو، دو جلدیں تھیں۔ آپ نے باغی ہندوستان کی ۳ جلدیں خط میں لکھی ہیں۔ غالباً سہواً باغی ہندوستان کے بجائے امتیاز حق کی مزید جلد رکھ دی گئی۔

سرکاری ملازم شوکت علی صاحب کا ایک خط عرصہ ہوا آیا تھا۔ انھوں نے مزار علامہ کی نشاندہی کی تھی۔ وہ خود مزار پر حاضر ہوئے ہیں۔ علامہ کے مزار کے ساتھ مولوی لیاقت علی کی قبر بھی ہے۔

یہ مزار سمندر کے کنارے ساؤتھ پائنٹ میں ہے جو عرف عام میں نمک بھٹہ کہلاتا ہے۔ یہ بستی Ross جزیرہ کے قریب ہے جہاں لاکر علماء کو جہاز سے اتارا جاتا تھا......

میں نے گذشتہ سال رامپور رضا لائبریری میں علامہ کا وہ خط دیکھا جس کا حوالہ عرشی صاحب نے اپنے مضمون میں دیا تھا۔ اس پر نہ تو علامہ کے دستخط ہیں نہ ان کا رسم خط۔ میں رسم خط اچھی طرح پہچانتا ہوں مولانا آزاد لائبریری میں خودنوشت نسخے موجود ہیں۔

المبین کی اشاعت بڑی علمی خدمت ہے۔ پہلا ایڈیشن ملتا نہیں۔

---

[1] یہ خط زیر نظر ایڈیشن میں مندرج ہو چکا ہے ۱۲ محمد احمد۔

مجھے خود مولانا مرحوم[1] نے امتناع النظیر کے ساتھ دی تھی ۔

امتیاز حق راجہ صاحب کی تتبع و تلاش کا شاہکار ہے۔ تاریخ تناولیاں نے یہ مسئلہ پہلے ہی صاف کر دیا تھا۔ امتیاز حق نے یہ پہلو بھی صاف کر دیا کہ وہ انگریزوں کے مخالف نہیں بلکہ موافق و حامی تھے ۔

ہٹلر کے دست راست گوئبلز کا یہ قول تھا کہ جھوٹ اتنی بار بولو کہ سچ معلوم ہو۔ بلاشبہ باغی ہندوستان کا جدید ایڈیشن

"نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

کا مصداق ہے۔ جزاکم اللہ۔

تاخیر جواب کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ سفر حج کی چار ماہ کی غیر حاضری نے کام بہت بڑھا دیا۔ پھر واپسی پر شدید بیماری نے ڈیڑھ ماہ معطل رکھا۔ رفقاء کی خدمت میں سلام شوق ...... والسلام

خیر اندیش
شاہد شروانی ۱ ۵/۹۶ء

---

[1] مولانا سید سلیمان اشرف علیہ الرحمہ صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ جنھوں نے المبین تصنیف کی۔ اور علامہ فضل حق خیرآبادی کی کتاب امتناع النظیر ایڈیٹ کر کے شائع کی۔

(محمد احمد)

مولانا فضل امام خیرآبادی کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف

مقدمۂ تاریخ یا خلاصۃ التواریخ (فارسی)

اس کتاب کے دو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔

۱۔ عجائب گھر لائبریری (لاہور) میں ACC. NO ۹۰ محفوظ ہے یہ نسخہ ۳۶۹ ورق پر مشتمل اور خوشخط لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ پر کتاب کا نام مقدمۂ تاریخ لکھا ہوا ہے۔

۲۔ مولوی عبدالرشید لاجپت نگر (شاہدرہ) کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اب یہ نسخہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے کتاب خانہ گنج بخش راولپنڈی صدر میں منتقل ہو چکا ہے[1] اس پر کتاب کا نام خلاصۃ التواریخ لکھا ہے۔

یہ کتاب مولانا فضل امام خیرآبادی نے ۱۲۲۴ھ میں قیام دہلی کے دوران لکھی۔ یہ کتاب گویا تاریخ عالم ہے جس کی ابتدا حضرت سیدنا آدم علیہ السلام سے کی گئی ہے مولانا نے اس کی اجمالی فہرست اس طرح بیان کی ہے:۔

گفتار اول:۔ خلقت آدم اور دیگر انبیاء کرام کے احوال، اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آل پاک، صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کا ذکر آ گیا ہے۔

گفتار دوم:۔ صوفیائے کرام اور اولیاء عظام کے ذکر میں۔

گفتار سوم:۔ ملوک ایران کے ذکر میں۔ اس گفتگو کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا ہے۔ سلاطین کیانی، خلفائے عباسیہ، سلاطین چنگیزیہ اور شاہان تیموریہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ سلسلہ ابوالنصر محمد اکبر بادشاہ تک پہنچایا ہے۔

گفتار چہارم: ان راجوں کا ذکر جو دہلی اور دیگر بلاد میں حکمران رہے۔

گفتار پنجم: غزنی اور لاہور کے حکام کے بیان میں۔ یہ سلسلہ بابر کے ہندوستان آنے اور ابراہیم کے مارے جانے تک پہنچایا ہے۔

---

[1] ان دو نسخوں کی نشاندہی جناب پروفیسر محمد اقبال مجددی نے کی جس کیلئے راقم شکر گزار ہے۔

گفتار ششم: سلجوقی، صفوی، گجراتی اور مصری اکابر سلاطین کا اجمالی ذکر۔

گفتار ہفتم: مشہور حکماء، اطباء اور خوشنویسوں کا ذکر۔

خاتمہ: ہفت اقلیم کے بلاد اور عجائب کا بیان۔

آمد نامہ

مولانا کی مفید تصنیف آمد نامہ فارسی کا ایک باب تراجم الفضلاءؒ کے نام سے انگریزی ترجمہ اور حواشی کے ساتھ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

تلامذہ شمس العلما مولانا عبد الحق خیر آبادی

مولانا عبد الشاہد خاں شروانی نے لکھا ہے کہ مولانا عبد الحق سے ہزاروں تلامذہ نے استفادہ کیا۔ ان میں سے دس تلامذہ کے نام بھی لکھے ہیں۔ ذیل میں چند مزید نام پیش کئے جاتے ہیں :- ۱؎

۱ـــ حکیم احمد رضا خاں لکھنوی متوفی ۱۹۰۴ء تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۲

۲ـــ حکیم مولوی افضال احمد خاں رامپوری ،، ۲۴ر اگست ۱۹۲۴ء ،، ص ۴۸

۳ـــ حکیم حسین رضا خاں ،، یکم ربیع الاول ۱۳۲۷ھ ،، ص ۱۰۴

۴ـــ حکیم مولوی سید شہاب الدین ،، ص ۱۶۵

۵ـــ مولوی عبد الغنی خاں (والد ماجد حکیم نجم الغنی مؤرخ) ،، ۱۸۹۹ء ،، ص ۲۳۳

۶ـــ مولوی عبد الملک خاں ،، ص ۲۴۵

۷ـــ حکیم تفضل حسین ،، ص ۲۴۵

۸ـــ مولوی حکیم عبد الہادی خاں (متوفی ۲۷ ذیقعدہ ۲۶ ستمبر ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء ،، ص ۲۵۱

۹ـــ مولانا فضل حق رامپوری ،، ۱۹۴۰ء ،، ص ۳۱۷

۱۰ـــ صاحبزادہ محمد علی خاں عرف چھٹن صاحب ،، ۲۸ محرم ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء ،، ص ۳۶۵

۱۱ـــ مولوی محمد نبی خاں ،، ص ۳۷۶

۱۲ـــ حکیم مولوی حاجی منور علی محدّث ،، ص ۳۷۸

۱۳ـــ مولوی حکیم مرتضیٰ ،، جولائی ۱۹۰۶ء ،، ص ۳۸۴

۱۴ـــ مولوی نظیر الدین ،، ،، ص ۴۱۹

۱۵ـــ مولانا شاہ اعظم حسین مدنی ،، ۱۳۳۷ء تذکرہ علمائے اہلسنت ص ۳۴

۱۶ـــ مولوی مقیم الدین (ٹانک) ،، ہند ص ۵۰۲

۱۷ـــ مولانا شائستہ گل (مردان) ۲؎ ۱۸ـــ مولانا علیم الدین شاہجہاں پوری (محشی رسالہ قطبیہ)

۱؎ محترم مؤلف نے مختصراً یہ فہرست طبع چہارم میں شامل کر لی ہے۔ ۲؎ محمد احمد سلمہٗ ۴ ستمبر ۱۹۷۱ء کو راقم الحروف اور مولانا قاضی عبد الغنی کوکب زید مجدہٗ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے شمس العلما مولانا عبد الحق خیر آبادی سے استفادہ کا

ایک ایسی کتاب جس کا ہر مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے

اِسلامی اخلاق وآداب

مصنفہ، صدر الشریعہ حضرت علامہ محمد امجد علی اعظمی (مصنف بہار شریعت) علیہ الرحمہ

○ کتاب کی اہمیت معلوم کرنے کے لیے ابوابِ مضامین کی اجمالی فہرست ملاحظہ فرمائیں ○

◐— کھانے پینے کے مسائل وآداب
◐— ولیمہ اور مہمانداری کے مسائل
◐— برتن اور لباس کے احکام
◐— لباس اور عمامہ وغیرہ کے مسائل
◐— بیٹھنے چلنے پھرنے کے آداب
◐— سلام ومصافحہ اور معانقہ کے مسائل
◐— سونے جاگنے کے آداب اور دعائیں
◐— تلاوتِ قرآن کے فضائل وآداب
◐— مسجد اور قبلہ کے آداب
◐— جائز اور ناجائز اشعار کا بیان
◐— لہو ولعب (کھیل کود) کے احکام
◐— غیبت اور چغلی کی مذمت
◐— کیسا نام رکھنا جائز ہے اور کیسا ناجائز
◐— احمد ومحمد نام کے فضائل
◐— خبر کہاں معتبر ہے کہاں نہیں؟
◐— زیور اور انگوٹھی کے مسائل
◐— عورتوں سے متعلق ضروری احکام
◐— مکان میں جانے کے لیے اجازت کا بیان
◐— چھینک اور جماہی کا بیان
◐— خرید وفروخت کا بیان
◐— مریض کی عیادت اور علاج کا بیان
◐— جھوٹ اور گالی گلوج کی مذمت
◐— بغض وحسد اور ظلم کی مذمت
◐— غصہ، تکبر اور قطع تعلق کا بیان
◐— ماں باپ اور اولاد کے حقوق
◐— پڑوسیوں کے حقوق
◐— اچھی بری صحبت کا بیان
◐— اللہ سے دوستی، دشمنی کا حکم
◐— حجامت، ناخن اور ختنہ کے مسائل
◐— حلال کمائی اور سوال کے احکام
◐— اچھی بات کا حکم اور بری بات سے منع کرنا
◐— علم وتعلیم کے فضائل
◐— ریاکاری کی مذمت
◐— زیارتِ قبور وایصالِ ثواب

شائع کردہ

المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارکپور، اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۴۰۴

ہدیہ مجلد ۸۰ روپے

۷۸۶
۹۲

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عشقِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

تالیف

صوفی محمد اکرم رضوی (ریاض)

تقدیم

مولانا افتخار احمد قادری اعظمی

نظر ثانی

مولانا محمد احمد مصباحی

ادارہ اشاعت:۔ المجمع الاسلامی مبارکپور

۷۸۶
۹۲

سلسلہ اشاعت نمبر ۸۴

تنقیدِ معجزات کا علمی محاسبہ

از

محمد احمد مصباحی

رکن المجمع الاسلامی — استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور

— ادارۂ تصنیف و اشاعت —

المجمع الاسلامی

مبارک پور، یوپی، انڈیا، پن — ۲۷۶۴۰۴

المجمع الاسلامی

ایک مستقل قومی ادارہ

- ★ تصنیف و اشاعت کا عظیم مرکز ۔
- ★ اسلامی علوم و معارف کا محافظ ۔
- ★ اہلِ سنت کے تمام اشاعتی اور تعلیمی مراکز کا ہمدرد ۔
- ★ اور حسب توفیق ان کا معاون و رہنما ہے ۔

اس کے پُر عزم بازوؤں کو مضبوط کیجئے

اس کی نشریات کا مطالعہ کیجئے ۔ اس کے ساتھ مخلصانہ تعاون کیجئے

مُراسلت کا پتہ

المجمع الاسلامی (ملّت نگر) مبارکپور ۔ ۴۰۴
اعظم گڑھ ، (یوپی)

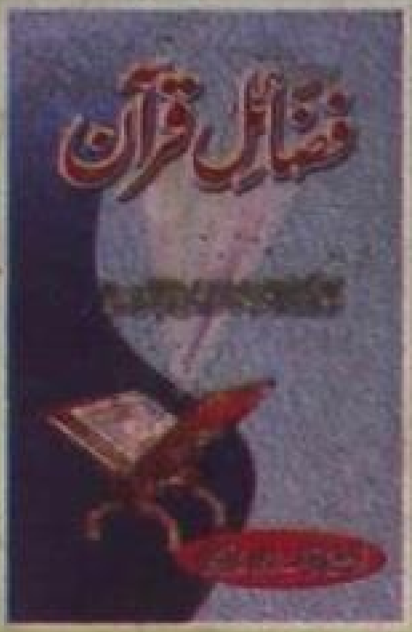

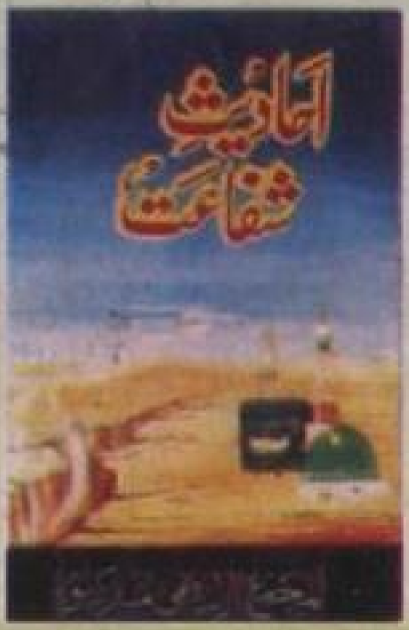
احادیث شفاعت

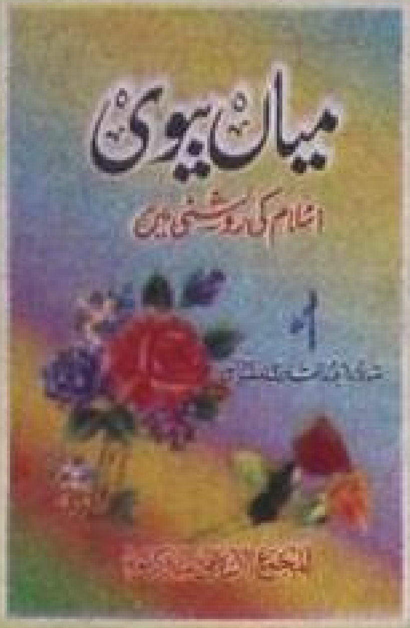
میاں بیوی
اسلام کی روشنی میں

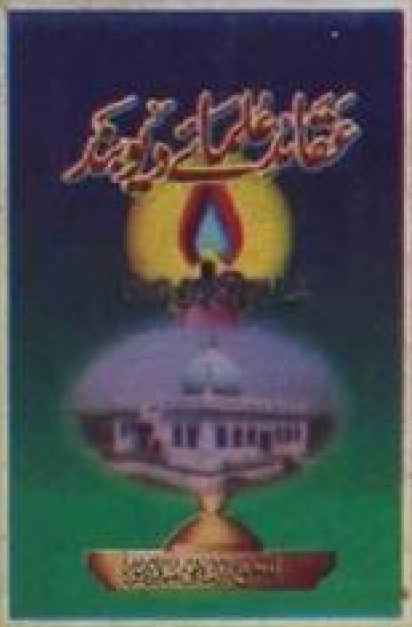
عقائد علمائے دیوبند

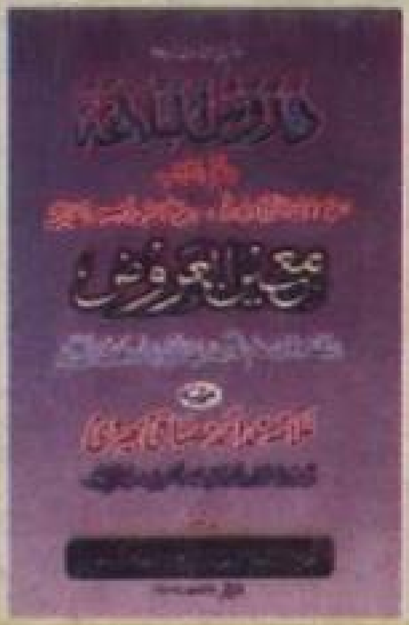
دروس البلاغة
معین العروض

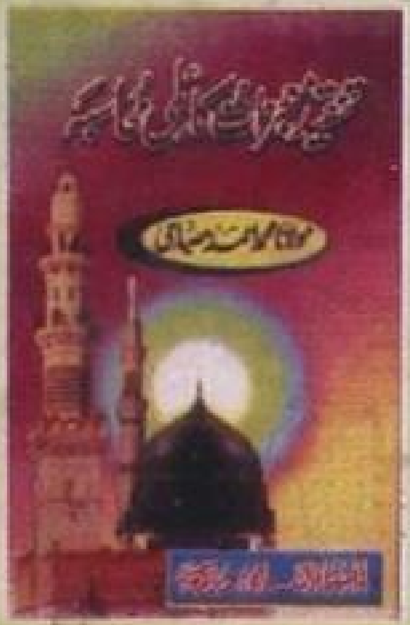

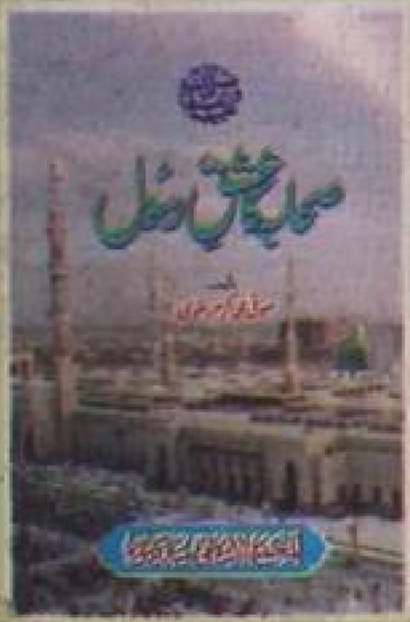
صحابہ کا عشق رسول

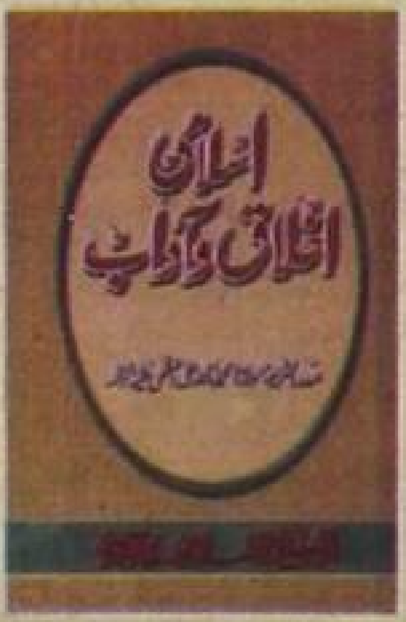
اسلامی اخلاق و آداب

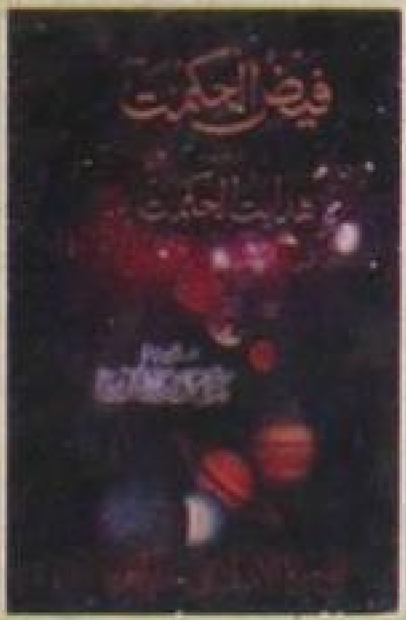

AL-MAJMAUL-ISLAMI
Mubarakpur Dist. Azamgarh (U.P.)